مختلف مضامین

قرآنی سیریز - ۱

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب قبلہ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی قبلہ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

قرآنی سیریز ۔ ۱

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	قرآن کی اہمیت	ق۔ ۱	۱
۲	قرآن اور روحانیت۔ اولوالامر	ق۔ ۲ الف	۱۸
۳	اولوالامر	ق۔ ۲ ب	۳۰
۴	نورِ قرآن	ق۔ ۳ الف	۴۳
۵	نورِ قرآن	ق۔ ۳ ب	۵۶
۶	نورِ قرآن	ق۔ ۳ ج	۶۴
۷	سورۂ دہر کی چند حکمتیں	ق۔ ۴	۷۶
۸	لفظِ فرقان کی وضاحت، سورۂ حدید کی چند حکمتیں	ق۔ ۵ الف	۸۵
۹	لفظِ فرقان کی وضاحت، سوال وجواب	ق۔ ۵ ب	۹۵
۱۰	خانۂ حکمت امامِ عالی مقامؑ کی ایک عملی خوشخبری، سورۂ ملک کی چند حکمتیں	ق۔ ۶	۱۰۶
۱۱	سورۂ زلزال (۹۹) اور سورۂ عادیات (۱۰۰) کی تاویل	ق۔ ۷	۱۱۵
۱۲	سورۂ ناس (۱۱۴) کی تاویل (نقشے کے حوالے سے)	ق۔ ۸	۱۲۴
۱۳	سورۂ رحمٰن (۵۵) کی حکمتیں (حصۂ اوّل، آیت ۱ تا ۱۴)	ق۔ ۹ الف	۱۳۳
۱۴	سورۂ رحمٰن (۵۵) کی حکمتیں (حصۂ دوم، آیت ۱۴ تا ۴۵)	ق۔ ۹ ب	۱۴۱
۱۵	سورۂ رحمٰن (۵۵) کی حکمتیں (حصۂ دوم، آیت ۴۵ تا ۶۷)	ق۔ ۹ ج	۱۵۶
۱۶	شہد کی مکھی کی تاویل (۱۶:۶۸۔۶۹) سورۂ نصر کی تاویل	ق۔ ۱۰	۱۶۵

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن کی اہمیت

کیسٹ نمبر: Q-01 تاریخ: ۱۶/ ۱۲/ ۱۹۷۷، Montreal,Canada

Click here for Audio

Jama'at and Chairman and Member of Montreal Legislative Committee, Members of Ismailia Association and my Brothers and Sisters!

On behalf of the Ismailia Association of Montreal Mukhi Kamadia Sahib, Montreal Administrative Committee and Montreal Jama'at....extend our heartiest and cordial welcome ʿAllāmah Naṣīr al-Dīn Hunzai who you well know is the distinguished and wellknown scholar. We are extremely honoured to have ʿAllāmah Sahib with us tonight and it is hope that the Jama'at will take maximum advantage of this unique opportunity to acquire knowledge and understanding of Holy Quran. For your information ʿAllāmah Sahib has at least 65 publications to his credit. He has composed Ginans in Burshaski, Persian, Turkish and Urdu and these Ginans are recited in Jama'at Khana's in Gilgit Areas. He is thus in service of Jama'at for a long time in various places including China above all his spiritual experiences...... and I will now request ʿAllāmah Sahib to please come forward and begin the lecture.

ʿAllāmah Naṣīr al-Dīn Hunzai!!

(Speach by Chairmain Ismailia Association, Montreal, Canada)

معزز عملداران اور میرے عزیز بھائیو اور بہنو!

آج مجھے جو خوشی حاصل ہو رہی ہے وہ شاید کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی کیونکہ مجھے جماعت کی مقدّس خدمت کے بہانے سے جو یہاں آنے کے لئے موقع ملا ہے وہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے، بہت بڑا اشرف ہے۔ اِس لئے میں

یہاں کے عملداروں کا اور عزیز جماعت کا شکر گزار اور ممنون ہوں اور جیسا کہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کے چیئرمین صاحب نے میرے مضمون کے بارے میں اعلان کیا اُس کے مطابق میں کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں اور میری گفتگو قرآن کے بارے میں ہوگی لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی عرض کروں کہ رُوحانیت یعنی (Spiritualism) خود بخود قرآن کے ساتھ آتی ہے۔ تو مجھے اُمید ہے کہ میں اِن دو مضامین سے بحث کروں گا اور اِس سلسلے میں، مَیں یہاں کی ایسوسی ایشن کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے (Articles) کا ترجمہ کیا ہے جو کہ آپ کو بعد میں وہ (Articles) ملیں گے اور ساتھ ہی ساتھ میں ایک اور گزارش یہ کروں گا کہ آپ حضرات کو میرے مضمون سے متعلّق جو بھی سوالات پیدا ہو جائیں یا اِس کے علاوہ بھی آپ کے پاس سوالات ہوں تو بے شک آپ وہ سوالات لیکچر کے ختم ہونے کے بعد پوچھ سکتے ہیں اور میں درمیان میں آپ کو قرآن کے حقائق کے بارے میں، قرآن کی حقیقتوں کے بارے میں اور روحی کے بارے میں، رُوحانیت کے بارے میں تفصیل سے عرض کروں گا کیونکہ مجھے کافی ٹائم دیا گیا ہے۔

تو سب سے پہلے میں قرآن کی اہمیت کے بارے میں عرض کروں گا کہ قرآنِ مقدّس کی اہمیت [اور] اِس کی ضرورت کیا ہے؟ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے اور قرآن کے بغیر اسلام نہ سمجھ میں آسکتا ہے نہ اُس کا کوئی تصوّر پیش کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا قرآن کا جاننا از حد ضروری ہے اِس لئے کہ ہم الحمدللہ سب سے پہلے مسلمان ہیں، اُس کے بعد اسماعیلی ہیں اور اِس لئے ہمیں اپنے اسلام کو ثابت کرنے کے لئے قرآن فہمی کی ضرورت ہے، قرآن شناسی کی ضرورت ہے یعنی قرآن کو جاننے کی ضرورت ہے۔

اِس کے علاوہ جیسا کہ آپ نے واعظین کے وعظ میں سنا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنے آخری وقت میں ارشاد فرمایا تھا کہ: اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ۔ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ جانے والا ہوں اور اُن میں سے ایک تو آسمانی کتاب ہے یعنی قرآن اور دُوسری چیز میرے اہلِ بیت ہیں، میری عترت ہے۔ (صحیح مسلم، جلد ششم، کتاب الفضائل، باب: علیؑ کی بزرگی۔ کوکبِ دری، باب دوم، منقبت نمبر ۷۴، ۷۵۔ شرح الاخبار، جلد دہم، فضائلِ اہلِ بیت)۔ اِس لئے قرآن کا جاننا کئی اعتبارات سے بہت ہی ضروری ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پاس قرآنِ ناطق یعنی امامِ زمان کا نور ہر وقت اور ہمیشہ موجود ہے لیکن قرآنِ صامت بھی تو اسی قرآنِ ناطق کی تصدیق کرتا ہے، تائید کرتا ہے، (Favour) کرتا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ قرآنِ ناطق الگ اور قرآنِ صامت الگ ہو دونوں کا مقصد ایک ہے دونوں کی ہدایت ایک ہے، لہٰذا ہمیں دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ قرآن سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے کیونکہ معلمِ قرآن یعنی آسمانی کتاب کا معلّم ہمارے پاس موجود ہے جو امامِ زمانؑ ہے، جو پیغمبرؐ کے جانشین ہیں۔

جس طرح رسول اللہؐ نے اپنے وقت میں اپنے زمانے میں لوگوں کو قرآن سمجھایا، سکھایا اور قرآن کے ظاہر پر عمل

کرایا، اگر قرآن لوگ خود جان سکتے تو سب سے پہلے عرب کے لوگ جانتے کیونکہ قرآن اُن کی زبان میں نازل ہوا تھا اور اِس کے علاوہ قرآن اُن کے حالات پر مشتمل تھا یعنی سب سے پہلے اُن مسلمانوں کا ذکر ہے قرآن میں جو کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں تھے، اُن کی جنگیں، اُن کے سوالات، اُن کے تنازعات اُن کے جھگڑوں کا تصفیہ اور دیگر چیزیں جو اُن سے متعلّق ہیں تو پھر اگر قرآن کا جاننا کوئی آسان بات ہوتی اور قرآن کے لئے معلّم کی ضرورت نہ ہوتی، اُستاد کی، سکھانے والے کی ضرورت نہ ہوتی تو سب سے پہلے عرب کے مسلمان اِس کو بخوبی سمجھتے، جانتے، ایسا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ ہی پر قرآن نازل ہوا تھا اور آنحضرتؐ نے اُس زمانے کے مسلمانوں کو قرآن سکھایا، سمجھایا تو یہ قرآن کے ظاہر کی بات ہوئی اور قرآن کے باطن کی بات اِس سے زیادہ مشکل ہے [کیونکہ] اُس کی حکمت کو، اُس کے اندرونی معنیٰ کو، اُس کی تاویل کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے کہ قرآن کا جو فائدہ ہے وہ اُن لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکتا ہے جن کے پاس قرآن کا معلم، اُستاد موجود ہے۔ تو کیا ہم قرآن کو سمجھنے کے لئے کوشش نہ کریں؟

اِس کے علاوہ جب ہم سے کوئی سوال پوچھا جاتا ہے، مسلمانوں کی طرف سے [یعنی] ہمارے بھائیوں کی طرف سے تو اِس کا جواب ہم اپنے پیروں کے گنانوں سے نہیں دے سکتے ہیں اور اسی طرح امامؑ کے فرامین سے بھی ہم اُن کے سوال کا جواب نہیں دے سکتے ہیں۔ اِس لئے کہ امامؑ کے ارشادات، امامؑ کے فرامین اور پیروں کے گنان اگرچہ مقدّس چیزیں ہیں جن کو ہم ہی مانتے ہیں اور ہمارے سوا ہمارے اور مسلم بھائی نہیں مانتے ہیں۔ تو جب سوال پیدا ہوتا ہے تو اُس کے لئے ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے کہ جس کو وہ بھی مانتے ہوں اور ہم بھی مانتے [ہوں] اور ایسی چیز قرآن ہے۔ دیکھا آپ نے کہ قرآن کی اہمیت کیا ہے اور اُس کے جاننے سے کیا فائدہ رہتا ہے۔ تو ہم اگر قرآن کو سمجھیں، اُس کی حکمتوں کو سمجھیں، اُس کی حقیقتوں کو سمجھیں، اُس کی تاویلات میں جائیں تو دُوسروں کے مقابلے میں ہم زیادہ سے زیادہ فائدے میں رہ سکتے ہیں اور اچھی طرح سے اُن کو جواب مہیا کر سکتے ہیں اور اِس کے علاوہ قرآن چونکہ ایسی کتاب ہے جس میں سچّے دین کا ذکر ہے تو اگر ہم سچّے دین کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہمارا دعویٰ صحیح ہے اور وہ اسماعیلی مذہب ہے تو کیا قرآن میں اسماعیلی مذہب کی تعریف و توصیف نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی، اسماعیلی مذہب کے بھید، رُوحانیت کے اسرار اور حقیقت کی باتیں قرآن میں موجود ہیں اور وہ ایک خزانہ ہے علم اور حکمت کا۔ تو ہمیں چاہئے کہ [ہم] امامؑ کی ہدایت کی روشنی میں قرآن کی حکمتوں کو قرآن کے علم کو اور اُس کی تاویلات کو حاصل کریں اور اِس خزانے سے اپنی آخرت کو آباد کریں اور اپنی دُنیا کو آباد کریں، یعنی اِس کی ہدایتوں کو امامؑ کی ہدایت کی روشنی میں اپنائیں اور خوش ہو جائیں کہ قرآن ہمارے بارے میں ہے یعنی ہمارے مذہب کا (Favour) کرتا ہے اور امامؑ کی تائید کرتا ہے اور دینِ حق کی تائید کرتا ہے جو ست پنتھ ہے یعنی سچا دین اور صراطِ مستقیم کی اِس میں تعریف ہے تو اِس لئے ہمیں قرآن کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینا چاہئے۔

اِس سلسلے میں قرآن کی مثالوں میں [سے] آپ کو عرض کروں گا کہ کس طرح ہم قرآن کو سمجھ سکتے ہیں اور قرآن کیا ہے؟ اور اگر امام کے پاس قرآن کی حکمت ہے تو کس رنگ میں ہے؟ کس طرح ہے؟ اور امام کسی کو جب قرآن کی حکمت سکھاتا ہے تو کس طرح سکھاتا ہے؟ اِس کے لئے جاننا چاہئے کہ قرآن جب نازل ہوا تو وہ رفتہ رفتہ نازل ہوا ایک ساتھ، ایک مکمل کتاب کی شکل میں وہ نازل نہیں ہوا۔ بہرحال قرآن کی رُوحانی شکل، رُوحانی صورت سمجھنے کے لئے ہمیں موجودہ زمانے کی سائنسی ایجادات سے مدد لینی ہوگی۔ کیونکہ مثالوں میں سے بہترین مثال وہ ہے جو زمانے کے موافق ہو اور اِس کے لئے ہم مثال پیش کر سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ پر جو رُوحانیت کے واقعات گزرتے تھے اُن کی صورتِ حال ایک فلم کی طرح تھی، سمجھا آپ نے کہ رُوحانیت کوئی شک نہیں ہے ایک فلم کی طرح ہوتی ہے، لیکن یاد رہے ایسی فلم کی طرح نہیں جس میں بہت سی دنیوی باتیں ہوتی ہیں اور لغویات ہوتی ہیں، فضول باتیں ہوتی ہیں، غیر مہذّب باتیں ہوتی ہیں، ایسا نہیں، میں نے جو رُوحانیت کی مثال فلم سے دی اِس معنی میں دی اور اِس لئے کہا کہ وہ ایک جیتی جاگتی دنیا ہے، کیا؟ رُوحانیت! رُوحانیت ایک جیتی جاگتی دنیا ہے، رسول اللہؐ کے سامنے رُوحانیت کی ایک روشن دُنیا تھی اور رُوحانیت کی اِس دنیا کو سمجھنے کے لئے میں نے کہا جیسے ایک فلم، جیسے ٹی وی، کوئی شک نہیں آپ اِن دنیاوی چیزوں سے مدد لے سکتے ہیں۔ اُس میں رنگینی تھی، اُس میں شکلیں تھیں، اُس میں فرشتے تھے، اُس میں رُوحیں تھیں، اُس میں باتیں تھیں، اُس میں اشارے تھے، اُس میں آسمان زمین اور ہر چیز موجود تھی۔ تو رسول اللہؐ نے اُس کی ترجمانی کی، اُس کی ترجمانی کی عربی زبان میں۔

یہ بات ناممکن تھی کہ رسول اللہؐ اُس رُوحانیت کو، قرآن کی رُوح کو، قرآن کی رُوحانیت کو پوری طرح سے اپنے رنگ میں اپنی شکل میں اور ہر طرح سے بلاکم وکاست دنیا والوں کے سامنے پیش کریں یہ بات ناممکن تھی، لہٰذا وہ جو اصل چیز تھی وہ جو کیفیت تھی، وہ جو حالت تھی، وہ جو روشنی تھی وہ جو جیتی جاگتی دنیا تھی وہ تو رسول اللہؐ کے باطن میں رہی، مگر اُس میں سے ایک ترجمانی عربی زبان میں کتاب کی صورت میں منتقل کی گئی [یعنی] لکھی گئی۔ اَب آپ سوچیں کہ اُس میں اور اِس میں کتنا فرق ہے؟ اگر آپ دنیاوی طور پر اِس مطلب کو اِس مثال کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر سکتے ہیں تو ان شاء اللہ ہم آپ کو اِس سلسلے کی دُوسری باتیں بھی سمجھا سکتے ہیں اور یہ مثال آپ کے لئے بہت ہی ممد و معاون یعنی مددگار ثابت ہو سکتی ہے یہ بہت اچھی مثال ہے۔ تو رسول اللہؐ کے اندر وہ روشنی رہی وہ جیتی جاگتی دُنیا رسولِ اکرمؐ کے باطن میں رہی لیکن اُس میں سے کتابی شکل میں تحریر کے طور پر ایک چیز منتقل کی گئی، اِس کی مثال آپ اپنے الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ آپ کے سامنے کوئی فلم ہے وہ فلم گویا کہ بہت اچھی ہے، اُس میں سبق آموز باتیں ہیں، اُس میں کوئی (History) ہے، اُس میں دین کی باتیں ہیں، اُس میں کوئی جہاد کا قصّہ ہے، اُس میں اچھی نصیحتیں ہیں، اُس میں دین کی باتیں ہیں ایسی فلم بھی ہو سکتی ہے تو آپ اُس کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے کے بعد آپ چاہتے ہیں کہ اُس کی ایک کتاب مرتّب کریں تو آپ اِس [سلسلے میں] اور

کیا کرسکیں گے کہ حروف میں اور تحریر میں اُس کی ترجمانی کریں گے۔ مگر پوری طرح سے اُس چیز کو، اُس حقیقت کو، اُس روشنی کو، اُس حرکت کو، اُس زندگی کو، اُس روح کو، اُن آوازوں کو، اور اُس ماحول کو، اور اُن مناظر کو، اور اُس آسمان کو اور اُن رُوحوں کو منتقل نہیں کرسکتے ہیں۔

لہٰذا ابھی آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآنِ ناطق کیا ہے اور قرآنِ صامت کیا ہے؟ آگے بڑھنے سے پہلے یہیں پر فیصلہ کریں گے اور عرض کریں گے کہ جو چیز رسول اللہؐ نے کتاب کی شکل میں منتقل کر دی وہ کتابِ صامت ہے، خاموش کتاب اور جو حقیقت، جو روشنی، جو آوازیں اور جو چیزیں، جو رُوحانیت آنحضرتؐ کے باطن میں رہیں وہ کتابِ ناطق بولنے والی کتاب ہے۔ اب یعنی آج جو ہم کہتے ہیں کہ امام کتابِ ناطق ہے اور قرآن کتابِ صامت ہے تو یہ بات آج سے نہیں ہے رسول اللہؐ کے زمانے سے ہے، جس کا بیان میں آپ کو پیش کر رہا ہوں کہ جب رسول اللہؐ نے قرآن لکھایا کاتبوں سے آیت، آیت کر کے سورہ، سورہ کر کے جب لکھایا تو اُس وقت دو قرآن ہو گئے ایک بولنے والا قرآن جو رسول اللہؐ تھے اور دُوسرا وہ قرآن جو کاغذ کی صورت میں پیدا ہو گیا۔ لیکن اِس کے باوجود اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں پھر وہی اپنا [فیصلہ] چلانا چاہئے کہ قرآنِ ناطق ہی کو لیں اور قرآنِ صامت کو نہ لیں اِس سے ہمارا نقصان ہے کیونکہ قرآنِ صامت ہونے کے باوجود اپنے معنی کے اندر وہی اشارے رکھتا ہے، وہی معنی، وہی حکمتیں، وہی تاویلات جو ہونی چاہئیں، تو لہٰذا ہمیں ہر حالت میں قرآن سے تعلّق رکھنا ہے، اُس کو لینا ہے، اُس کو سمجھنا ہے۔

تو رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس میں قرآن کی یہ نورانیت یہ رُوحانیت اسی طرح سے باقی رہی صرف یہی نہیں بلکہ اگر شروع سے کہنا ہے تو مجھے اجازت ہو تا کہ میں اِس کے اُوپر کی باتیں قرآن سے متعلّق آپ کو پیش کروں میں نے ترتیب سے اِس لئے نہیں کہا کہ آپ کو ایک آسان تصوّر پیش کروں، ایک آسان مثال آپ کے سامنے پیش کروں تا کہ آپ اُس آسان مثال کو سمجھیں (Catch) کریں پھر اُس کے بعد جو مشکل بات ہے وہ آپ کو پیش کروں وہ یہ کہ قرآن سب سے پہلے کہاں تھا؟ یہ ایک سوال میں آپ سے کرتا ہوں آپ جواب نہ دیں صرف اِس کو ذہن نشین کریں، سب سے پہلے اور سب سے پہلے قرآن کہاں تھا؟ ''کن'' میں، آپ نے سنا ہے نا کہ خدا جب کسی چیز کو وجود دینا چاہتا ہے تو فرماتا ہے ''کن'' ہو جا، اِس امر میں قرآن تھا قرآن کا شروع وہیں سے ہوا کہاں سے؟ ''کن'' سے، ''کن'' میں قرآن تھا تو خدا نے ''کن'' کے ذریعے سے عقلِ اوّل کو، عقلِ کُل کو جو ایک فرشتہ ہے پیدا کیا تو قرآن ''کن'' میں سے عقلِ اوّل یا کہ عقلِ کُل میں آیا، عقلِ کُل اسماعیلی [مذہب] میں ایک اصطلاح ہے [جو] عام ہے اُس کو جاننا چاہئے، ''کن'' سے قرآن عقلِ کُل میں آیا۔

اب عقلِ کُل کیا ہے؟ مَیں مزید وضاحت کروں عقلِ کُل خدا کا قلم ہے، جس طرح انسان کا قلم ہے اسی طرح خدا کا بھی ایک قلم ہے پر فرق یہ ہے کہ انسان کا جو قلم ہے وہ بے جان ہے، مردہ ہے اسے تو ہاتھ سے پکڑ کر رگڑا جاتا ہے استعمال

کیا جاتا ہے لیکن خدا کا جو قلم ہے اُس کے لئے ایک اشارہ چاہئے۔ سب کام خدا کا قلم خود ہی کرتا ہے کیونکہ وہ زندہ ہے، کیونکہ اُس کا نام عقلِ کُل ہے تو قرآن اُس فرشتے میں آگیا دُوسرے درجے پر جس کا نام عقلِ کُلی ہے وہ ایک عظیم فرشتہ ہے اور اُس کا ایک نام قلمِ الٰہی ہے، خدا کا قلم تو خدا کے قلم کے لئے تفصیل سے حکم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف اتنا ہے کہ خدا کا قلم خدا کے ارادے کو جانتا تھا، خدا کے منشاء کو جانتا تھا۔ خدا کیا چاہتا ہے وہ قلم جانتا تھا لہٰذا خدا کے قلم نے سب کچھ کیا اُس نے قرآن کو لوحِ محفوظ پر لکھ دیا تو قرآن کے کتنے مقامات ہوئے؟ ''کن''، عقلِ کل یا کہ قلمِ الٰہی اور لوحِ محفوظ تین مقامات ہو گئے نا! اب میں ایک سوال کروں گا کہ جب قرآن ''کن'' میں تھا ''امر'' میں اور ''امر'' اسماعیلی مذہب میں ایک عام لفظ ہے [یعنی] حکم، جب خدا کے حکم کے اندر تھا قرآن تو پھر اُس کے بعد قرآن کی صورت عقلِ کُل میں آگئی اور اُس کے بعد قرآن لوحِ محفوظ پر نازل ہوا تو سوال یہ ہے کہ آیا جب لوحِ محفوظ پر قرآن لکھا گیا تو اُس وقت خدا کا جو قلم تھا [تو کیا] وہ قرآن سے خالی ہوگیا؟ یا کہ اُس کے اندر قرآن پھر بھی باقی تھا؟ یہ ایک سوال ہے، اِس کا جواب یوں ہے کہ لوحِ محفوظ پر لکھنے کے باوجود قرآن میں، قلمِ الٰہی میں، خدا کے قلم میں قرآن باقی تھا۔ کسی چیز کے لکھنے سے قلم میں کوئی کمی تو نہیں آتی ہے، قلم میں وہی طاقت ہے قلم میں وہی چیز ہے، اُس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ اچھا پھر سوال ہے کہ جب خدا نے ''کن'' فرمایا اور ''کن'' کے ذریعے سے عقلِ اوّل کو قرآن سونپا تو اُس وقت ''کن'' کا جو کلمہ ہے ''کن'' کا جو (Word) ہے [کیا] وہ قرآن سے خالی ہوگیا؟ نہیں!! ایسا نہیں تھا، ''کن'' کا جو (Word) ہے قرآن سے خالی نہیں ہوا۔ یہ اصولات ہیں آپ اِن پر ذرا محنت سے توجہ دیں، ایسا نہ کہیں کہ یہ مشکل الفاظ ہیں اور ہم نہیں سمجھتے ہیں، ایسا کہا گیا تو پھر ہماری مدد نہیں ہوگی اور مطلب کو، کورس کو، ہم آگے نہیں بڑھا سکیں گے۔

تو ''کن'' میں بھی قرآن ہے، خدا کے قلم میں بھی قرآن ہے اور لوحِ محفوظ پر بھی قرآن ہے، تین باتیں ہوگئیں، اچھا! تو پھر جبرائیل نے آنحضرتؐ پر قرآن نازل کیا، اچھا! پھر سوال کریں گے بڑا اچھا طریقہ ہے سوال کرنے سے انسان کو دلچسپی ہوتی ہے اور بات جو ہے یا جو (Lesson) ہے وہ خوب یاد ہوتا ہے تو جب جبرائیل نے لوحِ محفوظ سے قرآن کو نازل کرنا شروع کیا تو کیا لوحِ محفوظ سے اُس نے کھُرچ کر نازل کیا یا کہ لوحِ محفوظ پر قرآن بحال تھا؟ یہ ایک سوال ہے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا ہے کہ قرآن لوحِ محفوظ پر اَب نہیں ہے تو قرآن لوحِ محفوظ پر ہے اپنی اصلی حالت میں ہے، اَب بھی ہے۔ اسی طرح جب جبرائیل نے قرآن کی آیتیں آنحضرتؐ پر نازل کیں تو [کیا] جبرائیل کے باطن سے وہ آیتیں، وہ قرآن کی سورتیں فراموش ہوگئیں؟ یا کہ جبرائیل کے اندر قرآن کا عکس، قرآن کی باتیں، قرآن کی آیتیں اُسی طرح موجود تھیں، کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ جب جبرائیل نے آنحضرتؐ پر قرآن کی آیتیں نازل کیں تو اُس وقت جبرائیل کے ذہن سے، جبرائیل کے ضمیر سے، اُس کے باطن سے قرآن کی یادداشت مٹائی گئی، ایسا نہیں ہے۔ جبرائیل میں بھی یہ قرآن نظر

آتا ہے، ''امر'' میں قرآن نظر آتا ہے، عقل میں قرآن نظر آتا ہے، لوحِ محفوظ پر قرآن نظر آتا ہے، جبرائیل میں قرآن نظر آتا ہے۔ اچھا! پھر آجائیے اُسی مقام پر جہاں سے کہ ہم نے اُوپر کی طرف سفر کیا تھا یعنی آنحضرتؐ پر آگئے، سوال ہے کہ آنحضرتؐ نے جب قرآن لکھایا تو کیا قرآن کا وہ نقش آنحضرتؐ کے ضمیر سے، آنحضرتؐ کے دماغ سے، آنحضرتؐ کی رُوحانیت سے قرآن کا نقش مٹ گیا؟ نہیں! آنحضرتؐ میں قرآن بحال تھا اپنی اصلی حالت میں تھا۔

تو اچھا ہوا ہم کو کچھ بنیادی حقیقتیں مل گئیں جن سے کہ کوئی بھی دانشمند انکار نہیں کرسکتا ہے، اور قرآن میں بھی اِس طرح سے: بَلۡ هُوَ قُرۡآنٌ مَّجِيۡدٌ فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ (۸۵: ۲۱۔ ۲۲) یعنی قرآن دُنیا میں نازل ہونے کے باوجود لوحِ محفوظ پر بھی ہے۔ قرآن لوحِ محفوظ پر بھی ہے تو اَب ہمارے لئے مطلب [کو] سمجھنے میں کافی حد تک آسانی ہوگئی، تو رسول اللہؐ نے قرآن بے شک لکھایا، لکھانے کے بعد آنحضرتؐ نے قرآن کی رُوحانیت، قرآن کی تاویل، اُس کی روشنی اپنے جانشین کو سونپا۔ کس کو سونپا؟ مولانا علیؑ کو سونپا، اب اِس کے لئے ثبوت چاہئے، ہم نے تو زبانی طور پر دعویٰ کیا کہ آنحضرتؐ نے اسی قرآن کی رُوحانیت کو، قرآن کی رُوح کو، قرآن کے نور کو امامؑ کے حوالے کردیا، تو کس طرح کردیا؟ تو دیکھئے! دنیا میں کوئی شخص، کوئی صوفی، کوئی اسماعیلی [اس پر] سوچے، تو اِس مطلب کو دُوسروں میں سے سب سے پہلے صوفی سمجھے گا، اور اسماعیلی سمجھے گا۔ صوفی اِس طرح سے سمجھے گا کہ وہ رُوحانیت کے لئے کوشش کرتے ہیں اور عبادت اور ریاضت کے نتیجے میں وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں اور کسی حد تک اُن کا یہ دعویٰ صحیح بھی ہوتا ہے کہ اُن کا دل و دماغ روشن ہوجاتا ہے، کس چیز سے روشن ہوجاتا ہے؟ رُوحانیت سے، حقیقت سے اور طریقت سے اُن کا باطن روشن ہوجاتا ہے، وہ روشنی کیا ہے؟ رُوحانیت ہے اور ایک طرح سے کہا جائے تو صحیح ہے کہ وہ قرآن ہے، ایک مردِ صوفی میں، صوفی میں رُوح کی روشنی آجاتی ہے تو رُوح کی روشنی کیا ہے؟ قرآن ہے اور اپنے اسماعیلیوں میں ''اسمِ اعظم'' کے ذریعے سے ''بول'' کے وسیلے سے ''نقش'' کی مدد سے جو روشنی آتی ہے وہ کیا ہے؟ قرآن ہے، قرآن ہے۔

ہمارے پیروں کو جو حقیقت ملی، جو اُن کو امامؑ سے براہِ راست علم ملا، وہ کیا چیز تھی؟ قرآن تھا، قرآن تھا۔ جب یہ ممکن ہے کہ ایک صوفی کو اور اسماعیلیوں کو اور بزرگوں کو قرآن اِس طرح سے ملتا ہے تو بہت ممکن ہے اور یقینی بات ہے کہ رسول اللہؐ نے قرآن علیؑ کے سپرد کردیا اور اِس انداز سے کیا، اِس معنی میں کیا کہ علیؑ میں پیغمبر کی مرتبت یعنی پیغمبر کی رُوحانیت قرآن کی روشنی، قرآن کی حکمت، قرآن کی تاویل آگئی۔ اُس کے لئے یعنی ایسی چیزوں کی تخلیق کے لئے اور ایسی چیزوں کی منتقلی کے لئے کیا کیا جاتا ہے؟ ایک اسمِ اعظم، ایک محبّت، ایک خصوصی تعلیم [اور] ایک توجہ، اِن چار چیزوں سے پُل باندھا جاتا ہے، پُل بنایا جاتا ہے، راستہ بنایا جاتا ہے اور اُس راستے کی مدد سے رُوحانیت منتقل ہوجاتی ہے، رُوحانیت منتقل ہوجاتی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ جبرائیل نے جس طرح آنحضرتؐ کو قرآن سونپا تھا اِسی طرح آنحضرتؐ سے قرآن علیؑ

میں منتقل ہوگیا اور چونکہ علیؑ آنحضرتؐ کے بہت ہی عزیز تھے بہت ہی پیارے تھے، بہت ہی پسندیدہ تھے اور علیؑ امام تھے، علیؑ پیغمبر کے جانشین تھے، علیؑ خدا کے نور کے حامل تھے لہٰذا اُن میں قرآن کا آنا بہت ہی ممکن تھا۔

فی الحال آپ اِس قدر قبول کریں کہ قرآن کی حقیقت، قرآن کی روشنی قرآن کی رُوحانیت نبی سے علیؑ میں آگئی اور پھر علیؑ سے علیؑ کی اولاد کے آئمہ میں، اماموں میں منتقل یہ ہوتا رہا۔ وہ قرآن جو قرآنِ ناطق ہے اور اِس معنی میں خداوندِ عالم نے فرمایا کہ: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)۔ خداوندِ عالم نے اِس آیت کے اندر دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک کتاب ہے یعنی قرآن [اور] ایک نور ہے۔ اب ذرا سوچنے کی بات ہے یہ آیت قرآن کی ہے کسی عالم کا قول نہیں ہے، کسی شاعر کا شعر نہیں ہے یہ خدا کا ارشاد ہے، قرآن کی آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ دُنیا کے اندر کتاب بھی ہے اور نور بھی ہے، اگر یہ قرآن جو آپ کے سامنے ہے نور ہوتا تو نور کا الگ ذکر نہیں ہوتا تو اُس کا نام یا تو نور ہوتا یا [اُس کا] نام کتاب ہوتا، ایسا نہیں ہے۔ نور کتاب سے الگ ہے، کتاب کے علاوہ ہے، کتاب نور سے جدا ہے اور اِس آیت کے معنی کو سب سے پہلے ہم کو اِس طرح سے لینا چاہئے کہ رسولؐ اپنے زمانے میں نور تھا اور قرآن کتاب تھی، قرآن کی آیت کے ثبوت کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی ہے مسلمانوں کے لئے، صرف وضاحت کی ضرورت ہے ہم وضاحت کریں گے اور وہ وضاحت اِس طرح سے کریں گے کہ خدا نے یہ کیوں فرمایا کہ ہم نے تم کو ایک کتابِ ظاہر بھیجی ہے جو قرآن ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ نور کو بھیجا ہے؟ آپ سوچیں کہ اِس سے خدا کا مقصد کیا ہے؟ کتاب کے ساتھ ساتھ نور کو نازل کرنے کا مطلب کیا ہے؟ وہ مطلب اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اِس نور کی روشنی میں کتاب کو پڑھا جائے۔ کس نور کی روشنی میں؟ رسول اللہؐ کے زمانے میں رسولؐ کی روشنی میں اور امامؑ کے زمانے میں امامؑ کی روشنی میں قرآن کو پڑھا جائے۔ پھر بھی وضاحت کی ضرورت ہے وہ [یہ کہ] ہم کس طرح نور کی روشنی میں کتاب کو پڑھیں؟ کیا وہ نور کوئی مادّی نور ہے کہ ایک طرف ہم (Lamp) لگائیں، بتّی جلائیں اور ایک طرف قرآن کو کھولیں اور پڑھیں ایسا نہیں۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر کی تعلیم کے مطابق تم قرآن کو سمجھو اور امامؑ کی ہدایت کے مطابق تم قرآن کو سمجھو۔ پیغمبر اپنے زمانے میں قرآن پر روشنی ڈالے گا چونکہ وہ نور ہے تو تم اِس روشنی میں قرآن کو سمجھو اور پیغمبر کے بعد پیغمبر کے جانشین یعنی امامؑ کی ہدایت کی روشنی میں تم قرآن کو سمجھو۔ جب قرآن کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ امام کو ترجیح دیتا ہے امام کو نور قرار دیتا ہے اور قرآن امام کو کتابِ ناطق کا ٹائٹل دیتا ہے تو پھر کیا یہ مناسب ہے کہ ہم قرآن سے دست بردار ہو جائیں؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔

ہمیں تو چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ قرآن کی حکمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور قرآن کو سمجھیں اور سب سے زیادہ ہم اُس کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ہم اِس آیت کے ارشاد کے مطابق [کہ] خدا نے جس نور کو دُنیا میں قرآن پر روشنی ڈالنے کے لئے بھیجا ہے اُس نور کی روشنی میں ہم قرآن کو پڑھتے ہیں یعنی امامؑ کی ہدایت کے مطابق ہم قرآن کی حکمتوں کو سمجھتے ہیں۔ اِس سے وہ

مطلب مضبوط ہوگیا، وہ دلیل مضبوط ہوگئی جو ہم نے کہا تھا کہ نور پیغمبر سے امام میں منتقل ہوگیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے [اور] اِس آیت نے ثابت کر دیا کہ خداوند نے شروع ہی سے ایک نور ایک کتاب نازل کی۔

اِس کے علاوہ بھی پیغمبر کے نور ہونے کے بارے میں آیت ہے، مثلاً وہ آیت یہ ہے کہ: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا۔ وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (۳۳:۴۵۔۴۶)۔ اے رسول! ہم نے تم کو گواہ، ڈرانے والا، خوشخبری دینے والا اور خدا کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا۔ اگر رسول اللہؐ اپنے زمانے میں روشن چراغ تھے تو وہ روشن چراغ کہاں گیا؟ کہاں گیا وہ روشن چراغ؟ کیا وہ بجھ گیا؟ اگر بجھ گیا تو خدا نے یہ کیوں فرمایا دُوسری آیت میں کہ خدا کا جو نور ہے وہ بجھتا نہیں، خدا کا جو نور ہے وہ کبھی بجھتا نہیں ہے (۶۱:۸) اگر رسولؐ اپنے وقت میں روشن چراغ تھے، ہدایت کے روشن چراغ تھے اور وہ چراغ بجھنے والا نہیں تھا تو پھر رسولؐ کے بعد وہ روشن چراغ کون ہو سکتا ہے سوائے امام کے اِس دُوسری آیت سے بھی یہ ثبوت ملا کہ قرآن کی وہ رُوحانیت، وہ نورانیت، وہ روشنی، وہ سب کچھ جو رسول اللہؐ میں تھی قرآن کے لکھوانے کے بعد وہ رسول اللہؐ کی ظاہری رُحلت کے بعد دُنیا سے چلی نہیں گئی، اُس کو جانا نہیں تھا اِن آیات کے مطابق اُس کو دنیا میں قرآن کے معلّم ہونے کے لئے قائم رہنا تھا۔ لہٰذا یہ مرتبت یہ شرف، یہ روشنی، یہ رُوحانیت امامؑ میں منتقل ہوگئی اور جب مانا گیا کہ رسول اللہؐ کے جانشین میں وہ نور آگیا تو [گویا] رسول اللہؐ کے جانشین [یعنی] تمام امام [جنہیں] ہم مانتے ہیں وہ رسول اللہؐ کے جانشین ہیں اُن میں سے ہر امام میں یہی مرتبت، یہی فضیلت آگئی۔

[کوئی مومن] ریاضت کر کے اور چار سے پانچ تک کی بندگی کر کے اِس چیز کا تجربہ کر سکتا ہے، جیسا کہ ہمارے پیروں نے کیا لیکن یہ چیز پیروں کے ساتھ چلی نہیں گئی ہے بلکہ دُنیا میں رُوحانیت ہر وقت موجود ہے جس طرح کہ رسول اللہؐ کے ساتھ رُوحانیت ختم نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ اُس کو قائم رہنا تھا، قائم رہی اسی طرح پیروں کے بعد بھی یہ رُوحانیت، یہ حکمت، یہ قرآن کی رُوح قائم رہ سکتی ہے۔ یہاں پر ایک اور ذکر لازمی ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کی ایک زندہ رُوح بھی ہے وہ کیسی روح؟ اِس قسم کی جو انسان کے اندر رُوح ہوتی ہے مگر اِس سے اعلیٰ، رُوح القدّس جیسی رُوح قرآن کی رُوح ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن کے اندر کوئی حرکت نہیں ہے، کوئی گفتگو نہیں ہے اور اُدھر سے خدا جو فرماتا ہے کہ ''قرآن کی رُوح ہے'' (۴۲:۵۲) تو ہم سمجھ گئے کہ قرآن کی وہ رُوح بھی امامؑ ہی میں ہے۔ جس طرح کہ قرآن جب نازل ہوا تھا تو رُوح کے ساتھ نازل ہوا تھا لیکن [وہ] رُوح رسولؐ میں باقی رہی اور اُس کی تحریری شکل قرآن کے نام سے کاغذ پر اُبھری۔ اسی طرح اب بھی وہی رُوح ہمیشہ کے لئے قائم اور باقی ہے جو امامِ زمین و زمانؑ میں ہے، تو قرآن کی تاویل، قرآن کی حقیقت [کو] اِس طرح سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب آپ عبادت کریں گے، جب آپ بندگی بجا

لائیں گے تو آپ رُوحانیت میں جائیں گے [اور] آپ کے سامنے ایک روشن دنیا آئے گی، سب سے پہلے اُس کو آپ ''بیت الخیال'' کہتے ہیں یہ کیا ہے ''بیت الخیال''؟ قرآن کی (Beginning) ہے، قرآن کی ابتدائی صورت ہے، پھر رفتہ رفتہ اِس روشنی میں اور رنگینی آئے گی اور ترقّی ہوگی، یہاں تک کہ ایک دن آپ کی رُوحانیت میں گفتگو، بات چیت کا آغاز ہوگا اور اگر آپ نے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقّی کی اور وہاں تک ترقّی کی جہاں تک ہمارے پیروں نے کی تھی تو اُس وقت آپ اُس منظر کو دیکھیں گے، قرآن کی رُوحانیت کو دیکھیں گے، نزولِ قرآن کو دیکھیں گے، اُن واقعات کو دیکھیں گے اور اُن حالات کو دیکھیں گے۔

اچھا دُنیا کی ترقّی یافتہ قوموں کے پاس اُن کی ہر چیز ریکارڈ ہوتی ہے، فلموں کی شکل میں، کیسٹوں کی صورت میں اور دیگر ذریعوں سے وہ اپنی ہر چیز کو ریکارڈ کرتے ہیں تو کیا یہ خدا کی قدرت سے ناممکن ہے کہ رسول اللہ پر جس طرح سے قرآن نازل ہوا تھا اُس کا کوئی ریکارڈ [نہ] ہو اور ہے خدا نے جس نور کا ذکر کیا ہے اُس نور کے اندر سب کچھ ہے، سب کچھ ہے، تو اگر آپ رُوحانی طور پر ترقّی کرتے ہیں اور آگے سے آگے بڑھتے ہیں اور آگے سے آگے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ آپ اُس مقام کو پہنچتے ہیں جہاں تک ہمارے پیر و بزرگ پہنچے تھے تو وہاں پر آپ کو زندہ قرآن ملے گا، اور بالکل اسی طرح سے ملے گا جس طرح کہ رسول اللہؐ پر نازل ہوا تھا، وہ واقعات، وہ حالات کو دیکھیں گے۔ جب آپ نے اِس چیز کو دیکھا، پایا تو پھر آپ قرآن کی حکمتوں کو سمجھنے لگیں گے اُن واقعات کی روشنی میں، اُن حالات کی روشنی میں جو آپ پر گزر گئے اِس چیز کو کہتے ہیں قرآن کی تاویل، قرآن کی عملی تاویل اسی طرح سے سمجھ میں آتی ہے ایسا نہیں کہ قرآن کو کھولیں اور (Dictionary) کو لیں اور کتاب سے لیں اُس سے لیں، اِس سے لیں یا درس و تدریس کے طور پر قرآن کی حکمت سمجھائی نہیں جاسکتی ہے۔ تو میں نے جو کہا تھا کہ امام قرآن کے معلّم ہیں وہ بالکل اِس طرح سے ہیں کہ آپ کو ایک رُوح دیں گے، ایک (Spirit) دے دیں گے، ایک رُوحانیت کا راستہ بتلائیں گے آپ عبادت کریں گے تو خود بخود معجزانہ طریقے سے قرآن کی حقیقتیں، قرآن کی روشنی اور قرآن کی رُوح آپ کے سامنے آئے گی، یہ ہوا امام کا کسی کو قرآن سکھانا، کسی کو قرآن کا بھید بتانا، ہمارے پیروں کو جو قرآن کی حکمت آئی تھی تو اُس میں ایسا نہیں ہوا تھا کہ اُن میں سے کوئی پیر مدّتوں تک امام کے حضور میں بیٹھے اور امام قرآن کو کھولے اور امام اُس کو قرآن پڑھائے جس طرح دُنیا کے ملّا، مولوی لوگ اور اُستاد لوگ اپنے شاگردوں کو قرآن کی تعلیم دے دیا کرتے ہیں یہ بات ہرگز [ایسی] نہیں ہے۔ خدا کی تعلیم اِس دنیوی تعلیم کے برعکس ہے تو آنحضرتؐ نے بھی خدا سے، جبرائیل سے، قرآن کی تعلیم کچھ اِس طرح سے نہیں لی تھی کہ جبرائیل آئے کوئی کتاب کھولے اُس کو پڑھائے، سمجھاوے حرف بہ حرف نہیں! ایسا نہیں، وہ رُوحانیت ہے، وہ علمِ لدنّی ہے، وہ خدائی علم ہے، وہ معجزانہ علم ہے، کیا ہم معجزے کو نہیں مانتے ہیں؟ ہم اگر معجزے کو مانتے ہیں تو اصل معجزے کو ماننے کا

مقام یہی ہے کہ معجزہ جو ہے وہ سب روحانیت ہے۔ اِس لئے ہمارے پیروں نے اماموں سے جو قرآن کی حکمت اور قرآن کی رُوحانیت حاصل کی وہ بالکل اسمِ اعظم کے ذریعے سے، ''بول'' کے ذریعے سے، ریاضت عبادت کے نتیجے میں، ریاضت عبادت کے نتیجے میں اُن کو سب سے پہلے روشنی [نظر] آئی، اُس روشنی میں اضافہ ہوا، پھر اُس روشنی میں گفتگو شروع ہوئی، رُوحوں سے اُن کی ملاقات ہوئی، فرشتے آگئے اور قرآن کے بھید اُن پر کھل گئے اِس طرح سے اور میں عرض کرتا ہوں کہ اب بھی یہ بات ہے اب بھی ممکن ہے، امام ایسی ہستی کا نام ہے کہ وہ قرآن کے بھیدوں کو مومنین پر اُن کی کوشش کے مطابق ظاہر کرتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہم رُوحانی ترقّی کے لئے کیا کریں؟ یہ سوال الگ ہے ہمیں تو اِس سے اگر بحث کرنی ہے تو اِس سے الگ کرنی چاہئے، فی الحال ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ قرآن رُوحانی راستے سے کسی کو کس طرح حاصل ہوسکتا ہے [یعنی] قرآن کی رُوحانیت قرآن کا باطن۔ ایک بات اور میں آپ کو بتاؤں خدا نے آنحضرتؐ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۳:۴۸)۔ تو پیغمبر کا یہ کام تھا کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو کتاب سکھائے اور حکمت سکھائے۔

اِس سے دانشمند کو ظاہر ہے کہ کتاب الگ ہے اور حکمت الگ ہے۔ کتاب یعنی کتابِ قرآن ظاہر میں ہے اور حکمت اُس کی رُوحانیت، اُس کی رُوح، اُس کی تاویل ہے۔ اب مجھے وہ بات بتانے کے لئے اجازت ہو جو شروع میں بتانی چاہئے تھی وہ یہ کہ رسول اللہؐ پر کس طرح قرآن نازل ہوا؟ ایک پہلو یہاں رہ گیا [تھا] وہ یہ کہ جیسا کہ آپ نے سنا ہے کہ رسول اللہ غارِ حرا میں عبادت کرلیا کرتے تھے اور یہ عبادت اسمِ اعظم کی عبادت تھی، بندگی تھی وہ مسلسل عبادت کرتے تھے، اعتکاف کرتے تھے کہ جس کے نتیجے میں اُن پر روشنی کا ظہور ہوا اور وہ قرآن کی روشنی تھی، رفتہ رفتہ اُس روشنی میں اضافہ ہوگیا، یہاں تک کہ اُن پر قرآن کی رُوح نازل ہوئی، رُوح القدّس نازل ہوئی اور قرآن کا اُترنا شروع ہوگیا اور بالکل اُسی طرح سے جس طرح آپ کو روشنی کا تجربہ ہوتا ہے یا آپ روشنی کے تجربے کے لئے عبادت کرتے ہیں بالکل ایک ہی راستہ ہے، بالکل وہی چیز ہے جو شروع سے ہے۔ کیونکہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ ہم رُوحانیت، اسمِ اعظم اور قرآن کو ساتھ لیں گے چونکہ اِس کے آپس میں ایسا (Connection) ہے، ایسا رابطہ ہے کہ ہم اِس کو الگ الگ نہیں کرسکتے ہیں۔ قرآن کی رُوحانیت اور عام روحانیت جسے ہم رُوحانیت کہتے ہیں، وہ الگ الگ نہیں ہے ایک ہی رُوحانیت ہے، جب ہم کہتے ہیں نور تو وہ نور ایک ہے، قرآن کا نور امام کا نور، پیغمبر کا نور ایک ہی نور ہے، خدا کا نور ایک ہی نور ہے، تو اِس لئے ہم رُوحانیت کو اور قرآن کو اور امام کے نور کو الگ الگ نہیں کرسکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ اِس مضمون کو اِس طرح سے لیں کہ امام کے نور کو، روحانیت کو، قرآن کی رُوح کو اُس کو ایک ہی مضمون قرار دیں۔ تو رسول اللہؐ نے اپنے وقت میں عبادت کی تھی اور اُس عبادت کے نتیجے میں اُن پر [یعنی] آنحضرتؐ پر قرآن نازل ہوا تھا لیکن جاننا چاہئے کہ رُوحانیت صرف رسول اللہ

ؑ کے زمانے سے نہیں ہے بلکہ یہ رُوحانیت شروع ہی سے ہے، ابتدا سے ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے ناموں کا علم بتایا تھا جیسا کہ قرآن میں ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲:۳۱)۔ آدم کو خدا نے سب نام بتا دیئے، سب نام خدا نے آدم کو سکھا دیئے تو یہ نام کیا تھے؟ چیزوں کے نام! ایسا نہیں ہے، اسمِ اعظم، اسمِ اعظم کی تعلیم، جسے آپ ''بڑا کام'' کہتے ہیں جسے آپ ''بول'' کہتے ہیں، تو یہی اسمِ اعظم سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھایا تھا اور جس کی روشنی میں اُن کو تمام علوم، خدائی علوم، رُوحانیت کے علوم آ گئے۔ دیکھا آپ نے کہ جو چیز آج آپ کے پاس [ہے] وہ ازلی حقیقت ہے، وہ ہمیشہ سے ہے وہ آدم کے زمانے سے ہے نہ کہ یہ درمیان سے، درمیان سے نہیں ہے آدمؑ کے زمانے سے ہے، تمام پیغمبروں نے اسی اسمِ اعظم سے رُوحانیت حاصل کی اور آسمانی کتاب کی حقیقت اسی ذریعے سے اُن کو حاصل ہوئی۔

آپ انجیل کو لیں دیکھیں اُس کے اندر بھی یہی بات ہے، اگرچہ انجیل آج اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے، اُس میں کچھ تبدیلیاں، بہت ساری تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ تاہم اُس کے اندر یوحنّا کی انجیل میں آپ دیکھیں اُس میں ''بول'' کا ذکر ہے، اُس میں اسمِ اعظم کا ذکر ہے، اُس میں روحانیت کا ذکر ہے، اُس میں نور کا ذکر ہے، تو باور آیا کہ رُوحانیت جو ہے وہ قرآن کی رُوحانیت ہے اور نور جو ہے وہ قرآن کا نور ہے، امام کا نور [اور] قرآن کا نور الگ نہیں ہے۔ یعنی قرآن کے لئے جس روشنی کی ضرورت ہے یا تھی وہ روشنی امامؑ ہے اور کتابِ ناطق اور کتابِ صامت کے آپس میں ربط ہے، (Connection) ہے۔ اِس لئے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں اپنے بعد دو گرانقدر چیزیں چھوڑ جاتا ہوں تم کو چاہیئے کہ اِن دونوں چیزوں کو ایک ساتھ لیں یہ ایک دُوسرے سے جدا نہیں ہیں قیامت تک یہ دونوں چیزیں ساتھ رہیں گی۔ تو قرآن کے باطن کا تعلّق امام سے ہے اور امام قرآن کے ساتھ ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اَلْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ وَ عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ قرآن جو ہے علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ ہے۔ اِس کا مطلب یہ کہ قرآن کی حقیقی صورت اصلی شکل امام کی رُوحانیت میں ہے اور قرآن میں علیؑ کا ذکر ہے علیؑ کی تعریف ہے کیونکہ علیؑ نور ہے، علیؑ سے مراد امام، علیؑ کا مطلب امامِ زمان، تو امامِ زمان کا ذکر قرآن میں ہے۔ مجھے کہنے کی اجازت ہو کہ قرآن میں کس طرح ہر آیت میں علیؑ کا ذکر ہے، مولا علیؑ کا ایک ارشاد ہے وہ فرماتے ہیں کہ: قرآن چار حصّوں میں نازل ہوا ہے، چار حصّوں میں! قرآن کی چار چوتھائیاں ہیں یا کہ قرآن چار حصّوں میں نازل ہوا ہے، پہلے حصّے میں بالکل آشکار ہماری تعریف ہے علیؑ فرماتے ہیں، دُوسرے حصّے میں ہمارے دشمنوں کی مذمت کی گئی ہے، ہمارے دشمنوں کی بُرائی بیان کی گئی ہے، تیسرے حصّے میں مثالیں بیان کی گئی ہیں [اور] چوتھے حصّے میں احکام ہیں، اوامر ہیں۔ آپ ذرا اِس کی تفصیل میں جائیں کہ قرآن کے ایک چوتھائی میں بالکل آشکارا طور پر امام کی تعریف ہے، دُوسرے حصّے میں امام کے دشمنوں کا ذکر ہے، قرآن کے جس حصّے میں امام کے دشمنوں کا ذکر ہے تو وہ امام کی وجہ سے ہے، تو پھر بھی (Indirectly) اِس میں امام کا ذکر آ گیا دُوسرے حصّے میں، کیونکہ

اُس میں امام کے دشمنوں کا ذکر آیا اور امام کی وجہ سے اُس کے دشمنوں کی مذمّت کی گئی تو اِس دُوسرے حصّے میں بھی (Indirectly) امام کا ذکر آیا، امام کی تعریف آ گئی۔ اب رہ گیا تیسرا حصّہ اور چوتھا حصّہ تو تیسرے حصّے میں مثالیں ہیں، مثالوں میں بھی امام کا ذکر ہے جس طرح خدا کی رسّی، جس طرح خدا کا ہاتھ، جس طرح خدا کی آنکھ، یہ سب امام کی مثالیں ہیں، آخری حصّے میں احکام ہیں تو احکام میں بھی امام کا ذکر آیا ہے، اِس لئے کہ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (۵۹:۴)۔ تو قرآن کے کسی حکم پر عمل خدا اور رسولؐ اور صاحبانِ امر کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ تو صاحبِ امر قرآن کے تمام احکام سے اُوپر ہوتا ہے، قرآن پر عمل صاحبِ امر کی ہدایت کے مطابق ہونا چاہئے۔ لہٰذا ہر اطاعت، ہر ہدایت سے پہلے صاحبِ امر کا ذکر آتا ہے، تو اِس آخری حصّے میں بھی امام کا ذکر آیا۔ اب آپ بتائیں کہ قرآن کی کون سی آیت ہے جس میں امام کا ذکر نہیں ہے؟ کچھ میں تو ظاہراً ذکر ہے، کچھ میں تو باطناً ذکر ہے، کچھ میں مثالوں میں ہے، کچھ میں تو احکام کے انداز میں ہے، تو قرآن کے اندر جس بات سے منع کیا گیا ہے اور جس کام کے لئے حکم دیا گیا ہے تو اُس حکم کے ساتھ صاحبِ حکم، صاحبِ امر بھی ہے، جو اولو الامر ہے، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (۵۹:۴)۔ تو قرآن کی ہر ہر بات پر عمل خدا کے حکم کے مطابق، رسولؐ کے حکم کے مطابق اور صاحبِ امر کے حکم کے مطابق ہے۔ تو اِس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں امام کا ذکر نہ ہو، امام کا ذکر ہے، امام کی تعریف و توصیف ہے، جب ہی تو میں نے عرض کی تھی کہ قرآن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہم ہی اُٹھا سکتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس قرآن کا نور ہے، ہمارے پاس قرآن کا معلّم ہے اور قرآن بھی اُس دین کا (Favour) کرتا ہے، جو حق ہے، جو سچ ہے، تو ہمارا دین سچ ہے اِس لئے قرآن کو چاہئے کہ وہ ہمارے مذہب کی تصدیق کرے اور تائید کرے۔

لہٰذا قرآن کی طرف توجہ کی ضرورت ہے خصوصاً اِس زمانے میں اِس لئے کہ دنیاوی جو تعلیم ہے وہ بہت آگے بڑھ چکی ہے اور فلسفہ، علمِ ظاہر بہت ہی ترقّی پر ہے اور دُنیا میں لوگ ظاہری منطق اور دنیوی علوم اور سائنس سے فائدہ اُٹھا کر وہ بہت کچھ سوالات کرتے ہیں اور ایک طرف سے کچھ لوگ دین سے ہٹ بھی جا رہے ہیں اور پھر دُوسری طرف سے دنیا کے اندر لادینیت بھی آ رہی ہے۔ اِن تمام خطرات کے پیشِ نظر اپنے دین کو، ایمان کو سنبھالنے کے لئے قرآن کے جاننے کی ضرورت ہے اور جیسا کہ میں نے اشارہ کیا آپ کبھی ایسا نہیں سوچیں کہ امامؑ سب کام کرے اور ہر کام کرے اور آپ کو دینی تعلیمات بھی مہیا کریں، آپ کو سمجھائیں، سکھائیں، یہ امام کا کام نہیں ہے، یہ امام کا کام نہیں ہے۔ امام کا کام یہ ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے اشخاص، افراد، آدمی پیدا کرتے ہیں، جس طرح انہوں نے پیروں کو پیدا کیا تھا، جس طرح کہ فرمان میں ہے کہ: ''میں ہر زمانے میں لوگوں کو سکھانے کے لئے اپنی طرف سے لوگوں کو پیدا کرتا ہوں اُستاد مہیا کرتا ہوں'' تو آپ زیادہ سے زیادہ امام سے رُوحانی مدد طلب کریں اور خود بخود چونکہ اسماعیلی ہیں رُوحانی علم سے بہت ہی قریب ہو

سکتے ہیں اور جس علم کو علمِ لدنّی کہا جاتا ہے وہ علم آپ حاصل کر سکتے ہیں، براہِ راست امام سے آپ علم حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ قرآن میں دیکھیں علمِ لدنّی کا ذکر ہے، خدا نے فرمایا ہے کہ ہم کچھ لوگوں کو اپنے حضور سے علم دے دیتے ہیں، ایسا نہیں کہ یہی ظاہری علم اور اِس کے سوا کچھ نہیں، ہم باطنی علم بھی لے سکتے ہیں۔ دیکھئے! انسان اگر سوچے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ رُوحانی وحی، الہام [اور] القا سے بہت ہی نزدیک ہے، بہت ہی نزدیک ہے اور آپ نے سنا ہے آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے اندر ایک طاقت ہے بُرائی کی طاقت، جس کو شیطان کہا جاتا ہے۔ دیکھیں میں ایک اچھی مثال آپ کو پیش کرتا ہوں آپ توجہ دیں، شیطان کے متعلّق آپ نے سنا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، کیا خدا نے اُس کو اتنا پاور دیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کر دینے کے لئے لوگوں کے دلوں میں وسوسے، پریشان خیالات اور غلط افکار پیدا کر دیتا ہے، یہ کام وہ کر سکتا ہے، اچھا یہ کام وہ کر سکتا ہے۔ تو بُرائی کے لئے خدا نے یہ ذریعہ پیدا کیا، بھلائی کے لئے، ہدایت کے لئے جو اُس نے ہادیٔ برحق کو مقرّر کیا ہے اُس کے پاور کے [متعلق] سوچیں ذرا، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جس طرح شیطان بہت ہی دُور بیٹھے بیٹھے اپنے پاور سے کسی کے دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے تو جو ہادی ہے، ہدایت کرنے والا، خدا کا خلیفہ ہے وہ بھی دُور بیٹھے کسی کے دل میں توفیق ڈالے، کسی کے دل میں القا کرے، کسی کو ہمّت دے اور کسی کو سمجھائے اور عقل کی بات بتائے کیا یہ ناممکن ہے کیسے ناممکن ہے؟ ضرور ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ امام بالکل ہدایت دیتا ہے اور ہدایت کا مطلب وہ تعلیم دیتا ہے وہ سکھاتا ہے، وہ سمجھاتا ہے، جیسا کہ بہت دفعہ آپ نے عبادت کے نتیجے میں محسوس کیا ہے کہ آپ کے ضمیر کے اندر روشنی ہے، آپ کے اندر سکون ہے، آپ کے دل سے وہ باطل خیالات اور وسوسے دُور ہو گئے تو گویا آپ کا جو دل ہے وہ وحی کے لئے تیار ہو گیا اور بھی ذرا کوشش کریں تو رفتہ رفتہ آپ کے دل کے اندر وحی کی باتیں، رُوحانیت کی باتیں، توفیقات، ہدایت اور ہمّت اور ایسی چیزیں آسکتی ہیں، یقیناً یہ بات صحیح ہے تو قرآن کی تعلیم بھی اِس طرح سے آتی ہے اور جس کے لئے میں نے اپنی اِس گفتگو میں کبھی کہا تھا کہ اُس کے لئے تقریباً چار عناصر چاہئیں اگر کسی کو رُوحانیت میں ترقّی کرنی ہے اور امام کی نورانی ہدایت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے تو اُس کو چاہئے کہ چار عناصر اپنے میں پیدا کرے، ایک یہ کہ وہ خصوصی عبادت میں حصّہ لے، صبح کی نورانی عبادت میں، دُوسری یہ کہ وہ ظاہری یعنی دینی علم سے رابطہ رکھے اور تیسری چیز یہ کہ وہ امام کی محبّت کو حاصل کرے [اور] چوتھی چیز یہ کہ وہ خود کو اِس قابل بنائے کہ امام اُس کی طرف باطن میں توجہ دیں،، خدمت سے، عبادت سے، نیکی سے، تو اِن چیزوں کے نتیجے میں اُس کے اور امام کے درمیان ایک پُل تیار ہو گا، ایک راستہ مرتب ہو گا، راستہ بنے گا اور پھر اِس راستے سے چل کر یہ امام کے ساتھ اپنا (Link) قائم کر سکتا ہے رابطہ کر سکتا ہے اور پھر براہِ راست امامؑ سے تعلیم حاصل کر سکتا ہے، براہِ راست امام سے تعلیم حاصل کر سکتا ہے

امام ایسی ہستی کا نام ہے کہ وہ قرآن کی حقیقتوں کو قرآن کے بھیدوں کو زمانے کے مطابق بتلاتا ہے کیونکہ قرآن

کے معنیٰ ایک نہیں ہیں وہ سات ہیں ایک ہی آیت کے سات باطن ہیں اور ایک روایت میں ستّر باطن ہیں یہ بات مانی گئی تو قرآن ظاہر میں اتنا ہے [یعنی محدود ہے] اگر اُس کے باطن کو لیں تو اتنا ہے [لامحدود ہے]۔ کیونکہ آپ اندازہ لگائیں کہ ایک چیز ہے آپ کے نزدیک [یعنی] ایک حصّہ ہے اور دُوسرے دانشمند کے نزدیک سات گنا ہے اور ایک اعتبار سے وہ ستّر گنا ہے تو کہاں ستّر گنا اور کہاں ایک حصّہ، تو قرآن کے باطنی معنیٰ ظاہری معنیٰ سے بہت زیادہ ہیں اور یہ بہت زیادہ اِس لئے ہے کہ زمانے کے مطابق رفتہ رفتہ امام اپنی ہدایت سے جماعتوں کو فیض پہنچاتے ہیں یعنی امام جو کچھ فرماتے ہیں وہ ایک اعتبار سے قرآن کے باطن کے مطابق ہے اور قرآن کی حکمت ہے قرآن کے باطن میں سے ہے، قرآن کی تاویل میں سے ہے۔ اِس لئے باور کرنا چاہئے کہ امام جو کچھ فرماتے ہیں البتہ وہ قرآن کے باطن میں سے ہے اور جاننا چاہئے کہ رُوحانیت جو ہے بے شک قرآن کی رُوح کو حاصل کرنے کے لئے ہے رُوحانیت جو ہے وہ قرآن کی حکمت کو سمجھنے کے لئے ہے، معرفت کے لئے ہے اور حقیقت کے لئے ہے۔ جاننا چاہئے کہ قرآن ایک میوے کی طرح ہے، پھل کی طرح ہے جو بہشت سے آیا ہے، قرآن ایک پھل ہے بہشت کا ایک پھل اُس کا مغز بھی ہے اور اُس کا ظاہری گودا بھی ہے، جس طرح بعض پھل ایسے ہوتے ہیں کہ اُس کے اندر مغز ہوتا ہے، گٹھلی کے اندر اور اُس کے باہر پھل ہوتا ہے تو آدمی اُس کے ظاہر کو کھاتا ہے اُس کے بعد آخر میں [اُس کے] مغز کو کھاتا ہے اسی طرح لوگ بعض دفعہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسماعیلی جو ہیں وہ قرآن پر عمل نہیں کرتے ہیں، حالانکہ اُن کو جاننا چاہئے کہ قرآن پر اسماعیلیوں سے کوئی زیادہ عمل نہیں کرسکتا ہے اِس لئے کہ ہم نے شریعت کے دَور میں قرآن کے ظاہر پر عمل کیا اور حقیقت کے دَور میں قرآن کے باطن پر عمل کر رہے ہیں۔ اِس معنیٰ میں بحیثیتِ مجموعی جو ہم نے قرآن پر عمل کیا وہ کسی نے نہیں کیا کیونکہ جاننا چاہئے کہ ہر مذہب کے ماننے والے ایک فرد کی طرح ہیں ہر مذہب کے ماننے والے ایک آدمی کی طرح ہیں، مثلاً رسول اللہؐ کے زمانے میں الگ الگ نظریات قائم ہوئے تھے، اُس وقت سنّی بھی تھا، اثنا عشری بھی تھا، اسماعیلی بھی تھا، مسلمانوں کے جتنے [بھی] فرقے ہیں وہ تقریباً بحدِ قوت موجود تھے، یعنی اِس قسم کے نظریات رسول اللہؐ کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور علیؑ کے چاہنے والے اسماعیلی تھے اور اُس کے نہ چاہنے والے لوگ دُوسرے تھے۔ بہرحال وہاں سے لے کر ہم نے قرآن پر عمل شروع کیا اور شریعت کے زمانے میں دُرست اور صحیح طور سے ہم نے قرآن پر عمل کیا جب شریعت کا زمانہ چلا گیا اور حقیقت کا زمانہ آیا تو ہم نے قرآن کے باطن پر عمل شروع کیا، اِس لحاظ سے ہمارے مقابلے میں دُوسروں نے جو کچھ کیا وہ انہوں نے فقط شریعت پر عمل کیا حقیقت پر عمل نہیں کیا کیونکہ اسلام کی تشبیہ ایک راستے سے دی گئی ہے، راستہ! اسلام کیا ہے؟ راستہ ہے۔ اُس راستے کا کیا نام ہے؟ صراطِ مستقیم، اسلام صراطِ مستقیم ہے، اب جب مانا گیا کہ اسلام ایک راستہ ہے تو یہ راستہ کس لئے ہے؟ کہیں جانے کے لئے ہے البتہ سامنے کوئی بنگلہ آتا ہے یا کوئی گھر آتا ہے یا کوئی باغ آتا ہے یا کوئی شہر آتا ہے

راستے کا مقصد ہی کہیں جانے کے لئے ہوتا ہے تو رسول اللہؐ نے اُس زمانے میں [یعنی] چودہ سو سال پہلے جو راستہ بتلایا تھا مسلمانوں نے اُس کی کتنی مسافت طے کی تھی؟ کہاں تک وہ چلے؟ کس کس منزل کو طے کیا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ (Starting Point) پر ہیں، وہی شریعت پر ہیں حالانکہ اسلام کے اندر چار منزلیں ہیں شریعت، طریقت، حقیقت [اور] معرفت، تو یہ اسلام کا راستہ خدا نے اور رسولؐ نے جو بتایا تھا منزلِ مقصود کو پہنچنے کے لئے بنایا تھا، تو انہوں نے کیا کیا؟ اُن کو تو چلنا چاہیئے تھا۔

اِس کے علاوہ ہادی کے تصوّر کو آپ لیں، ہادی کس کو کہتے ہیں؟ روکنے والے کو، پیچھے ہٹانے والے کو، دُور کر دینے والے کو نہیں! ہادی کہتے ہیں راستہ بتلا کر پیروؤں کو آگے سے آگے بڑھا کر منزلِ مقصود تک پہنچانے والے کو ہادی کہتے ہیں اِس لفظ ہادی کو ذرا لیں، ذرا سوچیں انصاف سے سوچیں کوئی سوچے، اِس میں بھی وہی ہے: اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (۱:۵) کے معنی کو لیں، کیا مطلب؟ اِس کے معنی کیا ٹھہرنے کے ہیں یا منزلِ مقصود کی طرف چلنے کے ہیں، آگے بڑھنے کے ہیں؟ اگر رسول اللہؐ کے زمانے میں یہ دُعا کی گئی کہ اے بارِ خدایا! ہم کو راہِ راست پر چلانا اور آگے بڑھانا، اگر ایسی دُعا کی گئی تو اِس کے مطابق ایک عمل بھی چاہیئے تھا کہ [وہ] چلتے ہادیٔ زمان کے پیچھے پیچھے چلتے ایسا نہیں کیا گیا زبان سے دُعا [تو] مانگی گئی لیکن وہ آگے نہیں چلے، آگے نہیں چلے، تو رسول اللہؐ نے جو کہا: اَنَا دَارُ الۡحِكۡمَةِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا اِس کا مقصد کیا تھا کہ میں حکمت کا گھر ہوں علیؑ اُس کا دروازہ ہے، کیا یہ حکمت کا گھر کسی راستے کے ختم ہونے پر آنے والا تھا؟ یا آدمیوں کے پیچھے تھا یا آگے تھا؟ سامنے تھا؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ صراطِ مستقیم کے آخر پر ہونا چاہیئے، یہ حکمت کا گھر جس کا دروازہ علیؑ ہیں، میں پھر سے عرض کرتا ہوں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اُس کا دروازہ ہے''، تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ حکمت اُس کے بغیر نہیں ملے گی کہ علیؑ کی پیروی کرے اور علیؑ کے ذریعے سے علیؑ کے (Through) محمدؐ کے گھر میں داخل ہو جائے تا کہ اُن کو حکمت ملے ایک [بات]، دُوسری بات اِس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ حکمت کا گھر منزلِ مقصود پر تھا یا پیچھے تھا؟ جہاں سے راستہ شروع ہوتا ہے، اُس سے پیچھے تھا، اُلٹا یا آگے تھا؟ جہاں پر راستہ ختم ہوتا ہے، اِس میں بھی چلنے کے آگے بڑھنے کے معنی ہیں تو مسلمانوں کو حکمت کی زبان سے بتلایا گیا تھا کہ تم کو ترقّی کرنی ہے اور آگے بڑھنا ہے۔ اِس کے مطابق الحمدللہ اسماعیلی آگے بڑھے منزلِ مقصود کی طرف تو جب مسافر آگے بڑھتا ہے تو اُس کا جو پچھلا ماحول ہے وہ وہاں رہ جاتا ہے اور اُس کی وہ تیاری بھی بدل جاتی ہے یا اُس کے حالات بھی بدل جاتے ہیں جو شروع میں ہوتے ہیں اور اگر مان لیا جائے کہ منزلِ مقصود کو پہنچ گئے تو اُس میں بالکل حالات مختلف ہو جاتے ہیں۔

ایک اور بات میں آپ کو بتلاؤں قرآن ہی کے سلسلے میں آپ ذرا سوچ کر بتائیں میں سوال کرتا ہوں آپ سے کہ آپ نے سنا ہوگا کہ قرآن (۲۳) تیئس سال کے اندر نازل ہوتا رہا اور اُس مدّت میں کتنی کتنی ترمیمات ہو گئیں؟ قرآن میں

کہ ایک آیت منسوخ ہوگئی یعنی ایک خدا کا حکم منسوخ ہوگیا اور اُس کی جگہ پر دُوسرا حکم آیا کتنی مدّت میں اور کتنے عرصے میں؟ تیئس سال کے عرصے میں اور آپ نے یہ بھی سن لیا ہوگا کہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث میں ترمیمات کی ہیں، تیئس سال میں آنحضرت نے جو نبوّت کی اُس درمیان انہوں نے اپنے ایک اگلے حکم کو تبدیل کر کے اُس کی جگہ پر نیا حکم دیا یہ کیوں؟ خدا نے اپنے احکام میں، احکامات میں ترمیمات کیوں کی؟ رسولؐ نے اپنی احادیث میں ترمیمات کیوں کیں؟ کیا یہ دُنیا اور زمانے کی ضرورت سے تھا یا کہ خدا اور رسولؐ پہلے نہیں جانتے تھے بعد میں اُن کو خیال آیا، یہ کبھی نہیں ہو سکتا ہے کہ خدا کو بعد میں خیال آیا ہو اور اُس کو کوئی نئی [اور] اچھی بات یاد آئی ہو ایسا تصوّر کبھی نہیں ہوسکتا ہے، کافر بھی اِس طرح سے نہیں سوچتا ہے خدا کے متعلّق، خدا تو ہر عیب سے ہر نقص سے پاک ہے اور اسی طرح رسولؐ بھی لیکن خدا اور رسول کے احکام میں اگر تبدیلی آتی ہے تو یہ وجہ ہے لوگوں کے حالات سے اُن کی ضرورت سے اور زمانے کی تبدیلی سے اچھا! [ہم] مان گئے کہ خدا کے احکام میں تبدیلی آتی ہے، رسولؐ کے احکام میں تبدیلی آتی ہے اور اُس کی وجہ زمانے سے ہے یعنی زمانے کی ضرورت کی بنا پر اچھا مان گئے اگر اِن چودہ سو سالوں میں رسول اللہؐ حیات ہوتے زندہ ہوتے تو یہ لازمی بات ہے کہ قرآن آنحضرتؐ پر نازل ہوتا رہتا اور جب قرآن نازل ہوتا رہتا تو تیئس سال کے اندر جو ترمیمات ہوتی رہی ہیں اُس سے کہیں زیادہ خدا کے احکامات میں ترمیمات ہوتیں اور رسولؐ کی احادیث میں بھی. بہت سی تبدیلیاں رونما ہو جاتیں کیا یہ منطق غلط ہے؟ کیا یہ منطق غلط ہے؟ عقل سے بعید ہے؟ یا یہ بالکل منطق صحیح منطق ہے یا عقل کے موافق ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو بات کہی وہ صحیح ہے اور درست ہے کوئی بھی دانشمند اِس کو رد نہیں کرسکتا ہے۔ اِن تمام باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا جو فائدہ ہے وہ اُن لوگوں کے لئے ہے جن کے پاس قرآن کا نور ہے جن کے پاس قرآن کا معلّم ہے تو پھر وہ لوگ کون ہیں؟ اسماعیلی۔ جب اسماعیلیوں کے لئے ممکن ہے کہ قرآن کی حکمتیں اور تاویلات وہی لوگ سمجھیں تو اُن کو چاہئے کہ قرآن سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں۔

میرے خیال میں، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ ٹائم کا تعین کیا ہے، بہر حال مجھے یہاں پر رُکنا چاہئے اور آپ سے پوچھنا چاہئے کہ اگر درمیان میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی ہو زبان کی وجہ سے یا کسی طرح سے تو وہ سوال مناسب طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ مہربانی اور باقی جو سلسلہ ہے اِن شاءاللہ اِس ہفتے میں چھ دن تک شاید جاری رہے گا اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کی جس طرح فرمائش ہوگی اُس کے مطابق۔ مہربانی، اگر کوئی سوال ہو تو کیا جا سکتا ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: قرآن اور رُوحانیت-اولوالامر

کیسٹ نمبر: Q-2A   تاریخ: ۲۲/دسمبر/۱۹۷۷، کینیڈا

محترم چیئرمین صاحب اور عزیز حضرات سب سے پہلے مجھے اُس خوشی کا اظہار کرنا چاہیئے جو مجھے آج اِس وقت آپ کی اِس صحبت میں آ کر اور آپ سے مل کر محسوس ہو رہی ہے، اور بے شک اسماعیلی مذہب خوشیوں اور مسرّتوں کا سرچشمہ ہے، اِس لئے کہ اِس میں حاضر امام موجود ہیں، اور کیوں نہ ہو یہ تو اسلام کی حقیقت ہے، اور خدا کا دین ہے۔ اِس لئے ہماری خوشی دُرست اور بجا ہے، صحیح ہے، مجھے آپ کے لئے شکر گزار ہونا چاہیئے، کینیڈا کی نیک نام جماعت اور اِس کے عملداروں کے لئے، اِس کے اداروں کے لئے اور خصوصاً یہاں کی اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کے لئے مجھے شکر گزار ہونا چاہیئے کہ آپ نے اور آپ کے اداروں نے مجھے یہاں آنے کے لئے موقع عنایت کیا جس سے کہ میں آپ سے مل سکا، اور میرے دل کے اندر جو مقدّس دین کا جذبہ تھا یا جو چند باتیں میں اپنے سینے میں رکھتا تھا اُن کے اظہار کے لئے مجھے بڑا اچھا موقع مل رہا ہے، اِس کے لئے میں شکر گزار ہوں۔

سامعین! بات یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں، کہ آپ کے پیچھے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اسماعیلی ہیں، میں اِس مجلس کو بہت بڑی اہمیت دیتا ہوں، اِس لئے کہ یہ واعظین کی مجلس ہے اور لیڈروں کی مجلس ہے جن سے خطاب کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرّت و شادمانی کا احساس ہوتا ہے، اور میں اپنے خداوند کا بہت بہت شکر گزار ہوں قلبی طور پر شکر گزار ہوں اور آپ کا احسان مند ہوں۔ تو صاحبان! جیسے ہمارے چیئرمین صاحب نے اعلان فرمایا اور انہوں نے مجھے موقع عنایت کیا کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں، بہتر سمجھتا ہوں کہ میں آپ کو قرآن اور رُوحانیت، دونوں مضامین کے بارے میں چند بنیادی اور اہم باتیں عرض کروں۔ میں اِن دونوں مضمون کو ایک ساتھ اِس لئے لینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں مضامین ایک دُوسرے کے ساتھ ہیں اور مل کر ہیں بلکہ حقیقت میں یہ ایک ہی مضمون ہے، اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اِس سلسلے میں کچھ باتیں عرض کروں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں اور پھر اسلام کی مختلف شاخوں میں سے ایک شاخ سے تعلّق رکھتے ہیں جو اسماعیلی شاخ ہے اسلام کی، اِس لئے ہمیں فخر ہے اور خوشی ہے کہ ہم معلّمِ قرآن کے وسیلے سے قرآن کے باطن، اُس

کی رُوحانیت اور نورانیت کے بہت ہی قریب ہیں، اور چونکہ قرآن کی رُوحانیت امام کی ذات سے وابستہ ہے اور امام کی نورانی ہدایت کی روشنی میں قرآن کی رُوحانیت واضح ہو جاتی ہے، اِس لئے ہمیں زیادہ سے زیادہ فائدہ لینے کا حق ہے، ہمارے لئے بہت ممکن ہے کہ ہم قرآن کے بھیدوں کو حاصل کریں۔ اگر حقیقت یہ ہے کہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو قرآن کی حقیقتوں کو پا سکتے ہیں، قرآن کی رُوح تک رسائی کر سکتے ہیں، اور رُوحانیت کے راستے سے قرآن کے باطن میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں بلکہ صحیح معنوں میں قرآن کے باطن کی دُنیا کا اور اُس دُنیا کی ہر چیز کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، تو پھر ہمیں چاہئے کہ بڑے شوق سے اِس میدان میں آگے بڑھیں اور قرآن کے بھیدوں کو حاصل کریں، قرآن کے علم وحکمت کو اپنائیں اور اُس کی اشاعت کریں اپنی جماعت میں سب سے پہلے، تاکہ جماعتوں کو یقینِ کامل حاصل ہو جائے کہ اُن کو جو مقدّس دین ملا ہے، اور جو امام اُن کو ملا ہے وہ حق اور صحیح ہے۔

اِس کے علاوہ قرآن کے سمجھنے کا دُوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جہاں کہیں سوال کیا جاتا ہے دین کے کسی معاملے کے بارے میں، دین کی کسی چیز کے بارے میں تو اُس وقت صحیح طور سے جواب مہیّا کیا جا سکے، تو کتنی کامیابی ہے اِس میں کہ قرآن سے ہم جواب دے سکتے ہیں یا جواب دینے کے قابل ہو سکتے ہیں اور اپنی جماعت کو قرآن کی دولت سے مالامال کر سکتے ہیں، یہ سب کچھ اِس لئے ہے کہ معلمِ قرآن یعنی قرآن کا ٹیچر جو خدا کی طرف سے مقرّر رہے ہمارے پاس یعنی اسماعیلی مذہب میں ہے، تو پھر ہمیں زیادہ سے زیادہ قرآن کی طرف توجہ دینی چاہئے، اور اِس لئے بھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس کے متعلّق رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا اپنے آخری وقت میں کہ: ''اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقْلَيْنِ كِتَابُ اللهِ وَ عِتْرَتِيْ اَهْلِ بَيْتِيْ، میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ جانے والا ہوں، جن میں سے ایک تو آسمانی کتاب ہے یعنی خدا کی کتاب، اور دُوسری چیز میری آل ہے مُراد امام''۔ تو دُوسرے لوگوں نے جہاں قرآن کی طرف خصوصیت سے توجّہ دی اور امام کی پیروی نہیں کی، امام کو نظر انداز کیا، امام کو چھوڑا اور جس کے بارے میں ہم اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے کتاب کو لیا اور قرآن کو چھوڑا، تو ہمارا یہ اعتراض صحیح ہے اور جب ہمارا یہ اعتراض صحیح ہے تو وہ بھی اگر کہیں کہ تم بھی تو ایک ہی چیز کو لے رہے ہو، اور دُوسری چیز کو چھوڑ رہے ہو، تو کیا اُن کا یہ اعتراض دُرست نہیں ہوگا؟ ضرور درست ہوگا۔ ہمیں قرآن کو کیوں چھوڑنا چاہئے، یہ کوئی بات ہی نہیں ہے کہ ہم قرآن کو چھوڑیں جبکہ قرآن اللہ تعالیٰ کی وہ آخری کتاب ہے جس کے بغیر اسلام [کچھ] نہیں، خدا اور رسولؐ نے یہی کتاب لوگوں کے سامنے پیش کی، اور اِس کے ساتھ ساتھ خدا اور رسولؐ نے صرف اشارہ نہیں بلکہ واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ اِس کے ساتھ ساتھ امام بھی ہے اور مختلف آیتوں میں یہی معنی آئے ہیں۔ جیسے خدا نے فرمایا کہ: ''قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُّبِين (۵:۱۵)۔ یقیناً تمہارے پاس نور آچکا ہے اور ظاہری کتاب بھی آئی ہے''۔ اِس مقام پر جبکہ نور کا الگ ذکر اور قرآن کا الگ ذکر ہوتا ہے، تو [اب] سوال باقی نہیں رہتا ہے کہ نور پیغمبر اور امام

کے سوا اور کوئی چیز ہو جبکہ وہاں پر کتاب کا بھی ذکر [آیا] ہے۔ اگر اُس ایک آیت کے اندر کتاب کا ذکر نہ ہوتا تو کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اِس نور سے قرآن مُراد ہے لیکن اِس میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ کوئی اُس نور کے کچھ اور معنی بتائے، ہمیں سب سے پہلے نور سے پیغمبر مُراد لینا چاہیئے۔

چونکہ آپ لیڈر ہیں، جماعت کے، قوم کے اور علماء ہیں، واعظین ہیں لہٰذا بعض باتوں میں، میں آپ کو بہت تاکیدی مشورہ دینا چاہوں گا تاکہ آپ خیال فرمائیں اور جن باتوں میں، میں زیادہ سے زیادہ تاکیدی مشورہ دینا چاہتا ہوں، اُن میں سے ایک بات اور سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر مقام پر پیغمبر کو اہمیت دینا ہے۔ یہ اُصول کی بات ہے، اُس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے میں آپ کو بتاؤں گا، یہ بنیادی باتوں میں سے ہے، اور ہے بھی اسلام میں، اسماعیلی مذہب میں یہی اُصول ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں پیغمبر کی تعریف آئی ہے تو اُس میں (Indirectly) امامِ عالی مقام کی بھی تعریف آئی ہے، کیونکہ اگر اسلام میں، دین میں پیغمبر کی اہمیت ہے، ضرورت ہے اور خداوندِ عالم نے آنحضرتؐ کی کسی موقع پر تعریف فرمائی ہے اُس کا مقصد ہدایت ہے تعلیم ہے، اور لوگوں کو خدا کی طرف سے آگاہ کرنا ہے، راہِ راست بتلانا ہے، جب مقصد یہ ہے اور اِس مقصد کی بنا پر خدا آنحضرتؐ کی تعریف فرماتا ہے تو جاننا چاہیئے کہ اُس میں امام کا ذکر بھی ہے، کیونکہ یہی مقصد اور یہی اہمیت امام کی بھی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں پیغمبر کی تعریف ہو یا کوئی تاویل ہو تو اُس میں سب سے پہلے پیغمبر کا ذکر آئے گا، کسی کو اگر ہم سمجھانا چاہتے ہیں یا کوئی دلیل پیش کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہم اُس دلیل کی روشنی میں منوائیں گے کہ پیغمبر برحق ہے، اور خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے رسول جو آیا ہے اُس کا یہ ثبوت ہے، اُس کی یہ صفت ہے اور اُس کی یہ تعریف ہے اور اُس کی یہ ضرورت ہے۔ جب لوگ اِس بات کے لئے قائل ہو جائیں گے کہ بے شک پیغمبر کی یہ صفت ہے اِس لئے کہ آنحضرتؐ بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے دُنیا میں آئے ہیں۔ اب جب وہ اِس بات کے لئے قائل ہو جائیں گے تو دُوسرے مرحلے پر، دُوسرے (Stage) پر آپ امام کے بارے میں دلیل پیش کر سکتے ہیں، رسول سے مثال دے کر، پیغمبر سے مثال دے کر، حضورؐ کے جانشین یعنی امامِ برحق کی مرتبت اور اہمیت کو آپ سمجھا سکتے ہیں، تو یہ بات کہاں سے پیدا ہوگئی، یہ بات اِس آیت سے پیدا ہوئی کہ خدا نے جو فرمایا: قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُّبِين، (۵:۱۵) شیعی تفاسیر کے مطابق اِس آیت کے یہ معنی ہیں، اِس آیت کی مُراد یہ ہے کہ اپنے وقت میں سب سے پہلے رسول اللہؐ خدا کے نور تھے، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ والہ وسلّم قرآن کے معلّم تھے، اور اپنے وقت میں تاویل کے بتلانے والے تھے، لہٰذا ہمیں چاہیئے جو کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سے ایک تو نور آیا ہے، اور دُوسری کتاب آئی ہے اور سب سے پہلے نور [آیا ہے]، نبوّت کے زمانے میں نور آنحضرتؐ تھے، اِس طرح تفسیر کرنی ہوگی اور یہ بات بالکل صحیح ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم پیغمبر کو چھوڑیں، پیغمبر کو چھوڑیں اور ایکدم سے امام کی بات کریں تو وہ لوگ نہ تو سمجھیں گے اور نہ

سمجھنے کے لئے کوشش کریں گے، وہ تو بحث ہی نہیں کریں گے، کیونکہ ہم میں اور اُن میں اُس وقت ہی بات چیت ہو سکتی ہے کہ ہم سب سے پہلے خدا کو مانیں اور رسولؐ کو مانیں اور خدا و رسولؐ کے ارشادات کی روشنی میں ہم امام کی امامت کو پیش کریں، سمجھائیں۔

اسی مقام پر دُوسری ایک اہم بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ آپ کو محسوس ہونا چاہئے کہ ہم میں ایک کمزوری آگئی ہے، مجھے کہنے کی اجازت ہو، اگر میں آپ کو صحیح مشورہ نہیں دے سکتا ہوں اور خواہ مخواہ خوش آمدی کرتا ہوں تو یہ نصیحت نہیں ہے کیونکہ نصیحت خیر خواہی کو کہتے ہیں۔ [یہ] ایک عربی لفظ ہے، نصیحت معنی خیر خواہی، اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ، رسول اللہؐ نے فرمایا: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ، دین خیر خواہی کا نام ہے، تو پوچھا گیا یہ خیر خواہی کس کے لئے ہونی چاہئے، ارشاد ہوا کہ سب سے پہلے خیر خواہی خدا کے لئے اور اُس کے رسول کے لئے اور اماموں کے لئے [ہونی چاہیے]۔ دین خیر خواہی پر مبنی ہے، دین خود خیر خواہی ہے، لہٰذا مجھے وہ ساری باتیں بتانی چاہئیں جو ہماری کمزوری سے متعلّق ہیں تا کہ آپ پر قرآن کی تعلیم کی اہمیت ظاہر ہو جائے، میں تھوڑا سا اشارہ کروں گا زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا اور وہ یہ کہ اب اِس وقت دنیائے اسماعیلیت میں قرآن کے معاملے میں سُستی آگئی ہے، جماعتوں نے اِس [کے] بارے میں غلط سمجھا ہے۔ جب امام نے قرآن کی تاویل کی طرف توجّہ دی اور قرآن کے ظاہر کی اہمیت کم ہوگئی تو انہوں نے سمجھا کہ اب قرآن ہم کو نہیں چاہئے۔ یہ بات نہیں ہے، جس وقت قرآن کے ظاہر پر عمل ہوتا تھا اُس وقت بھی قرآن کی ضرورت تھی، اور جب حقیقت کے زمانے میں قرآن کے باطن کی طرف توجّہ دی جارہی ہے اُس وقت بھی قرآن کی اہمیت ہونی چاہئے۔ چونکہ قرآن کے دو پہلو ہیں، ظاہر اور باطن، ظاہر اور باطن، ہم قرآن سے دستبردار نہیں ہیں، یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم قرآن سے دستبردار ہیں، کوئی ایسا نہ سمجھے اور ہاں اِس مقام پر ایک اور بات ہے جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، کبھی کبھار ایسا بھی اشارہ امام کی طرف سے ہوا ہے کہ وہ لوگ، وہ اسماعیلی جو امام کو چھوڑ کر قرآن کی طرف توجّہ دینا چاہتے ہیں، اُن کو نصیحت کی گئی ہے اور میں نے ایسے اشارے بھی دیکھے ہیں، یہ بات ایسی ہے جیسے کوئی آدمی بیمار ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر اور حکیم کھانے میں سے کوئی چیز کی ممانیت کرسکتا ہے، حلوہ ہو یا پلاؤ یا اور کوئی عمدہ چیز، حالانکہ تندرستی میں وہ چیز بہت ہی مفید رہتی ہے اُس سے صحت بنتی ہے، لیکن ڈاکٹر، حکیم اُس کی ممانیت کرتا ہے، تو جو اسماعیلی امام کو چھوڑ کر قرآن کی طرف توجّہ دینا چاہتا ہے تو اُس کے لئے امام کچھ کہہ سکتا ہے۔ امام یہ حق رکھتا ہے کہ اُس کو امام کی [اہمیت کی] طرف توجّہ دلائے کیونکہ نور ہو تو قرآن ہے، نور کو [قرآن سے] الگ کریں تو قرآن تاریکی میں ہے۔ آپ ماشاءاللہ منطق جانتے ہیں، فلسفہ جانتے ہیں اور وہ یہ کہ خدا نے جہاں فرمایا کہ میں نے نور کو بھی بھیجا ہے اور کتاب کو بھی بھیجا ہے، تو اِس کا کیا مطلب؟ اِس کا مطلب سوائے اِس کے کچھ بھی نہیں کہ خداوند یہ سمجھانا چاہتا ہے، یہ اشارہ فرماتا ہے بلکہ واضح طور پر اُن کو ہدایت دیتا ہے کہ صرف قرآن نہیں ہے بلکہ اُس کے ساتھ

نور بھی ہے اور جب قرآن کے ساتھ نور بھی ہے تو ہم سمجھ گئے کہ نور کے بغیر قرآن تاریکی میں ہے، نور کے بغیر قرآن تاریکی میں ہے۔ کوئی چیز جب سورج نہ ہو، روشنی نہ ہو، دکھائی نہیں دیتی ہے، راستہ دکھائی نہیں دیتا ہے، کائنات پوری تاریک ہو جاتی ہے جب سورج ڈوب جاتا ہے، جب روشنی نہیں ہوتی ہے، تو اِس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن ایک دُنیا ہے، قرآن ایک کائنات ہے، اور اُس کائنات میں ایک سورج بھی ہے اور سورج وہی ہے جس کا ذکر اِس آیت کے اندر ہے، جس کو خدا نے نور کہا، نور سے مُراد سورج، تو دُنیائے قرآن کا سورج امام ہے اور اگر ایک شخص اِس نور کو قرآن سے الگ کر دیتا ہے تو دُنیائے قرآن بالکل شبِ تاریک بن جاتی ہے، اندھیرا ہو جاتا ہے، اور اندھیرے میں کوئی شخص چل نہیں سکتا ہے، چیز نہیں دیکھ سکتا ہے، کچھ بھی نہیں کر سکتا ہے، نہ کام کر سکتا ہے، نہ چل سکتا ہے، نہ کسی چیز میں فرق کر سکتا ہے، اور اُس کی مثال آج ہمارے سامنے ہے، وہ یہ کہ دُنیائے اسلام میں سے اُن لوگوں نے قرآن سے کچھ نہیں پایا جبکہ انہوں نے امام سے انکار کیا، انہوں نے تاریکی میں راستہ چلنے کی کوشش کی، انہوں نے تاریکی میں، اندھیرے میں کچھ کام کرنے کے لئے کوشش کی لیکن تاریکی میں کس طرح ہو سکتا تھا۔

اگر قرآن کے لئے کسی سورج کی ضرورت نہ ہوتی، نور کی ضرورت نہ ہوتی تو خداوندِ عالم یہ اہتمام نہ فرماتا اور یہ نہ فرماتا کہ میں نے آسمانی کتاب کے ساتھ ساتھ نور کو بھی نازل کیا ہے، تو نتیجہ اِس کا یہ ہوا کہ آج اسلام کے اندر اختلافات ہیں، آپ دیکھتے ہیں مسلمان کے مختلف فرقوں میں اتنا تفاوت ہے، اِس قدر بُعد یعنی دُوری پیدا ہو گئی ہے جتنی کہ یہود اور مسلمان یا دُوسرے مذاہب کے اندر دُوری پیدا ہو گئی ہے وہ ایک دُوسرے سے نفرت کرتے ہیں، اور ضرورت آنے پر بھی اُن کے اندر اتحاد مشکل ہو گیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن سے جس طرح فائدہ اُٹھانا چاہئے وہ نہیں اُٹھایا جا رہا ہے، اِس کی وجہ کیا ہے؟ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کو جس روشنی میں پڑھنا چاہئے اُس روشنی میں نہیں پڑھا جاتا ہے، لہٰذا قرآن کی حکمتیں، قرآن کی ہدایتیں، قرآن کا علم، قرآن کا باطن اور قرآن کے سارے بھید تک وہ اُن سے یعنی دُور ہیں، اُن تک اُن کی رسائی نہیں ہو رہی ہے۔ قرآن کے سارے بھید، قرآن کے اسرار جو ہیں اُن تک اُن لوگوں کی کوئی رسائی نہیں ہو رہی ہے، تو بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ ہر مقام پر سب سے پہلے جہاں مناسب ہو، جہاں ضرورت ہو، جہاں واقعیت ہو پیغمبر کی مثال دی جائے، اور اُس کے بعد امام کا ذکر کیا جائے، تو اِس قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُّبِين (۵:۱۵) میں یہ ہونا چاہئے۔

اِس کے بعد چند الفاظ ہیں اُن کی طرف توجّہ دی جائے، مثلاً امام کن معنوں میں امام ہے؟ امام کے معنی کیا ہیں؟ خلیفۂ رسولؐ کے کیا معنی ہیں؟ رسولؐ کے جانشین کے کیا معنی ہیں؟ ہادی کے کیا معنی ہیں؟ یہ الفاظ ایسے ہیں کہ اِن کی وضاحت بہت ہی ضروری ہے، اور اولوالامر کا کیا مطلب ہے؟ یہ بنیادی الفاظ ہیں، اِن کا پورا پورا فلسفہ سمجھنا ضروری

ہے، کیونکہ قرآن کا اُصول کچھ اِس طرح سے ہے کہ قرآن کے اندر کچھ مخصوص آیتیں ہیں، جو کہ وہ آیتیں (Lighthouses) کا کام دیتی ہیں۔ روشنی کے مینار پر جب آدمی چڑھتا ہے تو شہر کے ایک حصّے کو دیکھتا ہے، اگر شہر کے اندر (City) کے اندر دس بارہ روشنی کے مینار ہیں تو دن ہو یا رات آدمی اُن میناروں پر چڑھ کر جھانک سکتا ہے، شہر کا جائزہ لے سکتا ہے، ایک مختصر خاکہ بنا سکتا ہے اُس شہر کا اور سروے کر سکتا ہے، تفصیل سے گلی، کُوچے میں پھرنے کے لئے اگر وقت نہیں ہے تو روشنی کے میناروں پر چڑھا جائے اور وہاں سے جھانکا جائے، اور مولانا علیؑ نے بھی اِس حکمت کی طرف اشارہ کیا تھا، مولانا علی نے جس قول میں ارشاد کیا ہے وہ پورا قول شاید آگے چل کر آوے تو میں اُس میں سے ایک ٹکڑے کو استعمال کروں گا، کہ امر خدا کے لئے نہیں ہے، خدا کی اپنی ذات سے اِس کا کوئی تعلّق نہیں ہے، امر پیغمبر کے لئے نہیں ہے، یہ امر لوگوں کے لئے چاہیے۔ اچھا! تو لوگوں سے قریب کون ہے؟ اِن مقدّس ہستیوں کو اگر الگ الگ مان لیا جائے تو، کون سی ہستی زیادہ سے زیادہ لوگوں سے قریب ہے؟ امام! تو پھر امام ہی کو سارا امر کیوں نہ سونپا جائے؟ کہ وہ خدا کی طرف سے امر کا مالک قرار پائے، کتنی شاندار وضاحت ہے، کتنی اعلیٰ حقیقت ہے۔ یہاں پر آپ میں سے تین ہیں، تو کوئی آفیسر آپ میں سے کسی ایک کو کوئی ٹائٹل دیتا ہے کہتا ہے کہ فلاں صاحب یہ کام کرنے والا ہے، تو دُوسرے دو اِس سے تقریباً مستثنیٰ ہوتے ہیں، اور یہ جو ذمّہ داری جس صاحب کو سونپی جاتی ہے وہی اُس کا ذمّہ دار ہوتا ہے، مصلحت کچھ بھی ہو، مطلب کچھ بھی ہو، کام کچھ بھی ہو، تو جہاں خدا کا ذکر ہے، رسولؐ کا ذکر ہے، اُن دو مقدّس ہستیوں کو چھوڑ کر امام کو صاحبِ امر قرار دیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اِس کی وجہ ہے۔ وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ امر لوگوں کے لئے چاہئے، امر ہدایت کا دُوسرا نام ہے، امر فرمان کا دُوسرا نام ہے، تو رسول اللہؐ صرف ۲۳ برس کے لئے تھے، ۲۳ برس کے لئے، خدا ہمیشہ کے لئے ہے لیکن لوگوں کی رسائی سے بالا و برتر ہے، میں شریعت کی زبان میں بات کرتا ہوں، میں کوئی ابھی حقیقت کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن اسی کے اندر حقیقت ہے، یہ ہے شریعت لیکن جس طرح ہونا یہ چاہئے کہ شریعت پہنچے طریقت تک، طریقت پہنچے حقیقت تک، حقیقت جائے معرفت تک، تو یہ ایسی بات ہے۔

چونکہ اگر کوئی درخت ہے تو اُس کی جڑیں ہیں، جڑوں سے اور تنے سے گزر کر شاخیں بنتی ہیں اور پھل سب سے اُوپر پیدا ہوتا ہے، تو میں جو بات کرتا ہوں وہ شریعت کی زبان میں بات کرتا ہوں لیکن اِس کے اندر سے حقیقت کو ظاہر کرتا ہوں، وہ یہ کہ اولی الامر کا مطلب یہ ہے کہ امام صاحبِ امر ہے اور اِس لئے کہ خدا و رسولؐ نے اُس کو امر کا، حکم کا مالک قرار دیا ہے، امر امام کے پاس ہے، اُس کی وجہ بھی میں نے آپ سے عرض کی، وجہ یہ ہے کہ خدا تک وہ رسا نہیں ہو سکتے ہیں کہ وہاں سے امر کو حاصل کریں، [خدا تک] رسائی نہیں ہوتی ہے، رسولؐ تک سب لوگوں کو رسائی حاصل نہیں ہوتی ہے، اِس لئے رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی خود اولو الامر تھے۔ اِس معنی میں علیؑ نبی کے وزیر تھے، جو لوگ بادشاہ تک نہیں پہنچ سکتے

ہیں وہ وزیر تک پہنچ سکتے ہیں، اِس معنی میں علیؑ بابِ نبی تھے، پیغمبر کے علم کے شہر کے گیٹ تھے، اور پیغمبر کے حکمت کے گھر کا دروازہ تھے، تو اولوالامر خدا اور رسول کی طرف سے تھے، یہاں کچھ تضاد نہیں ہے یا خدا و رسول کے برعکس کوئی بات نہیں ہے، خدا اور رسول ہی نے امام کو امر کا مالک قرار دیا، اب اِس میں دو (Points) اور ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ آپ ماشاءاللہ خوب سمجھتے ہیں کہ امر کے مالک ہونے سے کیا مُراد ہے، امر کے مالک ہونے سے یہ مُراد ہے کہ یہ اختیار بھی تو اُسی کا ہے جو امر کا مالک ہے، یہاں پر اختیار کا فلسفہ ہے امام صاحبِ اختیار ہے اِس معنی میں وہ صاحبِ امر، خدا اور رسول نے امام کو دین کے معاملے میں اختیار دیا ہے اِس معنی میں وہ صاحبِ امر ہیں۔ اگر اختیار نہ ہوتا اور وہ حکم خدا سے آیا ہوا ہوتا اور امام صرف اُس کو (Pass) کرتا، آگے کرتا تو اِس معنی میں وہ صاحبِ امر نہ ہوتا، صاحبِ امر تو خدا ہے اُس نے تو (Pass) کیا رسولؐ کو پھر امام کو اِس معنی میں [وہ اولوالامر ہے]۔ چونکہ ہر زمانے میں تفصیلی حکم، خدا سے نہیں آتا ہے، پیغمبر کے زمانے میں کوئی تفصیلی حکم نہیں آتا تھا، روزہ کے بارے میں، نماز کے بارے میں، حجّ کے بارے میں تفصیلات نہیں ہیں قرآن میں۔ تفصیل پیغمبر کرتے تھے لیکن آخری تفصیل امام کرتے ہیں جتنی تفصیل امام کرتے ہیں اُتنی تفصیل پیغمبر نہیں کرتے ہیں، کیونکہ امام پیغمبر کے جانشین کی حیثیت سے شریعت کے دَور میں شرعی ہدایت بھی کرتے ہیں اور حقیقت کے دَور میں قرآن کے باطن میں سے حقیقی تشریح بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ تشریح امام کرتے ہیں، اِس لئے امام صاحبِ امر ہیں، امر کے مالک ہیں اور ابھی آپ کو واضح ہوا کہ یعنی یہ جو آیۂ اطاعت ہے یہ کرائم القرآن میں سے کیوں ہے؟ جن آیتوں کے بارے میں مولانا علیؑ نے فرمایا تھا کہ: ''وَ لنَا کرائمُ القرآن، قرآن کی عظیم آیتیں ہماری شان میں ہیں''۔ جن کی مثال میں نے روشنی کے مینار سے دی تھی، اور میں نے کہا تھا کہ روشنی کے مینار پر چڑھنے سے شہر سامنے ہوتا ہے، تو اِن آیتوں کو سمجھنے سے بالکل اسی طرح ہوتا ہے کہ قرآن کے دُوسرے مطالب اور دُوسری حقیقتیں سامنے ہوتی ہیں، اِس معنی میں یہ عظیم ہیں اور اِس معنی میں یہ مثال کے طور پر قرآن کی دُنیا کی روشنی کے مینار کی حیثیت سے ہیں۔

ایک اور چیز یہاں یہ رہ گئی ہے جو ابھی میں نے کہا تھا کہ اِس میں دو (Points) ہیں، اُن میں سے ایک (Point) یہ ہے کہ اگر امام صاحبِ امر ہیں تو میں یہ دعویٰ کروں گا کہ وہ کُن فیکون کے بھی مالک ہیں۔ کُن فیکون ایک اصطلاح ہے جو کسی چیز کو وجود دینے کے لئے فرمایا جاتا ہے خدا کی طرف سے اور کُن ''ہوجا'' وہ لفظ ہے، وہ کلمہ ہے جو ازل میں خداوند نے فرمایا اور جس کے نتیجے پر یہ کائنات وجود میں آئی، یہ سب کچھ بنا۔ جب امام صاحبِ امر ہیں، اور امر میں سے کُن بھی ہے، کُن بھی ایک امر ہے تو ہم سمجھ گئے کہ امام صاحبِ کُن بھی ہیں۔ اسماعیلی بزرگوں کی کتابوں کو جب آپ لیں گے تو امام کو وہ ''کاف ونون'' کے مالک قرار دیتے ہیں، ''کاف اور نون'' کے مالک یہ عربی کے دو حرف ہیں کاف اور نون جس

سے ایک لفظ بنتا ہے ''کُن'' تو امام کُن کے بھی مالک ہیں ۔ اِس کے علاوہ اسی لفظی معنی میں یہ بتاتے جائیں گے کہ دو (۲) عالم ہیں ، ایک عالمِ خلقی ہے اور ایک عالمِ امری ہے ، اِن دونوں کے درمیان کیا فرق ہے وہ بھی میں آپ کو بتاؤں گا ایک عالمِ خلقی ہے ، ایک عالمِ امری ہے ۔ عالمِ خلقی یہ دُنیا جس میں تخلیق ہوتی ہے اور عالمِ امری وہ عالم جس میں تخلیق نہیں ہے ، وہ چیز خدا کے تصوّر کی طرح ہمیشہ سے وہ عالم ہے ، اُس کی چیزیں بھی دائمی ہیں وہ رُوح کی دُنیا ہے وہ رُوح کا عالم ہے ، تو جو خداوند نے فرمایا کہ : وَاُوْلِی الاَمْرِ مِنکُمْ (۵۹:۴) ۔ تو اِس لفظ میں یہ مطلب بھی آ گیا کہ امام عالمِ امر کے بھی مالک ہیں اِس لئے کہ تخلیق ہو یا عالمِ امر ہو وہ امام کے حکم کے تحت ہے ۔ میں اِس آیت کی عظمت ، اِس کی بلندی اور اِس کی حکمت بیان کرتا ہوں ، اِس حقیقت کے ثبوت میں جو مولانا علیؑ نے فرمایا تھا کہ : قرآن کی عظیم آیتیں ہماری شان میں ہیں ، [یقیناً] قرآن کی عظیم آیتیں امام کی شان میں ہیں اور وہ روشنی کے مینار کی طرح ہیں تو صحیح بات ہے کہ امام قرآن کا نور ہے ، اور وہ قرآن پر اِس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ اگر چند آیتوں کو بھی سمجھ لیا جائے کہ جو قرآن کی عظیم آیتوں میں سے ہیں تو بس قرآن کا سارا مطلب مختصراً سمجھ میں آتا ہے ، اور اسی طرح امام کی روشنی میں قرآن پڑھا جاتا ہے ۔ یہی نہیں امام کے نور کی روشنی میں قرآن کے پڑھنے کے اور بھی معنی ہیں میں آگے چل کر آپ کو بتاؤں گا ، میں اب اِس وقت صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر کسی حقیقی مومن کو یہ مشکل نظر آئے کہ قرآن ایک عظیم سمندر ہے اُس کی تعلیم ، اُس کی حکمتیں ، اُس کی وضاحتیں کس طرح کی جا سکتی ہیں اور اُس پر کس طرح عبور حاصل ہو سکتا ہے اگر کوئی مومن ایسا سوچتا ہے تو ایک لحاظ سے صحیح بھی ہے لیکن دُوسرے لحاظ سے یہ دُرست نہیں ، کیونکہ امام کے نور کی روشنی میں مختصر سے مختصر وقت میں بھی قرآن کے مطلب کو سمجھ لیا جا سکتا ہے ، اور جیسا کہ میں نے کہا کہ ایک خاکہ اُن آیتوں کا بنائیں آپ جو امام کی شان میں ہیں اُن چند آیتوں میں سے خاکہ بنائیں تو وہ خاکہ یعنی قرآن کو (Cover) کرے گا ، وہ قرآن کو (Cover) کرے گا ۔ کسی بھی اسکیم کسی بھی (Project) کا خاکہ ہوتا ہے تو وہ خاکہ یعنی اُس منصوبے کو ، اسکیم کو (Cover) کرتا ہے ، اور سمجھ میں آتا ہے کہ اگر مکان بنانا ہے تو خاکہ ، نقشہ بنایا جاتا ہے ، جس سے سمجھ میں آتا ہے کہ گھر کس طرح ہے ۔

اب اِس بڑے ملک میں میں نے دیکھا ، اور کسی طرح سے ممکن نہیں ہے کہ کہیں جائیں اور کسی مکان کو پائیں تو خاکہ بنایا جاتا ہے ، اور تجربہ کار لوگ اُس خاکے کی مدد سے جہاں جانا چاہیے جاتے ہیں ۔ اسی طرح ہم قرآن کا بھی ایک خاکہ بنا سکتے ہیں اُن عظیم آیتوں کو سمجھیں اور اُن کی روشنی میں جو امام کی روشنی ہے قرآن کو سمجھیں اور مطلب کو پائیں ، تو آیۂ اطاعت کی میں بات کرتا ہوں اور مجھے شاید دُوسری دفعہ ایسی مجلس [میسّر] نہ ہو ۔ وَاُوْلِی الاَمْرِ مِنکُمْ (۵۹:۴) میں ''مِنْکُمْ'' کا بھی ذرا مطلب بتا کے جانا چاہئے ، ''مِنْکُمْ'' میں بہت عظیم مطلب ہے ، آپ نے شاید خیال نہیں فرمایا ہوگا جو میں آپ کو بتاؤں گا تو آپ بہت خوش ہو جائیں گے ''مِنْکُمْ'' میں ، یہ ''مِنْکُمْ'' بھی خدا کے لئے نہیں کہا گیا ، پیغمبر کے لئے بھی نہیں کہا حالانکہ

پیغمبر بھی ''مِنۡکُمۡ'' ''تم میں سے'' تھا، ''تم میں سے'' اِس لفظ میں پیغمبر بھی آسکتا تھا۔ پیغمبر کوئی اجنبی تو نہیں تھا! مسلمانوں میں سے تھا اور اُن لوگوں کے درمیان تھا جن کے زمانے میں قرآن نازل ہوا، لیکن اِس کے باوجود خدا نے ''مِنۡکُمۡ'' کے لفظ کو امام کے لئے کیوں مخصوص کیا؟ اِس کی بھی کوئی حکمت ہونی چاہیئے وہ یہ کہ ''مِنۡکُمۡ'' امام کے مقابلے میں ''مِنۡکُمۡ'' کا لفظ ''مِنۡکُمۡ'' کی صفت پیغمبر پر نہیں آسکتی، اِس لئے کہ امام تو ہمیشہ ہمارے درمیان ہیں اور پیغمبر اپنی نبوّت کے ۲۳ سال میں مسلمانوں کے درمیان تھے، لہٰذا اِس مقابلے میں جس طرح امر کی صفت خدا اور رسول نے امام کو دی، اسی طرح ''مِنۡکُمۡ'' کی صفت بھی خدا اور رسول نے امام کو دی۔

ایک اور یعنی اِس میں باریکی ہے آپ خوش ہو جائیں گے، ''مِنۡکُمۡ'' آیت کا تعلّق زمانے میں جو لوگ زندہ ہیں اُن سے ہے، جو گزر چکے ہیں اُن کا یعنی حکم ختم ہو چکا ہے جو زندہ ہیں اُن سے زیادہ ہے یعنی قرآن کا (Point) اور قرآن کا اشارہ اور قرآن کے اِس حکم کے (Target) وہ لوگ ہیں جو دُنیا میں موجود ہیں۔ تو قرآن فرماتا ہے اُن لوگوں سے جو دُنیا میں زندہ ہیں اور موجود ہیں اُن سے فرماتا ہے کہ ''مِنۡکُمۡ'' تم اُس امام کی اطاعت کرو جو تمہارے زمانے میں ہے، اگر اگلے اماموں کے فرامین میں اور موجودہ امام کے فرامین میں اختلاف ہو تو اُن اگلے اماموں کے ارشادات کو چھوڑ دو اور ''مِنۡکُمۡ'' کی روشنی میں امام کے اُس فرمان پر عمل کرو جو تمہارے زمانے میں ہے۔ جو آنے والا امام ہے اُس کا فرمان معلوم نہیں ہے جو گزشتہ امام ہے اُس کے فرمان اور موجودہ امام کے فرمان میں اگر اختلاف ہے تو تم اپنے وقت کے امام کی اطاعت کرو یہ مطلب بھی اِس ''مِنۡکُمۡ'' میں ہے، یہ مطلب بھی اِس میں ہے، یعنی قرآن کی حکمتوں کی باریکی اِس طرح سے چلتی ہے تو کتنی وضاحت ہے، کیا یہ آیت اتنی باریکیوں اور اِس موافقت کے باوجود کسی اور کی شان میں ہوسکتی ہے۔

چلیں ہم اسی پر بات کریں ذرا تا کہ آپ کو یقین ہو کہ ایک آیت کے اندر کتنی کتنی حکمتیں ہیں کیونکہ اگر ہم اِس شک کو دُور نہ کریں تو پھر یہ کام ادھورا رہ جائے گا وہ یہ کہ کچھ دُوسرے لوگ کہتے ہیں کہ اولو الامر سے مُراد زمانے میں جو حاکم لوگ ہیں، جو بادشاہ ہیں یا صدر ہیں مسلمان ہیں، اِس کی مُراد وہ لوگ ہیں۔ ذرا دیکھئے! اور پرکھئے!، عقل کی ترازو میں اِس کو تولیے! اگر اِس کا مطلب یہ ہو کہ مسلمانوں کے درمیان جو لوگ اعلیٰ عہدے پر ہیں تو اُن کی اطاعت لازم ہو تو اُس میں کوئی غلط شخص بھی ہوسکتا ہے تو پھر یہ کہاں کا انصاف ہے، اور یہ کہاں کی حکمت ہے کہ خدا ہر حالت میں اُس بادشاہ کی اطاعت کے لئے لوگوں کو دعوت دیتا ہو کہ وہ غلطی پر ہے، وہ اپنی غرض کے پیچھے چلتا ہے، اور جس میں یہ نقص بھی ہے کہ جس طرح ہمیشہ اسلام کے مختلف فرقوں میں اور مختلف بادشاہوں کے درمیان تصادم ہوتا رہا ہے، تو اُس صورت میں قرآن اُن مسلمانوں کو یہ کہتا ہے کہ تم ہر حالت میں اپنی ہی بادشاہ کی اطاعت کرو، تو اُدھر اُن کو فرماتا ہے کہ تم اپنے بادشاہ اور اپنے حاکمِ وقت، اپنے (High Command) کی اطاعت کرنا، تو خدا اُن دونوں مسلمانوں کو آپس میں لڑاتا ہے اور لڑنے کے لئے حکم

دیتا ہے یہ کہاں کی حکمت ہے؟ کہ اُدھر افغانستان والوں کو کہے کہ تم اپنے بادشاہ کی فرمانبرداری کرنا اور اِدھر پاکستان والوں سے کہے کہ تم اپنے حاکم کی اطاعت کرنا، تو لازم ہے کہ اِس اطاعت میں وہ ایک دُوسرے کے خلاف [کام] کریں گے، اور اِس کے علاوہ قرآن یعنی پارٹیوں سے کہتا ہے کہ تم اپنی اپنی پارٹی کے لیڈر کو مانو اور اُس کی اطاعت کرو، تو اب پارٹیوں کے اندر بھی یہ جھگڑا ہوگا، اور قبیلوں کے اندر بھی یہ جھگڑا ہوگا، خاندانوں کے اندر بھی اِس سے جھگڑا پیدا ہوگا اور مختلف مُلّا، مولویوں کے درمیان بھی تصادم ہوگا، کیونکہ یہ اولو الامر اُن کے نزدیک وہ شخص ہے جو اعلیٰ عہدے پر فائز ہے تو لشکر کے سردار کو مان لیا جائے تو اُس میں بھی یہ بات ہوگی۔ جو چیز ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عقل کے موافق نہیں ہے تو وہ صحیح نہیں ہے ہمارے پاس اور کیا معیار ہے، کسی چیز کو سمجھنا اور کسی چیز کو سچ ماننا اِس بات پر ہے کہ ہم عقل کے ترازو میں ذرا اُس کو پرکھیں اور حکمت کے معیار پر اُس کو پرکھیں، تو جب وہ چیز صحیح نہیں ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اُن کی جو تشریح ہے وہ دُرست نہیں ہے وہ غلط ہے۔ دُرست یہی ہے کہ دُنیا کے اندر ایک ہی سلسلہ ہونا چاہئے اور ایک ہی ہستی ہونی چاہئے جو کہ صاحبِ امر ہو اور وہ خدا اور رسول کے بعد کے درجے پر ہو۔ دیکھیں! اِس آیت میں وہ مذہبی نوعیت کا ہو اور سیاسی اور دُنیوی نہیں ہے یہاں تو مذہب کا ذکر ہے خدا اور رسول کے بعد یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُواْ اَطِیعُواْ اللّٰہَ وَاَطِیعُواْ الرَّسُولَ وَاُوْلِی الاَمْرِ مِنکُم (۵۹:۴) وہ خلیفۂ خدا اور خلیفۂ رسولؐ ہو اور علم سے، دین سے، حکمت سے واقف اور آگاہ ہو، اِس کے بغیر کس طرح امر کیا جاسکتا ہے، اور خدا کے منشاء سے بھی وہ واقف ہو، تو جس طرح سے بھی سوچیں تو اُس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ صاحبِ امر اور کوئی ہستی نہیں ہے سوائے امام کے، تو اِس مطلب میں ایک طرف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے اندر کچھ کچھ آیتیں ہیں جو بہت ہی اُونچی سطح کی ہیں، جو روشنی کے مینار کی طرح ہیں، اور جن کو جاننے سے دُنیائے قرآن کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور دُوسری طرف سے یہ ہے کہ وہ قرآن کی عظیم آیتیں امام کی شان میں ہیں اور تیسری طرف سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے اندر جو حکمتیں ہیں وہ اسماعیلی ہی جانتے ہیں۔ اِس کے علاوہ یعنی اِس میں یہ مقصد بھی ہے کہ ہم قرآن سے رُجوع کریں، قرآن کو سمجھیں اور قرآن کی حکمتوں کو اپنائیں۔

اب میں یہاں سے کسی دُوسرے (Point) کی طرف جاتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہم نے کہا تھا کہ امام قرآن کا نور ہے اپنے وقت میں رسولؐ قرآن کا نور تھا۔ اِس آیت میں ذرا دیکھیں کہ خدا کس ترتیب سے فرماتا ہے کس چیز کا نام پہلے ہے اور کس چیز کا نام بعد میں ہے: قَدْ جَاءَکُم مِّنَ اللّٰہِ نُورٌ وَ کِتَابٌ مُّبِین (۵:۱۵)، نور پہلے آیا ہے اور کتاب بعد میں اِس آیت کے مطابق، رسول پہلے رسول ہوا، رسول پہلے رُوحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچا پھر اُس کے بعد کتاب کا نزول شروع ہوگیا، کتاب بعد میں رسول پہلے۔ رسول نے عبادت کی، بندگی کی، ریاضت کی، اعتکاف کیا، غارِ حرا میں گئے، اسمِ اعظم کو دُہرایا جو کہ حضرتِ ابوطالبؑ نے [جو] اُس وقت کے امامِ مقیم تھے اُن کو اسمِ اعظم دیا تھا، اور جس کے نتیجے پر آنحضرتؐ رُوحانیت

کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوگیا اور پھر نزولِ وحی کا آغاز ہوا رفتہ رفتہ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ نور کا تقرّر پہلے ہے اور کتاب کا نزول بعد میں ہے، اِس لئے اِس آیت کے اندر: قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُّبِين (۵:۱۵) یہ ہے۔ اب پیغمبر سے مثال لیں گے کہ وہ قرآن کی روشنی کس طرح تھے اور کس معنی میں تھے بڑی اچھی بات ہے، بہت عمدہ مثال ہے آپ توجّہ فرمائیں عرض کی جائے گی۔ قرآن ایک روشن دُنیا کی صورت میں نازل ہوا تھا، جس معنی میں پیغمبر نور ہیں اُس معنی میں پیغمبر کا نور نازل ہوا تھا کہاں نازل ہوا تھا؟ پیغمبر کے باطن میں لیکن نور کتاب میں منتقل نہیں ہوسکتا تھا نور کو کتاب کی صورت نہیں دی جاسکتی تھی کیونکہ نور زندہ تھا وہ رُوح میں ٹھہر سکتا تھا، پیغمبر کے دل میں اور اُن کے مقدّس دماغ میں۔ لہٰذا قرآن روشنیوں کی ایک دُنیا بن کر نازل ہوا اور رسول اللہؐ نے وہ روشنی کتاب کی صورت میں ظاہر نہیں کی یہ ایک ناممکن بات تھی لہٰذا رسول اللہؐ نے اُس روشنی کی ترجمانی کرتے ہوئے عربی زبان میں قرآن لکھایا ایک بات، یہ تو بالکل خاکے کی طرح میں نے بتایا اور مزید تفصیل سے میں بتاؤں گا موجودہ وقت سے ہم فائدہ اُٹھا کر، سائنس کی دُنیا سے فائدہ اٹھا کر ہم کسی مثال کو پیش کرتے ہوئے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کریں دُنیا میں ایک مہذب فلم ہے، بہت اچھی فلم ہے، اُس میں نیکی ہے بدی نہیں ہے، شر نہیں ہے، بہت عمدہ اور شائستہ باتیں ہیں اُس کے اندر۔ ایک شخص کے سامنے وہ فلم پیش کی جاتی ہے یا ٹی۔وی ہے، سبق آموز چیزیں ہیں اور علم وحکمت کی باتیں ہیں ظاہر ہے کہ اُس میں روشنی ہے ظاہر ہے کہ اُس میں مناظر ہیں، (Scenes) ہیں، درخت ہیں، آسمان ہے، زمین ہے، روشنی ہے، لوگ ہیں، بہت ساری چیزیں، آواز ہے، حرکت ہے اور ایک دُنیا ہے۔ اچھا! ایک ہوشمند شخص چاہتا ہے کہ اُس کی ترجمانی کرے وہ لکھتا ہے یا لکھاتا ہے اُن چیزوں کو جو کہ اُس وقت روشنی کی کیفیت میں اُس کے سامنے ہیں، اُس سے ایک اچھی، عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ ایک کتاب بنتی ہے، تو اب دو چیزیں ہوگئیں، ایک وہ فلم، وہ (Pictures)، وہ حرکتیں، وہ آوازیں، وہ (Places) اور وہ ہر چیز اور وہ لوگ جو اُس میں نظر آتے ہیں [اور] ایک وہ کتاب، تو اب کتاب اور اُس فلم کے درمیان سوچیں! کتنا فرق ہے؟ بہت کچھ فرق ہے، بہت کچھ فرق ہے، بہت کچھ فرق ہے، یہ کتاب ایک خاموش کتاب ہے جو بولتی نہیں ہے، وہ فلم بولتی تھی اُس میں تو باتیں ہوتی تھیں اور باتوں سے بہت کچھ سمجھ لیا جاسکتا تھا، اُس کے لہجے سے، اُس کے اشارے سے، اُس کے اندازِ بیان سے، اور اُس کے ماحول سے لیکن کتاب کے اندر نہ تو کوئی ماحول ہے، نہ تو کوئی خاص اندازِ بیان ہے اور نہ آواز ہے، نہ کوئی حرکت ہے۔ اسی طرح رسول اللہؐ پر قرآن جو نازل ہوا تھا وہاں تک وہ نور تھا اور زندہ تھا لیکن رسول اللہؐ نے قرآن کی سورتوں کو، آیتوں کو کتاب کی شکل دے دی تو قرآن بن گیا، اور قرآن کی اصلیت وحقیقت آنحضرتؐ میں باقی رہ گئی، جو حقیقت جو اصلیت، جو روشنی، جو آوازیں اور نہ مٹنے والی صورتیں آنحضرتؐ کے تصوّر، دل و دماغ میں جو قائم ہوئی تھیں اُن کا مجموعہ نور کہلاتا تھا قرآن کا نور، تو اِس معنی میں رسولؐ اپنی اُس حیثیت، اُس روشنی، اُس مرتبت، اُس رُوح کے لحاظ سے قرآن

کے نور تھے اور وہ کتاب جو انہوں نے لکھائی وہ کتاب تھی۔ اب اِس کتاب کو اُس نور کی روشنی میں جو پیغمبر میں تھا پڑھنا تھا اِس لئے پیغمبر لوگوں کو سمجھاتے تھے، کیونکہ [قرآن] اصلی حالت [میں] اُن کے پاس تھا، ابھی دُوسری طرح سے جو ہم نے موجودہ وقت میں، موجودہ سائنس کی دُنیا سے جو مثال دی تھی کہ کوئی شخص فلم سے یا (Picture) سے جب کتاب لکھتا ہے تو کتاب میں پڑھنے والوں کو جو اُلجھن پیش ہوتی ہے تو وہ شخص جس نے فلم وغیرہ دیکھی تھی وہ اُن کو سمجھاتا ہے، کیونکہ اُس کے پاس کتاب کی (Spirit) ہے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: نجمہ بیگ پُروف: نسرین اور اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُر حکمت بیان

عنوان: اولو الامر

کیسٹ نمبر: Q-2B   تاریخ: ۲۲ر دسمبر ر ۱۹۷۷، کینیڈا

Click here for Audio

[رسول اللہؐ] قرآن کے معلّم تھے، قرآن کے نور تھے دونوں باتیں ایک ہیں۔ معلّم اِس معنی میں کہ قرآن پر روشنی ڈالے، جس طرح ایک اُستاد اپنے شاگرد کو پڑھاتے وقت کتاب پر روشنی ڈالتا ہے، اور ایک اور معنی میں پیغمبر کتابِ ناطق تھے اور قرآن کتابِ صامت، اِس کا بھی یہی مطلب ہے اور کچھ الگ مطلب ہرگز نہیں۔ کتابِ ناطق اِس معنی میں کہ قرآن کی زندہ حقیقتیں تو وہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں، اُوپر سے جو خدا کے حضور سے قرآن نازل ہوا [اور] نازل ہوتے ہوتے جب پیغمبر تک آیا وہ نور تو وہاں سے اُس کو آگے راستہ نہیں تھا، وہ نور وہاں رُک گیا اور وہاں سے ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی وسیلہ تھا وہ یہ کہ تحریری صورت میں ترجمانی کی جائے، (Interpret) کیا جائے، یعنی رُوحانی حقیقتوں کی ترجمانی کی جائے تو [وہ] ہوگئی قرآن بن گیا۔ قرآن بننے کے بعد اور جو قرآن کی اصلیت، حقیقت، روشنی اور (Spirit) وغیرہ جو کچھ تھی اُس کے معنی میں آنحضرتؐ کتابِ ناطق ہو گئے، آنحضرتؐ قرآن کے نور ہو گئے، آنحضرتؐ قرآن کے معلّم ہو گئے اور قرآن خاموش کتاب ہوگئی، اور [قرآن] معلّم کے لئے محتاج ہوا اور روشنی کے لئے محتاج ہوا۔ آنحضرتؐ کے بعد وہ روشنی، شرعی زبان میں، میں کہتا ہوں مولانا علیؑ میں منتقل ہوگئی۔ اُس کی مثال اسماعیلی مذہب میں زندہ اور موجود ہے، کس طرح قرآن منتقل ہوسکتا ہے؟ یا یہ ایک شوق کی اور جذبے کی بات ہے یا محض عقیدہ ہے یا حقیقت ہے اُس کی مثال میں آپ کو عرض کرسکتا ہوں۔

قرآن کا نور کاغذ میں منتقل نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن ایک انسان میں جس میں قابلیت ہو، صلاحیت ہو، اُس میں منتقل کیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن یعنی کتاب، کاغذ اور انسان، الگ الگ ہیں، انسان اپنی رُوح، کتاب میں داخل نہیں کرسکتا ہے، کتاب میں منتقل نہیں کرسکتا ہے، اپنی رُوح ایک شاگرد میں، اولاد میں یا کسی عزیز میں منتقل کرسکتا ہے، کس طرح؟ انسان انسان میں رُوح پھونک سکتا ہے، انسان انسان میں اپنا ہنر منتقل کرسکتا ہے، اپنا علم منتقل کرسکتا ہے، اپنی محبّت منتقل کرسکتا ہے، اور اپنا بہت کچھ منتقل کرسکتا ہے، عادت، خصلت، دانائی، ہوشیاری، تمیز، ادب۔ اِس کے برعکس ایک شریر انسان اپنی شرارت کو دُوسرے میں منتقل کرسکتا ہے، یہ بات ہے تو اِس کے علاوہ شیطان کسی کے سینے میں وسوسہ

ڈال سکتا ہے۔اسی طرح ہادیٔ برحق اُس کے مقابلے میں توفیق ،ہمّت ،ہدایت،کسی مومن کے دل و دماغ میں منتقل کرسکتا ہے،اب رسول اللہؐ نے آسمانی کتاب کی رُوح اپنے جانشین میں منتقل کی اُس کے لئے ایک ذریعہ تو وہ مختصر پُرحکمت تعلیم تھی جوظاہر میں کسی عزیز کو دی جاتی ہے،اور دُوسری چیز محبّت اور توجّہ تھی،اور ایک اور چیز اسمِ اعظم تھا۔ایسے وسائل سے پیغمبر اپنے جانشین میں رُوحانیت کا وہ عظیم مرتبہ منتقل کرتا ہے،اور ہر بار اپنے جانشین میں وہی نور منتقل کرتا ہے وہ معجزانہ چیز ضرور ہے لیکن معجزے کے ساتھ ساتھ انسانِ کامل کا ایک طریقۂ کار بھی ہے یعنی ایک اُصول بھی ہے اور وہ اُصول یہ ہے کہ پیغمبر اپنی جانشین میں اپنا عظیم مرتبہ اِس طرح منتقل کرتا ہے کہ اُس پر توجّہ رکھتا ہے یعنی اُس کی طرف توجّہ دیتا ہے،اور ایک دُوسری چیز یعنی محبّت ،اُس کو محبّت دیتا ہے اور اُس کو تعلیم دیتا ہے اور اُس کو اسمِ اعظم بتلاتا ہے۔اِن چیزوں کے پُل سے رُوحانیت کا مرتبہ پیغمبر کے جانشین میں آتا ہے۔ہمارے اسماعیلیوں کے لئے یہ بات سمجھنا آسان ہے اور البتہ دُوسروں کو سمجھانا ذرا مشکل ہے،ہمارے لئے آسان اِس معنی میں ہے سنئے!بڑی اچھی بات ہے کہ آپ کو ''بول'' دیا جاتا ہے جس کا دُوسرا نام اسمِ اعظم ہے یا ''نقش'' دیا جاتا ہے اِن تین لفظوں کا مطلب بنیاد میں ایک ہے تو آپ کو اسمِ اعظم کیوں دیا جاتا ہے اور اسمِ اعظم میں کیا چیز ہے؟ آپ نے کبھی سوچا ہے؟ سوچا ہوگا میں نہیں کہتا ہوں کہ آپ نے نہیں سوچا ہے سوچا ہوگا آپ جانتے ہوں گے لیکن مجھے بھی کہنے کے لئے موقع ملے،اجازت ہو۔

وہ یہ کہ اسمِ اعظم میں نور ہے،امام کا نور ہے،امام اسمِ اعظم آپ کو دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسمِ اعظم کے علاوہ ایک اور چیز ہے وہ توجّہ ہے،وہ دُعا ہے،وہ مہربانی ہے،[اس کے] علاوہ تعلیم بھی آپ کو دیتا ہے آگے،پیچھے ہر وقت اور امام آپ کو اسمِ اعظم دیتا ہے،اور ساتھ ہی ساتھ اُس کی توجّہ رہتی ہے اور محبّت رہتی ہے اور عبادت کے لئے فرماتا ہے۔اِن تمام چیزوں کے ذریعے میں ،خلاصے کے طور پر، نتیجے کے طور پر اسمِ اعظم کا کورس جب آپ میں مکمّل ہو جاتا ہے تو اُس وقت آپ کو شروع شروع میں بیتُ الخیال کی روشنی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اِس روشنی میں ترقّی ہوتی ہے،تو آپ کے سامنے ایک رُوحانیت کی دُنیا آتی ہے اور کچھ آگے چل کر اگر خوش قسمتی ہے تو آپ کو وہ کارِ بزرگ نصیب ہوتا ہے جو کہ ہمارے پیروں کو ہوا تھا،کیونکہ رُوحانیت کے مختلف (Stages) ہیں،اور جب وہ کارِ بزرگ آپ کو حاصل ہوتا ہے کہ اُس میں یعنی آواز ہے،رُوح ہے اور علم ہے،حکمت ہے،تو وہ قرآن کی رُوح ہوتی ہے،قرآن کا نور ہوتا ہے،اور مجھے بالکل کُھل کر بات کرنی ہے آپ پر وہ واقعات گُزرنے لگتے ہیں جو رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوئے تھے یا اِس کو آپ یوں سمجھئے کہ خدا کے حضور میں وہ چیز ریکارڈ ہے،وہ وحی ،وہ الہام،وہ رُوحانی تجربات جو پیغمبر پر گُزرے تھے آپ کے پیغمبر پر۔جب وہ چیز ریکارڈ ہے تو سب سے پہلے اُس کو علیؑ نے مشاہدہ کیا،علیٰ ھذا القیاس یکے بعد دیگرے تمام اماموں نے اُس کو دیکھا تھا،یہ نور تھا،یہ رُوحانیت تھی،یہ رُوحانیت کے تجربات تھے،یہ پیغمبر کے معجزات تھے جس کو سب سے پہلے اماموں نے دیکھنا تھا

تاایندم اماموں نے اِس سلسلے کو قائم رکھااور نہ صرف یہ چیز اماموں میں محدود ہے چونکہ آپ بھی اماموں کے رُوحانی فرزند ہیں،اور فرزند کو باپ کی ہر چیز ملتی ہے اگر نہیں ملتی ہے تو دیکھنے کے لئے موقع بھی تو ملتا ہے،اور باپ اُس کو سمجھاتا ہے کہ دیکھو تم نالائق مت بنو،تم لائق بنو ، باپ کا بیٹا بنو یہ دیکھو تمہارے باپ کا مال تمہارے باپ کا مکان ،بنگلہ، جائیداد، بینک بیلنس ،یہ،وہ دکھاتا ہے ۔کوئی بھی مہربان باپ اپنے بیٹے سے کوئی چیز دریغ نہیں کرتا ہے تو امام اگر ہمارا مہربان باپ ہے تو ہمارا حق ہے کہ ہم امام کی امامت کو دیکھیں، جھانکیں ۔امامت کو ظاہری طور پر ہم اُس کو نہ تو چلائیں گے اور نہ ہم اُس کے اہل ہیں،لیکن دیکھیں گے،دیکھیں گے،بادشاہ کا بیٹا دیکھتا ہے باپ کی بادشاہی کو دیکھتا ہے اور اُس کے بازو میں،اُس کے پاس تخت پر بھی بیٹھتا ہے، کرسی پر بھی بیٹھتا ہے اس کی کوئی بات نہیں لیکن البتہ [وہ] بادشاہ نہیں ہے اُس کے لئے وقت نہیں ہے،وقت ہو تو بادشاہ بھی ہو جائے گا،لیکن اگر شہزادہ ہے تو وہ ہر چیز کو دیکھے گا،خزانہ دیکھے گا،عزّت دیکھے گا،دُنیا والے اُس کی عزّت کرتے ہیں تو باپ اُس کی عزّت کرتا ہے دُنیا والے بادشاہ کی عزّت کرتے ہیں بادشاہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو بادشاہ اُس کو وہ چیزیں دکھاتا ہے یہ آپ کو رُوحانیت میں نوازنے کی ایک مثال ہے،تو آپ اسمِ اعظم کی روشنی میں امام کے نور کو اپنا سکتے ہیں اُس کے بغیر شناخت کیسے ہو؟ شناخت کسے کہتے ہیں؟ پہچان کو کہتے ہیں،پہچان کس چیز کا نام ہے؟ مشاہدے کا نام ہے،دل کی آنکھ سے،باطن کی نظروں سے دیکھے بغیر شناخت کیسے ہو؟ اور شناخت میں سب چیز آتی ہیں ۔

چلئے دُوسری باتوں کو فی الحال چھوڑئے کہ شناخت کا دائرہ کتنا وسیع ہے آگے چل کر شاید آپ کو بتائیں گے یا کسی لیکچر میں آئے گا یا آپ کے لئے کیسٹس وغیرہ آرہے ہیں اُن میں یہ بات آئے گی، بہت بڑا المبا کورس ہوا ہے آپ کے لئے اسماعیلیہ ایسوسی ایشن نے اہتمام کیا ہے تو ہمیں بھی اور آپ کو بھی اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کے احسان کو ماننا چاہئے،تو یعنی امام کے مراتب اور اُن کی روشنی کو دیکھتے ہیں اور دُور سے نہیں دیکھتے ہیں، یہاں سے امام میں جھانک کر نہیں دیکھتے ہیں اپنے آپ میں دیکھتے ہیں،تو امام یہاں آتا ہے نہ کہ ہم وہاں جاتے ہیں،امام یہاں آتا ہے یہاں سب ہوتا ہے، یہاں پر دیدار ہوتا ہے ۔جب امام یہاں آتا ہے تو قرآن کی رُوحانیت الگ ،امام کا نور الگ ،پیغمبر کا نور الگ ،خدا کا نور الگ یہ کوئی بات نہیں ہے یہ کوئی منطق نہیں ہے بس فقط ازل سے لے کر ابد تک ایک ہی چیز ہے نور اس کا نام ہے لیکن نام بہت ہیں ۔کبھی رُوحانیت ،کبھی نور،کبھی امام کی امامت ،کبھی اُس کا نام نبوّت ،اور کبھی رُوح ،اور کبھی اُس کا نام خدا کا نور،کبھی پیغمبر کا نور،کبھی امام کا نور،کبھی اُس کو نورِ قرآن ،اور کبھی اُس کو روحِ کُل ،رُوحِ قدسی وغیرہ ۔کسی بھی نام سے اُس کو یاد کریں مقصد اور معنیٰ ایک ہے،تو اِس کے اندر قرآن ہے میں بھولا نہیں ہوں اپنے مقصد سے اگرچہ دُور گیا ہوں لیکن لوٹ کر اُس کے لِنک کو بتانا ہے یہ ہے میں عرض کر رہا تھا کہ اسماعیلی مذہب میں یہ ممکن ہے کہ قرآن کے باطن میں آئیں دیکھیں اور میں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ خدا کے حضور میں ریکارڈ ہے،اور دُنیا کے سائنسدانوں نے ایک چیز پیدا کی جو

بہت عمدہ چیز ہے، جو کسی کے احوال کو، کسی کے قصّے کو فلم کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے تو کیا خدا کے لئے یہ بات ناممکن ہے کہ رسول اللہؐ پر کس طرح قرآن نازل ہوا تھا، اور قرآن کیا ہے اُس کا کوئی ریکارڈ ہو، اُس کی کوئی فلم ہو اور وہ فلم نور کہلائے، قرآن کا نور، کیونکہ اُس کے اندر قرآن کے واقعات ہیں، کیونکہ اُس کے اندر قرآن کے تجربات ہیں، جو محمدؐ کے تجربات ہیں، کیونکہ اُس کے اندر وحی کی کیفیت ظاہر ہے تو وہ چیز ایک امام سے دُوسرے امام میں ہوتے ہوئے ہر زمانے میں جاری و باقی ہے اور نہ صرف یہ چیز امام میں ہے بلکہ امام کی معرفت کے عنوان سے کسی کے مرتبے کے عنوان سے نہیں امام کی معرفت کے عنوان سے کسی کی جائیداد، اور کسی کے ٹائٹل کے عنوان سے نہیں امام کی شناخت کے عنوان سے مومن میں وہ چیز، وہ روشنی، وہ نور آتا ہے۔

جب نور آتا ہے تو اُس میں قرآن آتا ہے، قرآن! ایک انسان قرآن بن سکتا ہے تو اُس وقت مومن کے سینے میں قرآن ہوتا ہے قرآن کی روشنی ہوتی ہے قرآن کی رُوحانیت ہوتی ہے، اُس روشنی میں قرآن کے ظاہر کے مطالب کو، اُس کی حقیقتوں کو، اُس کی مثالوں کو، اُس کی تاویلات کو سمجھ لیا جاسکتا ہے تو پھر علیؑ میں قرآن ہونے میں کیا تعجّب ہے، علیؑ کے ایک غلام میں قرآن ہونے کی بات کیجئے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں علم والوں کے سینے میں قرآن کس طرح تھا اُس کے لئے آیات ہیں ہم آپ کو بتلائیں گے آپ کو لکھائیں گے تو اِس بیان کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کی رُوح اور رُوحانیت اِس دُنیا کی چیز ہے، [یہ] اسماعیلیوں کی میراث ہے، اسماعیلیوں کی میراث ہے تو اِس میراث کو سنبھالنا چاہئے اِس کو لینا چاہئے اِس کو سمجھنا چاہئے، اپنی جائیداد کو، اپنی علمی جائیداد کو، اپنی رُوحانی جائیداد کو، اپنے باپ کی جائیداد کو سنبھالنا چاہئے۔ خدا کی قسم! امام جو کچھ کہتا ہے وہ یوں ہی نہیں کہتا ہے وہ سچ کہتا ہے اُس کا کہنا سچائی پر مبنی ہے، اور وہ یہ کہتا ہے کہ تم میرے پیارے رُوحانی فرزند ہو۔ اِس کے اندر بہت معنی ہیں، بہت معنی ہیں اور اِس میں یہ بھی معنی ہیں کہ مومن قرآن کی رُوحانیت تک رسا ہوسکتا ہے، قرآن کی رُوح کا مشاہدہ کرسکتا ہے، قرآن کے نور کو دیکھ سکتا ہے، اُس سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے، قرآن کے نور کو ہمیشہ کے لئے اپنے سینے میں رکھ سکتا ہے اور یہ نور امام کا ہے۔

یہاں کہتے چلیں کہ کسی مومن کو یہ گمان نہیں ہونا چاہئے، کہ نور اگر ایک ہے تو وہ نور امام میں ہوسکتا ہے وہ نور امام سے دُوسرے میں کس طرح آسکتا ہے، یہ بات نہیں ہے کوئی شک نہیں ہے نور ایک ہے، لیکن اُس کی روشنی، اُس کا عکس ہر مومن میں آسکتا ہے۔ آسمان کے سورج سے مثال لیں سورج ایک ہے لیکن آپ کے پاس اگر ایک آئینہ ہے تو اُس کو سورج کی طرف کرکے دیکھیں آپ کے آئینے میں بھی سورج ہوگا، اور دُوسرے کے پاس بھی اگر ایسا آئینہ ہے تو اُس کے پاس بھی سورج ہے اور دُنیا والوں میں سے ہر ایک پاس ایک ایک آئینہ ہے تو سب کے پاس سورج پہنچ سکے گا حالانکہ اِس سورج میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مومنین اپنے آپ کو دُرست رکھیں، نیکی کا راستہ اختیار کریں، تقویٰ

پر عمل کریں تو تمام اسماعیلیوں میں پیروں جیسی رُوحانیت آئے گی۔سب میں قرآن،سب میں قرآن ہوگااور حالانکہ امام کے نور سے ایک ذرّہ بھی کم نہ ہوگا یہ تو ایک رُوحانی چیز ہے۔مادّی چیز ایک جگہ پر ہوسکتی ہے اور رُوحانی چیز ہر جگہ پر ہوسکتی ہے کیونکہ وہ مادّی نہیں ہے،اُس کی مقدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے وہ مقدار نہیں ہے وہ ایک یعنی ایسی حقیقت ہے جو بسیط ہے جو ہر جگہ پر ہے۔تو قرآن جب رُوح ہے تو ہر مومن کے دل میں اُس کی روشنی ہوسکتی ہے یہ قرآن کی رُوحانیت کے بارے میں تھوڑا سا خلاصہ کیا گیا اب میں ذرا آپ کے سوالات کے لئے انتظار کرتا ہوں تا کہ درمیان میں (Discussions) بھی ہو جائیں یا آفیسر صاحب تشریف لائے ہیں وہ جیسا فرمائیں گے اُس کے مطابق عمل کیا جائے گا اِس لئے میں اِس مقام پر آ کر اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں یا کہ ہم وقفہ کرتے ہیں اور پھر جیسے ہمارے آفیسر فرمائیں گے اُس کے مطابق ہوگا مہربانی آپ نے کافی توجّہ سے مجھ کو سُنا،شکریہ۔

۔۔۔انہوں نے جیسا سوال کیا وہ ظاہر ہے لیکن یہ بات یا یہ اُن کا عقیدہ کوئی منطق نہیں رکھتا ہے کیونکہ خدا جہاں فرماتا ہے کہ تم خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو تو خدا کی اطاعت میں قرآن کی بات ختم ہوگئی،اور لوگوں کے سامنے قرآن کے سوا اور کوئی چیز ہے نہیں کہ وہ خدا کی اطاعت اُس چیز کے ذریعے سے کریں اور خدا نے فرمایا کہ تم خدا کی اطاعت کرو تو اِس میں قرآن کا ذکر آ گیا،نزولِ قرآن کے علاوہ اور کسی وقت میں براہِ راست خدا کی اطاعت نہیں ہوسکتی ہے خدا سے (Approach) نہیں ہوسکتا ہے اور رسولؐ کی اطاعت میں حدیث کا ذکر آیا تو بات ختم ہوگئی۔اب کس طرح کوئی کہہ سکتا ہے کہ خدا کی اطاعت کرو قرآن کے علاوہ کوئی چیز ہے رسولؐ کی اطاعت کرو حدیث سے زائد کوئی چیز ہے کوئی چیز نہیں، مطلب وہاں پر ختم ہے اور تیسرے مرحلے پر اور کوئی چیز نہیں ہے اگر وہ اولو الامر سے بادشاہ کو مُراد لیتے ہیں تو تھوڑی سی اُس میں وضاحت کی ضرورت پیش آتی ہے۔اگر وہ اولو الامر کی جگہ پر قرآن کو لیتے ہیں اور حدیث کو لیتے ہیں تو یعنی اِس میں ذرا بھی رُکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے،وہ بات وہاں پر ختم ہوگئی اور خدا کی اطاعت کرو تو قرآن کی اطاعت کرو جو ابھی ابھی تم پر نازل ہو رہا ہے،رسولؐ کی اطاعت کرو معنی حدیث کی اطاعت کرو اور قرآن و حدیث کے بعد وہ چیز جو ہوگی وہ تیسرے درجے کی ہونی چاہئے اور اُس جنس سے ہونی چاہئے اُس کے موافق ہونی چاہئے،تو تیسری چیز اور کچھ نہیں سوائے اِس کے کہ وہ یعنی امام ہے جو خدا اور رسولؐ کے جانشین ہیں میرے خیال میں یہ اُن کا عقیدہ ایسا ہے کہ اِس میں زیادہ دلائل کی ضرورت نہیں ہے اور بہت ضعیف عقیدہ ہے۔بہت کمزور اتنا سا جواب ان کے لئے کافی ہے۔

سوال: (علّامہ صاحب اگر اجازت ہو تو میں ایک سوال پیش کروں یہ اولو الامر کا جو مسئلہ ہے،جو اولو الامر ہے وہ (Plural) ہے یا (Singular)؟(Plural) ہے،(تو آپ نے جو ارشاد فرمایا کہ حضرتِ علی کو اولو الامر قرار دیا گیا رسول

اللہ کے زمانے میں، تو یہ (Plural) ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟)

جواب: یقیناً عمدہ سوال ہے اور اِس میں معلومات افزا ہے خوب سوال کیا، جذاک اللہ، تو اِس سلسلے میں شیعہ تفاسیر میں اِس سوال کا جواب دیا گیا ہے وضاحت کی گئی ہے یہ تفسیر المتقین، اور دُوسری اسماعیلی کتابوں میں اولو الامر جمع ہے ،صیغۂ جمع ہے ، تو حسنؑ، حسینؑ اور علیؑ اُس زمانے میں اولو الامر تھے ۔چونکہ عربی صیغہ ایسا ہے کہ ایک سے اُوپر دو کے لئے ایک کے لئے الگ ہے دو کے لئے الگ ہے، دو سے اُوپر جو ہے وہ جمع ہے، باقی زبانوں میں دو سے اُوپر جمع ہے لیکن عربی میں دو سے اُوپر جمع ہے ۔ اِس میں دو کا ذکر نہیں ہے دو سے زیادہ کا ذکر ہے، اولو الامر میں دو سے زیادہ ہیں کچھ میں لیکن یہ معلوم نہیں کہ تین ہیں یا تین سے زیادہ ہیں اِس کا تو معلوم نہیں ہے، مگر دو سے زیادہ ہیں، اولو الامر، تثنیہ کہتے ہیں، یہ تثنیہ نہیں ہے بلکہ جمع ہے، تو اِس میں یعنی شیعی علماء نے شیعی تفاسیر کے اندر ذکر کیا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں اولو الامر علیؑ، حسن اور حسینؑ تھے اور واقعاً جب ہم جنرل اسلام میں جاتے ہیں تو سنّی بھی حسنؑ اور حسینؑ کے ریفرینس سے یعنی رسولؐ کی حدیثیں اور اسلام کی باتیں بتلاتے ہیں ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ علیؑ اور حسنؑ اور حسینؑ خاندانِ نبوّت کی حیثیت سے اور پیغمبر کے عزیزوں کی حیثیت سے اور پیغمبر کے گھر کے افراد کی حیثیت سے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے، یہ جنرل بات کرتا ہوں، اسماعیلی بات نہیں ہے اِس میں تو تواریخ کی بات کرتا ہوں کہ حسنؑ اور حسینؑ کے حوالے سے، علیؑ کے حوالے سے سب مسلمان روایات بیان کرتے ہیں قرآن کے سلسلے میں تفاسیر بیان کرتے ہیں ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اولو الامر رسول اللہؐ کے زمانے میں حسنؑ، حسینؑ اور علیؑ تھے، اِس کے بعد کے لوگوں پر اِس کا اطلاق یوں ہوگا کہ اب سب سے پہلے اولو الامر میں سے تین ہو گئے، اور حسینؑ کے بعد زین العابدینؑ کے زمانے کے لوگوں پر اِس کا اطلاق اِس طرح ہوتا ہے کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُم (۵۹:۴) ''اور اے ایمان والو! تم خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اولو الامر کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہیں'' تو ہر زمانے میں اولو الامر کی اطاعت لازمی ہوتی ہے ایک بات، اِس میں ایک اور چیز ہے ذرا باریکی سے خداوندِ عالم نے امکانی طور پر زمانہ رسولؐ سے لیکر قیامت تک جو لوگ وجود میں آنے والے تھے اُن سب کو سامنے رکھ کر اُن سب سے خطاب کیا ہے، سب سے خطاب کیا ہے، اور اِس خطاب میں فرمایا گیا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اپنے امامِ وقت کی اطاعت کریں، تو بہر حال جس طرح سے بھی کہیں اِس میں یہ بات دُرست ہے کہ اِس کا اطلاق اولو الامر پر ہوتا ہے اور جمع کے صیغے میں ہوتا ہے اور اِس میں یہ بھی ممکن ہے کہ امام کے جو حدود ہوتے ہیں، حجّت، پیر وغیرہ وہ بھی اِس اولو الامر میں آتے ہیں، کیونکہ حجّت کا امر، پیر کا امر امام کا امر ہے، بہر حال یہ لفظ اور یہ آیت اماموں سے باہر نہیں جاتا ہے اور ہر حالت میں اِس کا اطلاق اماموں پر ہوتا ہے یہ ہے آپ کے اِس سوال کا جواب۔

سوال: (علّامہ صاحب سوال ہے، عام مسلمان جو ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ۔۔۔۔)

اِس سوال کو نئے سرے سے بنا سکتے ہیں اور انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ خود سوال کو ذرا کمزور کر کے اُس میں ہم کو پھنسانے کی ایک کوشش ہے اِس کے لئے یہ الفاظ اُن کے الفاظ صحیح نہیں ہیں ہم خدا کے الفاظ ہی میں اِس کو بیان کریں گے، اور دیکھیں گے کہ اُن کا یہ سوال صحیح ہے یا غلط ہے ۔ اسی آیت سے ہم دُور کیوں جائیں اگر خدا کے کلام میں سب کچھ موجود ہوتا تو خدا کو یوں فرمانا چاہیئے تھا: یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا اَطِیعُوا اللہ پس اے ایمان والو! تم خدا کی اطاعت کرو ۔ تو خواہ مخواہ تین اطاعتیں کیوں؟ اطاعت دراصل ایک ہے جو قرآن کی اطاعت ہے وہ خدا کی اطاعت ہے ۔ دُوسری بات قرآن میں تفصیل سے روزے کا ذکر کہاں ہے؟ نماز کی رکعتوں کا اور اتنے سب کچھ کا ذکر کہاں ہے؟ اسلام کے اگر سات ستون ہیں تو اُن سات رہفت ارکانِ اسلام کا تفصیل سے ذکر نہیں ہے، سب ہی مانتے ہیں تفصیلات جو ہیں وہ پیغمبر نے کیں اُس کے علاوہ کچھ روایتیں ایسی ہیں جو رسول اللہؐ کے زمانے سے متعلّق ہیں ۔

۔۔۔جو کہ قرآن میں نہیں ہیں، جو خدا پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا ہے، خدا نے تو یہ فرمایا کہ قرآن کو نور کی روشنی میں پڑھیں، ہر چیز اگر قرآن کی اسی کیفیت میں، اسی حالت میں واضح ہوتی تو نور کی کیا ضرورت؟ یہ کہتا ہے کہ قرآن کے باطن میں اِس کا ذکر ہے، ہم اِس سے انکار نہیں کرتے ہیں، ہمیں یہ اقرار ہے کہ قرآن کے باطن میں، قرآن کی تاویل میں ضرور ہے، ضرور ہے ۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآن کچھ نہیں ہے تو یہ ہماری غلطی ہوتی، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ قرآن کو قرآن ہی کے بقول، قرآن کی روشنی میں، اُس نور کی روشنی میں پڑھنا چاہیئے، بہت ممکن ہے کہ قرآن کے باطن میں ہر چیز کا ذکر ہو اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو قرآن کے باطن میں نہ ہو، تو ہم اِس طرح سے قرآن کی تعریف کرتے ہیں، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے معنی، ستّر حصّہ ہیں ۔ ہر آیت کے سات معنی ہیں بلکہ ہر آیت کی ستّر قسم کی تاویلات ہیں، اور اِس معنی میں قرآن اتنا ہے ظاہر میں، اور باطن میں قرآن اتنا سارا ہے! اتنا سارا ہے! ، کیونکہ جب وہ سات گنا ہے بلکہ ستّر گنا ہے تو اُس میں اور کہانیاں اور داستانیں تو نہیں ہیں اُس میں ہدایت ہے اور بہت کچھ ہے، تو ہم اِس معنی میں قرآن کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور وہ زبان سے قرآن کی تعریف کرتے ہیں اور عمل سے قرآن کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں کس طرح؟ قرآن پر عمل کرنے کے دعویٰ کرتے ہوئے جس مجبوری میں مبتلا ہیں اور جس قدر اُن کے درمیان اختلاف ہے، تو یہ قرآن کو بدنام کرنے کے مترادف ہے، اور اہلِ قرآن ہوتے ہوئے جسطرح دُوسری قوموں کی نظر میں یہ بہت پیچھے ہیں یہ قرآن کو بدنام کرنے کے مترادف ہے ۔ اگر وہ بہت ہی ترقّی کرتے، اور اُن کے درمیان اتّحاد ہوتا تو وہ تعریف قرآن کی ہوتی، انہوں نے جو کچھ کیا یہ اُس میں قرآن کی بدنامی لائی ہے، اسلام کی بدنامی لائی ہے، کیونکہ کسی قوم کی جو کمزوری ہوتی ہے وہ کمزوری اُس قوم کے قانون تک پہنچتی ہے اور اُن کا جو قانون ہے وہ بھی بدنام ہوتا ہے ۔ اسی طرح بہت سے لوگوں نے جس طرح اسلام کو پیش کیا ہے دُنیا والوں کے سامنے اُس سے اسلام کی بدنامی ہوتی ہے، اور قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے ۔ حالانکہ ایسا

نہیں ہونا چاہئے تھا، کہ اگر وہ خوب ہوتے ،اچھے ہوتے ، اتّحاد ہوتا، ترقّی ہوتی ، رسول اللہؐ کے زمانے کی طرح اسلام کی محافظت ہوتی ،انتشار نہ ہوتا تو مٹّھی بھر لوگ اُن پر غالب نہ آتے ،اُن کو نہ ستاتے تو یہ قرآن کی تعریف ہوتی اور اسلام کی تعریف ہوتی کہ اللہ کا دین ایسا ہے کہ قرآن کی تحریر ایسی ہے ۔

ہمیں اگر کسی سے بحث نہیں کرنی ہے یا بضرورت کرنی ہے وہ بات الگ ہے، لیکن اپنے طور پر سمجھنا بہت ہی ضروری ہے، وہ لوگ قرآن شناسی اور قرآن فہمی کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہیں ۔ جہاں پر امام ہے ،جہاں پر امام کے ماننے والے ہیں اور جو لوگ امام کے نور کی روشنی میں قرآن کو سمجھتے ہیں وہ بہت ہی ،بہت ہی مضبوط ہیں ۔میں نے ابھی ابھی قریب میں [ایک] بہت بڑے آدمی سے جو مسلمان نہیں تھا وہ اچھا تھا، دوست تھا سے گزارش کی انہوں نے بہت اچھے شاندار الفاظ سے امام کا ذکر کیا اور امام کے معجزے کا اشارہ کیا، تو میں نے گزارش کی کہ امام کا معجزہ میں ہوں اور مجھ سے کوئی ایسی چیز پوچھیں ،تو ایسا علم بتاؤں گا جو کہ دُنیا والے نہیں بتا سکتے ہیں خصوصاً قرآن کے بارے میں، پھر وہ بہت اچھے انسان تھے اُس نے سمجھ لیا اور نہیں پوچھا۔ مطلب یہ ہے کہ اسماعیلیوں کے پاس قرآن شناسی کے معجزے ہیں، ہمارے اندر جو قرآنی علم ہے اُس کے مقابلے میں لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں، اور اگر معجزے کے لئے ہم ترستے ہیں یا اِس کے لئے ہم قائل ہیں یا اِس کو ہم چاہتے ہیں یہ صحیح ہے لیکن سمجھنا چاہئے کہ مفید معجزہ جو ہے وہ کونسا ہے؟ میں تو اُس کو مفید سمجھوں گا جو عقلی معجزہ ہو، جو علمی معجزہ ہو، جو قرآن کی حقیقتوں کو پیش کرنے کا معجزہ ہو، کیونکہ امام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ وہ قرآن کی حقیقتوں کو اِس طرح سے پیش کر سکتا ہے کہ کوئی اُس کو پیش نہیں کر سکتا، کیونکہ رسول اللہؐ کے دو بڑے معجزے یہی ہیں، ایک تو قرآن اور ایک امام، گواہی کے لئے تو دو چاہئے، تو پیغمبر کی پیغمبری کی گواہی ہے، قرآن اور امام، اُس کے دو معجزے ہیں ۔قرآن اِس معنی میں معجزہ ہے کہ اُس جیسی کتاب نہیں ہے دُنیا میں اور امام اِس لئے پیغمبر کا معجزہ ہے کہ وہ جو قرآن کی حکمت کو بیان کرے گا کوئی نہیں کر سکے گا، اور اِس کو ہم سب باور کریں گے، سب باور کریں گے کہ اسماعیلی مذہب میں یہ ہونا چاہئے اور ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن کو بالکل اسی طرح سے سمجھتے ہوں، اور ایسے بھیدوں کو، اسرار کو، حکمتوں کو پیش کر سکتے ہوں جو کہ دُوسرے لوگ پیش نہیں کر سکتے ہیں، تو یہ قرآن کا معجزہ ہے، امام کا معجزہ ہے ۔

سوال: (قرآن حضرت عثمان کے زمانے میں (Compile) کیا گیا تھا، اور بہت سی ایسی آیتیں ہیں جو اِس سے نکالی گئیں یا ڈالی گئیں، یعنی قرآن (Complete) نہیں ہے ۔اِس کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے ۔۔۔؟)

جواب: یہ ایک امام کی ہدایت ہے اور خصوصی ہدایت ہے ،اِس کا زیادہ سے زیادہ تعلّق جماعت سے ہے اور (General Islamic Point of View) سے نہیں ہے خصوصی ہدایات میں سے ہیں، اور خصوصی ہدایات میں سے ہونے کے باوجود اِس ہدایت کی روشنی میں ہم امام کی ذات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں، اور اگر یہ نہ بھی ہو تو

ایک حقیقی اسماعیلی ہر حالت میں امام کو ترجیح دیتا ہے، یہ حقیقت اپنی جگہ پر دُرست ہے، لیکن اِس کے باوجود اِس ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قرآن جو کچھ بھی ہے، جہاں تک بھی ہے اُس کے سمجھنے سے ہم دستبردار ہو جائیں۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے اِس کا مقصد صرف یعنی امام کی امامت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دینے سے متعلّق ہے اور بس، اور اِس کی تصدیق کے طور پر میں امام کے اُن ارشادات کی طرف اشارہ کروں گا جن میں امام نے فرمایا تھا: ''کہ اگر تم میں قرآن سمجھنے کی اہلیت ہوتی یا دس یا تین آدمی ہوتے تو میں اُن کو قرآن سے سمجھاتا کہ کس طرح تمہارے دین کا اِس میں ذکر ہے اور تمہارے امام کی تعریف کس طرح سے ہے'' (کلامِ امامِ مبین حصہ اوّل۔ زنجبار ۱۳۔ ۷۔ ۱۸۹۹) مفہوم ایسا ہے لیکن صحیح (Words) مجھے یاد نہیں ایسا فرمان بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام چاہتے ہیں کہ دانشمند ہوں تو اُن کو قرآن سے ثابت کر کے بتائیں۔ اِن دونوں ارشادات کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ امام کی امامت کی اہمیت اپنی جگہ پر صحیح ہے اور یہ جو ہدایت ہے وہ بھی صحیح ہے، تاہم بحیثیت ایک مسلمان کے مسلمانوں کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے مصلحتاً ہمیں قرآن کو ماننا ہے اور ماننا پڑتا ہے، اور چونکہ امام نے جو ہمیں قرآن سے عبادت مقرّر کی ہے اور ہماری بہت سی اسلامی روایات قرآن کے موافق ہیں وغیرہ، اِن تمام چیزوں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو امام کے اِس ارشاد کو اپنی جگہ پر صحیح مانتے ہوئے بھی ہم قرآن سے رُجوع کرتے ہیں اور رُجوع کرنے کے لئے بھی ہمیں امام چاہیے، لہٰذا اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ قرآن جو کچھ بھی ہے اُس کو پڑھنا چاہئے اور یہ بات صرف قرآن کے لئے نہیں ہے، اِس سے زیادہ بگاڑ توریت، انجیل اور دُوسری آسمانی کتابوں میں آگئی ہے۔ اِس کے باوجود توریت کا ذکر آتا ہے، انجیل کا ذکر آتا ہے اور زبور کا ذکر آتا ہے، تو یہ بات دُرست ہے امام نے جو کچھ فرمایا ہے اور اِس کی مثالیں ہمارے سامنے بھی ہیں، کہ انہوں نے جو کچھ کام کیا ہے اُس میں جزوی طور پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کے اندر کافی انہوں نے مجبوریاں کھڑی کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر علامتوں کو لیجئے، علامتوں کو آپ نے دیکھا ہے کہ یہ علامتیں کس نے مقرّر کی ہیں؟ لوگوں نے مقرّر کی ہیں، بعض جگہوں میں تین تین علامتیں ہیں، ایک سب سے نیچے ہے، ایک اُس کے اُوپر ہے، ایک اُس کے اُوپر ہے، اِس سے کیا ثبوت ہوتا ہے؟ کچھ لوگوں نے قرآن پر ریسرچ کر کے اپنی عربی کے مطابق ایک علامت مقرّر کی تھی، دُوسرے طبقہ نے دُوسری علامت اُس کے اُوپر ڈالی، کہا کہ نیچے والی جو علامت ہے وہ (Cancel) اور جو میں نے یہ علامت مقرّر کی ہے اِس پر عمل کیا جائے اور تیسرے طبقے نے تیسری علامت مقرّر کر کے اِس کے اُوپر رکھا، وہ نکال نہیں سکتا تھا اگلی علامت کو، اُس کو بحال رکھا لیکن اتنا کیا کہ اُس کو اُوپر رکھا، اُس نے یہ ظاہر کیا کہ جو نیچے علامتیں ہیں وہ (Cancel) اور جو سب سے اُوپر علامت ہے اُس کے مطابق قرآن پڑھا جائے اور اِس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قرآن کے اندر علامت ایک چھوٹی سی چیز ہے، لیکن اُس کا دخل ہے، عبارتوں سے اور ٹھہرنے سے اور نہ ٹھہرنے سے، نہ ٹھہرنے میں تو اگلا حصّہ اور پچھلا حصّہ مل جاتا ہے، اِس کے کچھ اور

معنی بنتے ہیں، بعض جگہوں میں، اور نہ ملانے سے اور الگ الگ رکھنے سے کچھ اور مطلب بنتا ہے، جیسا کہ: وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳:۷)، وہ یہاں پر رُکتے ہیں، وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ، یہاں پر رُکتے ہیں، تا کہ اِس کو وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کے ساتھ نہ ملائیں، اِس کو پیچھے ہٹائیں، دیکھا یعنی علامتوں کے مقرر کرنے سے کیا نقص پیدا ہوتا ہے، وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ اِس کو انہوں نے مکمّل (Sentence) قرار دیا اور اِس کے اندر (Full Stop) رکھا اِس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی تاویل کوئی نہیں جانتا ہے، (Full Stop) میں آپ یعنی آگے آپ نہیں جا سکتے ہیں اُن کے مطابق لیکن ہمارے پیروں نے، بزرگوں نے کہا کہ (Full Stop) انہوں نے غلط لگایا ہے وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳:۷)، اِس کے ساتھ ملا ہوا ہے، قرآن کی تاویل کوئی نہیں جانتا ہے سوائے خدا کے اور سوائے اُن لوگوں کے جو علم میں پختہ کار ہیں، یہ (Sentence) کا حصّہ اِس کے ساتھ آنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے یہاں پر ایک دیوار کھڑی کر دی، ایک (ط) مطلق کو رکھا، تو میں یہ اِس سلسلے میں بات کرتا ہوں کہ قرآن کے اندر دخل ہوا ہے اور اِس کے علاوہ بھی مثالیں ہیں، یہ چیز اپنی جگہ پر صحیح ہونے کے باوجود ہمیں قرآن سے دستبردار ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور وہ دو طرح سے ہے، ایک اِس لئے کہ ہمیں قرآن سے اپنی حقیقتوں کو سمجھنا ہے، اِس موجودہ قرآن میں بہت گنجائش ہے کہ اِس میں امام کے بارے میں، اسماعیلی مذہب کے بارے میں حقائق ملتے ہیں، ثبوت ملتا ہے، دلیلیں موجود ہیں، اور دُوسرا اِس لئے کہ جب ہمارے بھائی مسلمان قرآن کی بات کرتے ہیں تو ہمیں بھی قرآن جاننا چاہئے کہ وہ کہاں کی بات کرتے ہیں کس طرح بات کرتے ہیں، تو اُن کو اِس سے جواب دینا ہے، کیونکہ ہمارے اور اُن کے درمیان اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے، ہم اپنے امام کے فرامین کو اُن کے سامنے پیش کر کے یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا امام یہ کہتا ہے، وہ کہیں گے کہ تمہارا امام جو کچھ کہتا ہے وہ تمہارے لئے ہے تم بات وہاں سے کرو، اُس چیز سے کرو جو تمہارے اور ہمارے درمیان (Common) ہے۔ ہم اگر کہتے ہیں کہ ہمارے پیر نے یہ فرمایا ہے وہ کہیں گے یہ تمہارے گھر کی بات ہے، تمہارے ماں باپ کی باتیں کسی جج کے سامنے چل نہیں سکتیں، تمہارے ماں باپ کو تمہارے (Case) میں کوئی گواہی کے لئے نہیں بلایا جائے گا، تو یہ انصاف نہیں ہے کہ ہم اپنے باپ کو گواہی کے لئے (Case) میں لے جائیں اور ماں کو لے جائیں، تو ظاہر ہے کہ ہمارے والدین ہمارا (Favour) کریں گے، لیکن ایسی چیز لینی ہوگی جو کہ اُن کے اور ہمارے نزدیک (Common) ہے، مشترک ہے اور وہ قرآن ہے، اور اگر ہم قرآن کو لے کر یہود اور نصاریٰ کے ساتھ بحث کرنا چاہیں گے تو وہ نہیں مانیں گے اور اُن کی انجیل اور توریت کو ہم نہیں مانیں گے۔ وہ ہماری کتاب کو نہیں مانیں گے اِس مقام پر عقلی دلائل سے کام لینا ہوگا اور ہر مقام کے لئے، اگر ہم ایک اسماعیلی سے بات کرتے ہیں تو بے شک امام کے فرامین سے چل سکتا ہے، اور پیروں کے ارشادات سے چل سکتا ہے، مگر جب مسلمانوں کی سطح پر بات کرنا شروع کریں گے تو اُس

میں قرآن اور حدیث کو لینا ہوگا، اور دُوسرے لوگوں سے بات کرنے کے دُوسرے ذرائع ہیں تو وہ قرآن کو نہیں مانیں گے اُن کے اور ہمارے درمیان منطق اور (Logic) اور فلسفہ اور عقلی دلائل یہ چیزیں (Common) ہیں، اور اِن سے یعنی بات کرنی ہوگی اور اگر وہ ہمارے قرآن کو تسلیم کرتے ہیں تو ہمیں انجیل کو بھی تسلیم کرنا ہوگا، توریت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا لیکن اِس میں وہ تسلیم نہیں کریں گے اور ہم بھی نہیں کریں گے، تو اِس لئے قرآن کے جو حقائق ہیں اُن کا سمجھنا ضروری ہے۔

سوال: (علّامہ صاحب پاکستان کے ہمارے اسماعیلی بھائی اور بہنوں کو قرآنِ کریم سکھانے کے لئے، سمجھانے کے لئے آپ لوگوں نے کیا کیا طریقے اپنائے اور وہی طریقے اگر ہم ادھر بھی اپنائیں تو، اِس کے بارے میں آپ کچھ بتائیں گے، یا کیا کچھ ہو رہا ہے وہاں پر؟)

جواب: تو وہاں بھی البتہ پہلے بہت کچھ کم [کام] ہوا تھا بعد میں ہماری بیٹیوں اور بیٹوں کو کالج، یونیورسٹیوں میں دقّت پیش آئی اور بعض دفعہ اُن کو فیل کیا گیا کہ قرآن کے (Subject) میں تم کمزور ہو وغیرہ، تو پھر نتیجے کے طور پر تھوڑی بہت کوشش کی گئی اور اِس کے علاوہ وہاں گورنمنٹ نے عربی زبان کو اہمیت دی ہے اور جس کی وجہ سے کسی قدر وہ عربی سے نزدیک ہو رہے ہیں، اور اِس کے علاوہ البتہ نائٹ اسکولوں میں یا اسماعیلیہ ایسوسی ایشن کے تحت جس حد تک ہو سکے وہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ عربی سے قریب ہو جائیں، تاہم خاطر خواہ کوئی کام وہاں بھی نہیں ہے، تو اِس کے لئے جو ادارے ہیں ہمارے وہ بہتر سوچ سکتے ہیں، اِس کے لئے ذرائع، وسائل ہیں قرآن کو سمجھنے کے لئے، قرآن پر (Literature) ہو سکتا ہے، قرآن پر لیکچرز بھی ہو سکتے ہیں، اور قرآن کی تفسیر ہو سکتی ہے، تاویل ہو سکتی ہے،، بہت کچھ ہو سکتا ہے، کوئی بات ناممکن نہیں ہے،، بہت ہی ممکن ہے۔

اِس کے لئے یہ گزارش ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اِس اختلاف کے پس منظر کو دیکھنا چاہئے جس کو آپ (Background) کہتے ہیں، اور وہ پس منظر ہم کو وہاں ملے گا کہ مسلمان جو مسلمان ہوئے رسول اللہؐ کے زمانے میں وہ کس طرح ہوئے، آیا وہ سب کے سب دل و جان سے مسلمان ہوئے یا اُس میں کچھ غرض مند لوگ بھی موجود تھے۔ جب ہم اِس (History) تک نظر دوڑاتے ہیں تو وہاں پر ہم کو مختلف طبقات کے لوگ نظر آتے ہیں،، بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جو سچّے دل سے مسلمان ہوئے، اِس کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں، جو کہ اُن کو خوف ہوا کہ اگر وہ اسلام نہ لاتے تو وہ لُٹ جاتے، اُن کی اولاد اور جان اور مال سب لُٹ جاتا، لہٰذا وہ ڈر کے مارے پناہ لینے کی خاطر مسلمان ہوئے، اور ایک اور طبقہ ملتا ہے جس کی نظر دُنیا کی سیاست، رئیسی، سرداری، کسی گاؤں کا والی ہو جانا یا مالِ غنیمت سے لینا وغیرہ، فتوحات کو دیکھا، پیغمبر کی کامیابی کو دیکھا تو اندھا دھند انہوں نے اسلام دُنیوی فائدے کی خاطر قبول کیا، وغیرہ، وغیرہ، اور کچھ لوگ اُس اسلام کے اندر فتور پیدا کرنے کے لئے منافقانہ طور سے اسلام میں گھسے اور یہ نقص باقی رہا، چونکہ پیغمبر کی دانشمندی اور

معجزہ یہ تھا کہ اُن تمام لوگوں کو آنحضرتؐ نے (Cover) کیا تھا اور ایک ہی نظام پر قائم رکھا تھا، اور یہ نقص باقی تھا کہ ۲۳ سال کی مدّت کے بعد آنحضرتؐ رُحلت کر گئے، جب رُحلت کر گئے تو اُس میں سے جو پہلے ہی سے اُن کے درمیان، اُن کے دلوں میں کھوٹ تھا، وہ لوگ سچّے دل سے مسلمان نہ رہے، چونکہ [وہ] مسلمان نہیں تھے تو انہوں نے اپنی غرض کو پھر شروع کیا، جو رسول اللہؐ کے زمانے میں نہیں کر سکتے تھے، ظاہر ہے نا کہ یعنی یکا یک منتشر کیوں ہو گئے؟ قرآن کی وجہ سے یا اسلام کی وجہ سے یا اپنی مصلحت کی بنا پر متحد کیوں نہیں ہوئے؟ اِس لئے نہیں ہوئے کہ اُن کے باطن میں، سب کے باطن میں اسلام کی محبّت نہیں تھی، بہت تھوڑے لوگ تھے جو سچّے مسلمان تھے، باقّی کی میں نے بات کی کہ [وہ] مختلف وجوہات پر مسلمان ہوئے تھے وہ اسلام کو نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا وہ سیاست میں گئے اور انتشار ہو گیا۔ اب اسی بنیاد سے اور وہیں سے اختلاف کی بنیاد پڑی درمیان میں آگے چل کر نہیں بلکہ رسول اللہؐ کے زمانے سے کہئے اور اُس اگلی حالت کو پچھلے اختلاف کے ساتھ ملا کر آپ مانیے کہ یہ رسول اللہؐ کے زمانے میں جو چیز دل میں تھی وہ رسول اللہؐ کی رُحلت کے بعد ظاہر ہو گئی اور اختلاف وہاں سے شروع ہوا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو رسول اللہؐ کے منشاء کے مطابق وہ کسی ایک مرکز پر یا قرآن کی وجہ سے یا امام کی وجہ سے یا کسی خلیفہ کی وجہ سے وہ ایک ہو جاتے، اُن کو ایک ہونا چاہئے تھا تو اُن کے دل میں جو کدورت تھی، جو مخالفت تھی یا جو اسلام کی حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے اُس کی وجہ سے وہ مختلف ہو گئے اور دُوسری وجہ اِس کی یہ ہے کہ جو لوگ کسی حد تک اسلام کو قبول بھی کرتے تھے تو انہوں نے معلّم قرآن کے ذریعے سے قرآن کو نہیں سمجھا بلکہ انہوں نے ذاتی طور پر قرآن کو سمجھنے کے لئے کوشش کی اور قرآن کی دو زبانیں تھیں۔ قرآن کی دو زبانیں تھیں، ایک زبان عربی زبان تھی اور دُوسری زبان حکمتی زبان تھی جو خدا کی زبان تھی، وہ عربیوں کی زبان نہیں تھی، اور یہ خدا کی وہ زبان تھی جو ہر زمانے میں وہ استعمال کرتا ہے۔ خدا کی ایک مخصوص زبان بھی ہوتی ہے، اُس کو آپ فلسفے کی زبان کہیے یا حکمت کی زبان کہیے، ہم تو اُس کو حکمت کی زبان کہیں گے تو وہ عربی زبان کو تو سمجھتے تھے، اور حکمتی زبان کو تو وہ نہیں سمجھتے تھے، اور انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ قرآن کے اندر عربی کے علاوہ بھی کوئی زبان ہے، وہ وحی کی اور حکمت کی زبان تھی انہوں نے اُس کو نہیں سمجھا اور ہر چیز کو اپنی زبان میں قبول کرنے لگے، لہٰذا حکمت تک، قرآن کے باطن تک اُن کی رسائی نہیں ہوئی اور یہیں سے اختلاف ہو گیا اور مختلف تفسیریں ہونے لگیں۔

آپ جیسا کہ جانتے ہیں [کہ] دُنیا میں جو چیز سب سے بہترین ہوتی ہے اور اگر اُس کو غلط استعمال کیا گیا تو سب سے مضر وہی چیز ہوتی ہے، کسی طعام کو، کسی غذا کو لیں، جب کسی غذا کی (Overeating) ہوتی ہے تو وہ چیز جس میں کہ پرورش تھی ہلاکت کا باعث بنتی ہے، تو قرآن ہی سے لوگ ہلاک ہونے لگے، قرآن ہی سے ہلاک ہونے لگے۔ آپ مثنوی کو دیکھیں! انڈیکس کو لیں وہ ایک مولوی ہے، وہ ایک قاضی تھا، وہ ایک صوفی ہے اور قرآن کے پیچھے مر مٹنے والا تھا، قرآن

کے بارے میں کیا تاثر ہے اُس کا، یہ قرآن کی کوئی غیبت نہیں ہے، نعوذ باللہ منھا، یہ لوگوں کی غیبت ہے، یہ قرآن سے کتنے کتنے اختلافات پیدا ہو گئے، جو چیز وحدت کا ذریعہ ہے، اُس کو اگر نہیں سمجھا گیا تو اُس کی وجہ سے کثرت اور انتشار بھی ہوسکتا ہے، آپ ایک چیز کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، آپ کا مقصد ہے کہ اِس کی وجہ سے (Unity) پیدا ہو اور اب اگر اُس میں اختلاف ہوتا ہے تو وہی چیز جس کو آپ نے نیک نیتی سے پیش کیا تھا کہ (Unity) اسی سے ہو اور وہ بالکل ممکن تھی اور ہو سکتی تھی، تو لوگ اُس کو نہیں سمجھتے ہیں، تو اُس پر جھگڑے کرتے ہیں تو وہی چیز اُن کی وجہ سے انتشار اور اختلاف کا باعث بن سکتی ہے۔ اسی طرح قرآن جو وحدت کا مرکز تھا، اُس کو نہیں سمجھا اور پھر لوگ اختلاف کرنے لگے، یہ سب کچھ اِس لئے ہوا کہ انہوں نے خدا کے منشاء کے مطابق کام نہیں کیا، تو ظاہر ہے کہ جو لوگ خدا کے منشاء کے مطابق کام نہیں کریں گے تو وہ گمراہ ہو جائیں گے، خدا کا منشاء یہی تھا جو ابھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا، کہ قرآن کو خدا کے اُس بھیجے ہوئے نور کی روشنی میں پڑھا جائے، ایسا نہیں کیا گیا۔

ٹرانسکرئب وٹائپ: نجمہ بیگ　　پروف: نسرین اور اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: نورِ قرآن

کیسٹ نمبر: Q-3A   تاریخ: ۳۱ر دسمبر ر ۱۹۷۷ء، کینیڈا

Click here for Audio

۔۔۔۔اسماعیلیہ ایسوسی ایشن اور یہاں کی جماعت کا کہ مجھے موقع ملا، اور میں قرآن کی اِس روشنی کو آپ ایسے روشنی کے میناروں کے طرف منتقل کررہا ہوں۔ اِس ذمہ داری کے ساتھ کہ آپ اِن باتوں کو ذہن نشین کرلیں گے، اور زندگی کے آخر تک آپ اپنی جماعت میں رہتے ہوئے بہت سارے اسماعیلیوں کو وقتاً فوقتاً یہ روشنی دیتے رہیں گے، تو آپ کا اور ہمارا بہت بڑا مشن کامیاب اور مکمّل ہوجائے گا۔ اِس لئے میں آپ میں سے ہر ایک کو ہزاروں کے رنگ میں دیکھتا ہوں کیونکہ ہر ایک کے پیچھے ہزاروں ہیں، کیونکہ ہر ایک ہزار کو دے سکتا ہے۔ اِس حساب سے میں اِس حال میں بہت کچھ دیکھتا ہوں اور بہت کچھ سمجھتا ہوں۔ جبکہ (Future) کو دیکھیں مستقبل کو یاد کریں، تو اِس اظہارِ خوشی کے بعد میں اپنے اصل کام کا آغاز کرتا ہوں۔

بڑا دلچسپ پوئنٹ ہے آپ کو خوشی ہوگی کیونکہ ہم نے قرآن کا جائزہ لینا ہے، ہم نے آپ نے مل کر قرآن کا جائزہ لینا ہے، دیکھنا ہے کہ قرآن کا جو رُخ ہے وہ کس طرف کو ہے؟ قرآن کی جو روشنی ہے وہ کس طرف کو زیادہ سے زیادہ جارہی ہے؟ آیا قرآن کی روشنی اسماعیلی مذہب پر پڑرہی ہے یا غیر اسماعیلیت پر؟ یہ دیکھنا ہے۔ تو چلئے ایک بہت ہی اہم آیت کو لیتے ہیں، آیت کچھ اِس طرح سے ہے، یہ سورۂ انفعال کی آیت ۶۰ ہے یعنی (۶۰:۸) جس میں خداوندِ تبارک وتعالیٰ اُس زمانے کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر ارشاد فرماتا ہے کہ "اے مسلمانوں! تم اسلام کے دشمن کے (Against) اپنا (Power) جو کچھ تم سے ہوسکتا ہے تیار کرنا، اور اصطبل میں گھوڑوں کو بھی تیار کرکے رکھنا تاکہ خدا کا دشمن اور تمہارا دشمن ڈر جائے" [وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ] اب آپ آرام سے اور سکون سے اِس آیت کی تحلیل کریں، آیت کا مفہوم انگلش میں یہ ہے میں ٹوٹی پھوٹی زبان میں پڑھتا ہوں،

"Against them make ready your strength to the at most of your power including steeds of war to strike terror into the hearts of the enemies of

God and you enemies."

یعنی اُن دشمنوں کے خلاف جو اسلام کے دشمن ہیں اُن کے خلاف جنگ کرنے کی تیاری کے طور پر اپنے (Power) کو تیار کر کے رکھنا، اور جنگی گھوڑوں کو بھی تیار کر کے رکھنا تا کہ خدا کا دشمن اور تمہارا دشمن مرعوب ہو جائے، بھاگ جائے، یہ ہے آیت [کا ترجمہ] ۔ اب اِس کے فلسفے کے اندر جانا ہے ہم دیکھیں گے جس طرح کوئی سائنسدان مائیکرو [اِسکوپ] سے یا دُور بین سے کسی چیز کے اندر دیکھتا ہے اِسی طرح ہم دیکھیں گے اور فلسفیانہ انداز سے یا کہ حکمت کے طور پر اِس آیت کے اندر جا کر اِس کو دیکھیں گے کہ یہ آیت حکمت کی زبان سے کیا کہتی ہے؟ اِس میں دو باتیں ہیں، ایک تو خدا نے یہ فرمایا کہ تم سے جو کچھ ہو سکے اپنے (Power) کو تیار رکھنا، اِس میں (Limited) نہیں ہے، اِس میں وہ تمام ہُنر اور وہ تمام سائنس شامل ہے جو زمانے میں وُجود میں آتی ہے، اور دُوسرا حکم گھوڑوں کے بارے میں ہے کہ تم گھوڑوں کو بھی تیار رکھنا۔ دیکھا آپ نے کہ اگر ہم اِس آیت کو اسی طرح سے لیں جس طرح کہ یہ موجودہ صورت میں ہے، تو عجیب بات ہوگی اور خصوصاً ہماری نئی نسل کو اِس میں بڑا تعجّب ہوگا، کہ دُوسری قوموں میں کتنی تڑپ ہے جنگ کے لئے، جنگ جیتنے کے لئے، (Defence) کے طور پر، احتیاط کے طور پر [اُن کے پاس] کتنے ہتھیار ہیں، اور قرآن کے اندر اِس سلسلے میں جنگ کے لئے، دفاع کے لئے، جہاد کے لئے جو کچھ حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تم گھوڑوں کو تیار کرو۔

اب اِس کے لئے یا تو یہ کہنا پڑے گا، کہ اِس آیت کا تعلّق اُس زمانے سے ہے کیونکہ اُس زمانے میں، رسول اللہؐ کے زمانے میں، عرب میں جو کچھ ہوتا تھا وہ یہی ہوتا تھا، کہ گھوڑوں کی ضرورت ہوتی تھی اور دُنیا زمانے میں گھوڑوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں تھی۔ اِس لئے یہ حکم اُس زمانے کے موافق ہے یا تو یہ کہا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ اِس کے اندر تاویل ہے، حکمت ہے، گھوڑے سے کوئی ایسی چیز مُراد لینی ہوگی جو دُنیا زمانے میں جنگ کے لئے کام آتی ہو یا یہ کہنا ہوگا، اور آپ دیکھتے ہیں کہ اِس فلسفے کا رُخ کس طرف کو ہے دونوں صورتوں میں اسماعیلی مذہب کا (Favour) ہوگا، دونوں صورتوں میں۔ اگر کہا جائے کہ قرآن کے کچھ احکام جو ہیں وہ اُس زمانے کے موافق ہیں تو یہ بات بھی اسماعیلی مذہب کے موافق ہے، اگر کہا جائے کہ اِس کے اندر تاویل ہے، حکمت ہے جو کہ [یعنی] قرآن کی تشریح زمانے کے موافق ہو سکتی ہے، اگر یہ کہا جائے اِس بات کو مانا جائے تو بھی اسماعیلی مذہب کا (Favour) ہوگا، اور اِس میں دُوسرے لفظ میں بھی خدا نے جو حکم دیا وہ (Limited) نہیں ہے [بلکہ] (Unlimited) ہے، جو فرمایا کہ جو تم سے ہو سکتا ہے طاقت کو تیار کرنا، پھر اِس کے اندر (Atom) بنانے کی اجازت ہے، جہاز بنانے کی اجازت ہے، میزائل بنانے کی اجازت ہے، اور وہ سب کچھ کرنے کا حکم ہے اِس کے اندر جو کہ اب دُوسری قوموں نے کیا ہے، کیا یہ نہیں ہے؟ اِس تشریح میں کچھ شک ہے، میں تو ایسا سمجھتا ہوں خدا نے جو فرمایا تم ہر وہ طاقت اپنے پاس تیار رکھنا جو تم سے ہو سکتا ہے۔

"Against them make ready your strenght to the utmost". (Strength) سے یہ مُراد نہیں ہے کہ تم کُشتی لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، یہاں مُراد دشمن کو شکست دینا ہے، یہاں مُراد دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے، یہاں مُراد غیر مسلم جو کچھ کرتا ہے اُس سے بڑھ چڑھ کر تیاری کرنا ہے، تو اگر اِس آیت کی تشریح ہمارے مُلّا مولوی سمجھ پاتے تو آج مسلمان قوم بہت آگے ہوتی، بہت ترقّی پر ہوتی۔ اِس آیت کو سامنے رکھنا بعد میں بھی اپنے طور پر (Discuss) کرنا یہ اِس میں کتنی صداقت ہے، کتنی حقیقت ہے، اور یہ دُنیا زمانے میں امام [کے] حیّ و حاضر ہونے کی طرف کس طرح اشارہ کرتی ہے، اور کن حکمتوں سے اسماعیلی مذہب کا (Favour) کرتی ہے، اس آیت پر آپ اپنے طور سے سوچ لینا، اور میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے مُلّا مولویوں نے اسلام کو ایسا ہی رکھا جیسا کہ اِس کے اندر ترقّی کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اور حالانکہ یہ قرآن آپ کے سامنے ہے، قرآن کہتا ہے کہ اگر دُنیا ترقّی کرتی ہے، دُوسرے لوگ ترقّی کرتے ہیں کوئی چیز بناتے ہیں، کوئی ایجاد کرتے ہیں، کوئی ہتھیار تیار کرتے ہیں تو تم بھی کرو، اُن سے بڑھ چڑھ کر کرو اگر اِس حکم پر شروع ہی سے رسول اللہؐ کے زمانے کے بعد سے عمل ہوتا تو البتہ مسلمان بھی ترقّی کرتے اور آج مسلمان قوم کو زوال نہ آتا۔ ہمیں افسوس ہے کہ آج جن لوگوں نے قرآن سمجھنے کا دعویٰ کر رکھا ہے اُن کا یہ حال ہے، اُن کا یہ حال ہے۔

ہم آپ کو صرف چابی، (Key) دیتے ہیں، طریقہ بتاتے ہیں آرام سے قرآن کو کھولیں، عربی میں نہ صحیح انگلش کے ترجمے میں صحیح، آپ اس پر اچھی طرح سے غور کریں، اور دیکھیں کہ ہم جو آج باتیں کرتے ہیں وہ کس حد تک صداقت پر مبنی ہیں، اور اُن میں کتنی سچّائی ہے کہ قرآن کے اندر کتنی گنجائش ہے زمانے کے موافق کرنے کے لئے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم بالکل اُسی طرح سے ہے جس طرح کہ اِس کا ظاہر ہے، اور گھوڑوں کو تیار کریں تو گھوڑوں سے کیا بنے گا؟ اگر گھوڑوں سے صرف گھوڑے ہی مُراد لیں تو اِس سے کیا بن سکتا ہے؟ اِس لئے کہا کہ امامِ زمان معلّمِ قرآن ہیں جو کہ زمانے کے مطابق حکم دیتے ہیں، اور دُوسری بات آپ کو [یہ] معلوم ہونا چاہئے کہ اگر یہاں گھوڑے سے کچھ بھی سامانِ جنگ مُراد لیں، سامانِ جنگ، میزائل، جہاز، راکٹ اور دیگر سامان مُراد ہیں تو پھر یہی ترمیم دُوسرے احکام میں بھی ہوگی، یہی (Amendment) دُوسرے احکام میں بھی ہو سکے گی۔ روزہ سے تقویٰ سے پرہیزگاری مُراد ہوگی، اور جہاد سے یہ مُراد ہوگا کہ وہ جہاد علمی صورت میں بھی ہو مالی صورت میں بھی ہو، ہُنر میں بھی ہو، کسی بھی صورت میں ہو، جہاد معنی جدوجہد کرنا اور دُوسروں سے آگے بڑھنا۔ اِن تمام خداوندی احکام میں جہاں ضرورت ہو دُوسری طرح سے تشریح کرنے کی ضرورت ہوگی کیا یہ غلط ہے؟ وہی جہاد کام آئے گا! نہیں! زمانے میں جس چیز کی ضرورت ہو، اور جس طرح اسلام کی حفاظت ممکن ہو، اور جس طرح دُوسرے لوگوں سے آگے بڑھ کر اپنے دین کو ترقّی دینا ممکن ہو، اُسی طرح سے تشریح ہوگی، اور ہر بات میں یعنی نئے سرے سے، اور نئی روشنی کے موافق قرآن کا سمجھنا ضروری ہوگا۔

اِس کے بعد خدا نے فرمایا ہے اُسی سورہ انفعال میں جو آٹھویں سورہ ہے اور آیت ۶۵ ہے، ''اگر تم میں سے صبر کرنے والے بیس (۲۰) ہوں تو دوسو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے'' [یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ] کیا فرمایا خدا نے؟ مسلمانوں سے فرمایا کہ اگر تم میں سے بیس (۲۰) آدمی ہوں مجاہد، سپاہی، لشکری تو دشمن کے دو سو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے۔ اِس میں مسلمان دس (۱۰) اور غیر مسلم سو (۱۰۰) اور اگر یہ بیس (۲۰) ہیں تو وہ دوسو (۲۰۰)، اِس حساب سے مسلم سپاہی کتنے غیر مسلم سپاہیوں کے برابر ہوا؟ ایک دس (۱۰) کے برابر [ہوا]۔ ایک (Cover) کرتا ہے دس (۱۰) کو اور دس (۱۰) (Cover) کرتے ہیں سو (۱۰۰) کو اور بیس (۲۰) (Cover) کرتے ہیں دوسو (۲۰۰) کو اچھا! تو میں سوال کر سکتا ہوں جن کو یقین ہو وہ ہاتھ اُٹھائیں، یقین [یعنی] ایسا یقین عقیدہ نہیں کہ پوری طرح سے امکانیت [ہو]، کیا ایک مسلم سپاہی اِس زمانے میں اِن ہتھیاروں کے ساتھ جو کچھ بھی ہے اس صورتِ حال کے مطابق ایک مسلمان سپاہی دس (۱۰) غیر مسلم سپاہیوں کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے؟ اگر کر سکتا ہے تو آپ [میں سے] جن جن کو یہ باور ہو اور کہتے ہیں کہ کر سکتا ہے تو وہ ہاتھ اٹھائیں، اچھا! تو جن حضرات کا خیال ہے کہ آج کے زمانے میں اِن ہتھیاروں کے ساتھ ایک سپاہی دس (۱۰) کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا ہے، ایک مسلم سپاہی دس (۱۰) یہودیوں کے ساتھ، دس (۱۰) غیر مسلم کچھ بھی ہوں اُن کے ساتھ جنگ میں مقابلہ نہیں کر سکتا ہے جن کو یہ خیال ہو وہ ہاتھ اٹھائیں۔ ہاتھ اٹھائیں کوئی بات نہیں ہے، یہ دلچسپی ہے، اچھا! ٹھیک ہے! تو صحیح بات ہے، اگر خداوندِ عالم قطعی معجزہ چاہتا اور قطعی (Miracle) دکھانا چاہتا، تو اُس میں دس (۱۰) بھی نہ ہوں، خدا کچھ اُن لوگوں پر کوئی ہَوا بھیجے، کوئی بارش برسائے، کوئی بھونچال، زلزلہ اُن پر بھیجے تو اُن کو تباہ کرے، اگر ایسا نہیں ہے قانونِ فطرت کے مطابق، ہمّت سے کام لینا ہے اور ہتھیار سے کام لینا ہے، حوصلے سے کام لینا ہے اور آخرت کی اُمید پر سختی کے ساتھ لڑنا ہے تو وہ بات صحیح ہے کہ اگر بیس (۲۰) آدمی ہوں اچھی اُن کو ٹریننگ دی گئی ہو، اُن کے حوصلے بلند ہوں اور ہتھیار دونوں طرف سے برابر ہوں تو عجب بات نہیں ہے کہ بیس (۲۰) آدمی دوسو (۲۰۰) پر غالب آئیں۔

یہاں خداوندِ عالم نے کوئی معجزے کی بات تو نہیں کی، بلکہ حوصلے کی بات کی، تربیت کی بات کی اور زمانے سے فائدہ اُٹھا کر کام کرنے کی بات کی، اور آخرت کی اُمید، ثواب کی اُمید، اِن چیزوں کو سامنے رکھا تا کہ اِس تصوّر سے مسلمان لڑیں تو کیا وجہ ہے، اب کیا کرنا ہوگا؟ خدا نے تو یہ فرمایا ہے، اور یہ قرآن کا ارشاد ہے، اب اِس کے لئے ہم کیا تصوّر کریں گے؟ یا تو یہ کہیں گے کہ ہم اب وہ مسلمان نہیں رہے جو رسول اللہؐ کے وقت میں تھے یا یہ کہیں گے کہ قرآن کے بعض احکامات زمانے کے موافق ہوا کرتے ہیں اِن دونوں میں سے ایک بات تو کرنی ہوگی اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آپ نے میری بات کو سمجھ لیا ہوگا، میں نے گزارش کی کہ اِس میں دو باتوں کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے

کہ یا تو یہ کہیں گے کہ قرآن کے اندر بعض احکامات ہیں، بعض فرامین ہیں، جو کہ اگلے زمانے کے مواد تھے اور وہ اِس وقت مناسب نہیں لگتے، سوائے اِس کے کہ اُن کی کچھ تاویل کی جائے، اُن کی تشریح نئے سرے سے کی جائے یہ کہنا ہوگا یا یہ کہنا ہوگا کہ یہ وعدہ جن باہمّت اور سچّے مسلمانوں سے کیا گیا تھا کہ تم اگر اِس طرف سے بیس (۲۰) ہوتے ہو تو تم کو دوسو (۲۰۰) پر فتح دی جائے گی، خدا کا یہ وعدہ اُن سچّے مسلمانوں سے تھا جو اُس وقت تھے یا یہ کہنا ہوگا کہ ہم صحیح معنوں میں مسلمان نہیں رہے۔ تو دیکھتے ہیں آپ کو قرآن کیا بتلا رہا ہے قرآن کا کیا تقاضا ہے؟ اِس میں یکسر تقاضا یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے قرآن کو جس نور کے ساتھ بھیجا تھا اُس نور کی روشنی میں قرآن کو پڑھا جائے یا یہ کہ معلّمِ قرآن جو امامِ حیّ و حاضر ہیں اُن کی اطاعت میں، اُن کی فرمانبرداری میں اُن کی پیروی میں قرآن سے رُجوع کیا جائے، نہیں تو کچھ بھی نہیں ملے گا، آج مُلّا مولوی لوگ قرآن جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حالانکہ خداوندِ عالم نے وعدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو زمین کی میراث، زمین کی حکومت اور خلافت ملے گی تو کہاں ہے؟ حالانکہ اللہ کا وعدہ سچّا ہے۔

مطلب اِس کا یہ ہوا کہ خداوندِ عالم کسی رنگ میں اپنے وعدے کو پورا کرے گا کوئی قوم اُبھرے گی جو کہ اُس پر یہ وعدہ، خدا کا وعدہ، اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا اور درمیان میں کچھ لوگ بہک جائیں گے، اور میں یہ باتیں اِس لئے کرتا ہوں کہ آپ آج بعض دفعہ سوچتے ہوں گے آپ میں سے کچھ کہ قرآن کی باتیں کرتے ہیں اور اسماعیلیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ قرآن سے ہٹ گئے ہیں، ہم ہٹ گئے ہیں، ہم نہیں ہٹے ہیں، ہم قرآن کے منشاء کے مطابق جا رہے ہیں، قرآن کے منشاء کے مطابق جا رہے ہیں۔ قرآن ایک ندّی کی طرح ہے، ندّی کی جڑیں بادلوں سے شروع ہو جاتی ہیں، تو گویا ندّی آسمان میں بادلوں کے رنگ میں ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر ندّی بارش کے یا برف کے قطروں کی صورت میں اور پھر اُس کے بعد یہ ندّی پہاڑ پر اِسی طرح پھیلی ہوئی ہے جس طرح درخت کی جڑیں زمین میں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، یہ ندّی پہاڑ میں جو ہے (Temperature) کے لحاظ سے بہت ٹھنڈی ہے اور جب ندّی نیچے کو گرتی ہے تو وہ (Close) ہو جاتی ہے اور میدان میں (Plain) میں وہ پھیل جاتی ہے، اور زمین کے ساتھ اُس کا رنگ ہوتا ہے زمین کے ساتھ، مٹّی جیسی [بھی] ہو ندّی کے پانی کا رنگ ایسا ہوتا ہے، اور آگے سے آگے اُس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے، تو اگر قرآن قلمِ الٰہی میں ہے تو کچھ اور رنگ ہے، لوحِ محفوظ پر ہے تو کچھ اور رنگ ہے، آنحضرتؐ پر نازل ہوا ہے تو کچھ اور رنگ ہے، کاغذ پر آیا ہے تو کچھ اور رنگ ہے اور ماضی سے چل کر درمیان وقت میں آیا تو کچھ اور رنگ ہے اور اب اگر قرآن ہے اُس کا بھی کوئی رنگ ہے۔ اِس حکمت کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں اگر وہ سمجھتے ہوتے تو قرآن سے فائدہ اُٹھاتے مطلب یہ کہ اب موجودہ وقت میں امام جو تشریح کرتے ہیں اُسی رنگ میں قرآن ہے، اُسی رنگ میں قرآن ہے، امام کے فرامین کے رنگ میں [قرآن ہے]۔ دیکھا آپ نے یہاں دو مثالیں میں نے پیش کیں اور ریفرینس بھی آپ کو بتایا، آپ اپنے طور پر

سوچیں آپ چاہیں [تو] مثال کے طور پر کسی سے پوچھیں کسی دانشمند مولوی سے پوچھیں وہ اگر آپ کو بتلا سکتا ہے تو بتلائے گا لیکن آپ دیکھ لینا کیا بتلائے گا کچھ بھی نہیں بتلا سکے گا۔ یہی صورتِ حال ہے اِس کی حقیقت اِس کی ذمہ داری اُس ہستی پر عائد ہو جاتی ہے جو معلّمِ قرآن ہے جو نورِ قرآن ہے۔ اِس کے بعد بس اگر تم میں سے سو (۱۰۰) ہوں تو دوسو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے۔ خدا نے دُوسری آیت میں فرمایا کہا کہ تم میں حوصلہ کم ہے اور اِس واسطے میں ہلکا کرتا ہوں جو میں نے فرمایا تھا کہ ایک مجاہد، اسلام کا ایک مجاہد دس (۱۰) پر غالب آئے گا اور بیس (۲۰) دوسو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے تو اب میں نے تخصیص کیا یعنی یہ بوجھ، یہ (Burden) ہلکا کر دیا اور اب ہوگا یہ کہ اگر تم میں سے سو (۱۰۰) ہوں تو ہزار (۱۰۰۰) پر غالب آئیں گے اگر تم میں سے سو (۱۰۰) مجاہد ہوں تو ہزار (۱۰۰۰) غیر مسلم سپاہیوں پر غالب آئیں گے، آخر میں خدا نے یہ فرمایا تھا۔ اب یہ بھی نہیں ہے، تو وہی بات اگر یہی ہے تو دیکھنا ہوگا کہ اِس کی وجہ کیا ہے کیا مسلمان وہ مسلمان نہ رہے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں تھے یا یہ کہ اُن کے آپس میں اختلافات اور تضادات ہیں کہ یہ کہنا ہوگا کہ قرآن کی تشریح زمانے کے موافق ہونی چاہیئے یا یہ کہنا ہوگا کہ قرآن کی تاویلات ہیں اِن تاویلات کی مدد سے تاویلات کی روشنی میں ہم کو قرآن کی صحیح ہدایت مل سکتی ہے میں نے صرف دو مثالیں پیش کی ہیں اور بھی مثالیں ہیں آپ کو بتلاتے ہیں۔

تیسری مثال یہ ہے [کہ] آپ کو قرآن کی بہت سی آیتوں میں غلاموں کو آزاد کرنے کا تصوّر ملتا ہے، غلاموں کو (Slaves) کو، آزادی دلانے کی فضیلت کا ذکر قرآن میں آپ کو ملے گا۔ آپ جانتے ہیں، آپ سُن چکے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں غلام ہوا کرتے تھے، غلام اور کنیز، یہ جنگوں میں ہاتھ لگتے تھے، اسلام کی حمایت میں جنگ کے لئے جب جاتے تھے تو اسلام کے دشمنوں سے جو بھی مال جائیداد اور اُن کی آل، اولاد جو بھی ہاتھ آتا تھا وہ مال لے لیتے تھے اور مردوں کو غلام رکھتے تھے، عورتوں کو کنیز رکھتے تھے دشمن سے لے کر، اور پھر اُن کو وقتاً فوقتاً آزاد کر دیتے تھے جس میں بہت بڑا ثواب تھا، چنانچہ خداوندِ عالم نے بہت سے موقعوں پر قرآن میں فرمایا ہے کہ تم فلان فلان غلطی کی معافی کے لئے یا (Direct) ثواب کے لئے کسی غلام کو خریدو اور اُس کو آزاد کر دو، بار بار قرآن میں یہ حکم آتا ہے لیکن اب ہم دیکھتے ہیں دُنیا جہاں میں اور اسلام میں کوئی غلام نہیں ہے، اِس کے لئے کیا کیا جائے کہ خدا نے جو حکم فرمایا تھا وہ بحال ہے قرآن میں موجود ہے، لیکن سامنے سے کرنے کے لئے وہ کام جو تھا وہ نہیں ہے، اب اِس کے بارے میں کیا تصوّر ہونا چاہیئے، وہی بات ہے یا یہ کہیں گے کہ یہ آیت بھی زیادہ سے زیادہ اُس زمانے سے تعلّق رکھتی ہے لہٰذا اِس کو چھوڑ دیا جائے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن کی ایک آیت کو چھوڑ ایا دُوسری کو تیسری کو تو اسی طرح قرآن کی بہت سی آیتیں اسی طرح رہ جائیں گی، اور اُن پر عمل نہیں ہوگا، یا یہ ہے کہ ہم کہیں گے کہ اِس کے اندر تاویل ہے، اِس سے کوئی نیک کام مُراد لیں گے جو کہ یہ کام امام ہی کر سکتا ہے، اور دُوسرا کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ آپ کے ذہنِ مبارک میں آیا کہ غلاموں کو آزاد کرنے کا تصوّر دیا گیا ہے لیکن اِس دُنیا میں سامنے کوئی

غلام نہیں ہے، کوئی غلام نہیں ہے، یہ کوئی ایک آیت نہیں ہے ایک دو (References) آپ لکھیں، سورہ چار کی آیت بانوے (۹۲:۴)، (۸۹:۵)، وغیرہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، یہ تیسری مثال تھی۔

اب چوتھی مثال سنو بڑی اچھی مثال ہے۔ قرآن میں ذکر ہے کہ تم بھوکوں کو غریبوں کو مسکینوں کو یتیموں کو کھانا کھلانا، یہ مسلمانوں سے کہا گیا ہے یعنی تمہارے مسلم بھائیوں میں سے جو بھوکا ہو اور جو یتیم ہو غریب ہو اُس کی مدد کرنا، اور اُس کو کھانا کھلانا۔ ماشاءاللہ اِس ملک کینیڈا میں بھی بہت سے مسلمان ہیں، آپ ہیں، ہم ہیں دُوسرے ہیں تو یہاں خدا کے اِس حکم پر عمل کرنے کے لئے، خدا کے اِس فرمان کو بجالانے کے لئے آپ کہاں سے ایک غریب اور ایک مسکین کو اور اُس کی حاجت کو پیدا کریں گے؟ کہاں سے پیدا کریں گے؟ میں تو نہیں دیکھتا ہوں کہ کینیڈا میں کوئی کھانا کھانے کا محتاج ہو، کسی گوشے میں کونے میں نہیں ہے، بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں پر کوئی اِس بات کے لئے محتاج نہیں ہے کہ وہ منتظر رہے کھانا کھانے کے لئے۔ آپ ایک وقت کا کھانا اُس کو کھلائیں اور اُسے بڑا کارنامہ سمجھیں، تو رسول اللہؐ کے زمانے میں دُوسرے منصوبے نہیں تھے اسکول، مکتب، ادارے، علم، ہنر یہ وہ بہت سی چیزیں نہیں تھیں لہٰذا ثواب کا جو معیار تھا وہ بہت (Low) تھا بعض باتوں کے لحاظ سے، تو پھر کیا کرتے، یہ نہ کرتے تو اور دُوسری بات اُس وقت بہت سے لوگ تھے عرب کی حالت کچھ ایسی تھی کہ پیٹ بھر کر کھانا کسی امیر کا کام تھا، سب کو یہ سعادت میسّر نہیں آتی تھی۔ دیکھا! کہ وقت زمانہ بدلتا ہے یا نہیں بدلتا ہے، دُنیا کے ممالک ایک جیسے نہیں ہیں، زمانے ایک جیسے نہیں ہیں ہر زمانے کے لئے الگ الگ احکام ہونے چاہئیں۔ اسی طرح کمزوروں کو کھانا کھلایا جاتا تھا، لباس مہیّا کیا جاتا تھا یعنی کپڑے دیئے جاتے تھے اور ایسے چھوٹے موٹے کام کئے جاتے تھے جو کہ آج کل کے زمانے میں وہ چیزیں نہیں ہیں، لیکن ہمارے مولویوں کے پاس وہی تصوّر ہے وہ اِسی کو پکڑے بیٹھے ہیں اور دُوسری کوئی بات اِن کے ذہن میں آتی نہیں، ہمیں افسوس ہے کہ نتیجے کے طور پر اسلام کو زوال آیا۔ یہی وہ باریک باتیں ہیں جن کے نہ سمجھنے سے اسلام میں ترقّی نہیں ہوئی اگر وہ امام کی ہدایت کو سمجھتے اور اسماعیلی تصوّر کو اپناتے اور مسلم ایک ہوتے تو حکومت انہی کے ہاتھ میں ہوتی اور یہ بہت کچھ کر سکتے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مثال میں اگر سب مسلم ایک ہوتے اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے اور قرآن کی تشریح کو جیسا کہ ہونا چاہئے اِس طرح سے کرتے اور سمجھتے تو آج اسلام بہت (Powerful) ہوتا، بہت (Powerful) ہوتا، اور اِن میں یہ انتشار نہ ہوتا اور یہ کسی کے محتاج نہ ہوتے یہ اتنے قوی ہوتے کہ دُنیا کے اہم ممالک میں ہوتے، لیکن افسوس ہے ہمارے مولویوں نے قرآن کو سینے سے لگا تو لیا لیکن اِس کو نہیں سمجھا اور اِس کی قدر نہیں کی، قدر اُس وقت ہوتی جب اِس کی حکمتوں کو اِس کے فلسفے کو سمجھ لیتے اور ہر وقت اِس کو اُونچا کرتے، اُونچا کرنے کا مطلب اِس کی حقیقت کو سمجھتے۔

ایک اور مثال میں بتاتا ہوں کہ سورۂ محمد جو سینتالیسویں (۴۷) سورہ ہے اُس کی آیت نمبر چار (۴) میں ہے بڑی

دلچسپ مثال ہے کہ میں وہ مثال آپ کو بتلا کر بیٹھ جاتا ہوں اور آپ کو ترجمہ سُناتے ہیں لہٰذا توجّہ سے سنیے۔ جب تم جنگ میں کافروں سے ملو تو اُن کی گردنیں مارو، یعنی اسلام کے سپاہیوں سے مجاہدوں سے فرمایا جاتا ہے کہ جب تم میدانِ جنگ میں جاؤ تو اُس وقت کافروں کی اور دشمنوں کی گردنیں مارو، تلوار سے کاٹو اور اُن کو تباہ و برباد کرو، یہ خدا کا حکم ہے [فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷:۴)] کیا اِس حکم پر اِس وقت بھی اُسی طرح عمل ہوسکتا ہے؟ کہ مجاہد اسلام کے مجاہد، کافروں کی گردنیں ماریں اور کافر لوگ گردن کو جھکائیں یا یہ کریں اور ہاتھ میں تلواریں اور گردن کاٹتے چلے جائیں۔

اِس زمانے میں گردن کا سوال کہاں ہے اور دشمن سامنے کہاں آتا ہے؟ وہ تو بہت دُور سے مارتا ہے، میزائل، بم اور توپ وغیرہ، دیکھا آپ نے کہ ہر مثال میں ضرورت پیش آتی ہے اِس بات کی کہ قرآن کی حکمتوں پر، قرآن کی تاویلات پر عمل ہونا چاہیئے اور زمانے کے موافق فقہ جدید بنے اِس کی تشریح ہو، اِس کی تفسیر کی جائے تاکہ قرآن کی جو عزّت ہے قرآن کی جو برتری ہے وہ قائم رہے نہیں تو کچھ وقت کے بعد اِن باتوں تک نئی نسل کی رسائی ہوگی وہ [کیا] سمجھنے لگیں گے اور نہ معلوم کیا مذاق اڑائیں گے، کیا سمجھیں گے حالانکہ قرآن کے اندر بہت حکمت ہے، بہت دُور رَس ہدایتیں ہیں جو کہ اُس نور کی روشنی میں معلوم ہوسکتی ہیں جس کو خدا نے اپنے حضور سے بھیجا اور اسلام کے لئے اُس نور کو مقرر کیا کہ اُس کی روشنی میں قرآن کو سمجھ لیا جائے جب تک لوگ اُس نور کی طرف رُجوع نہیں کریں گے جو قرآن کا نور ہے، جو معلّمِ قرآن ہے، جو قرآنِ ناطق ہے، جو بولنے والا قرآن ہے تو پھر افسوس رہے گا۔ ہمیں یہ باریکیاں اِس لئے جاننا ضروری ہیں کہ ہمارے دل میں کوئی شک نہ ڈال سکے ہم مطمئن رہیں کہ قرآن اور امام دونوں ہمارے لئے ہیں، اور قرآن امام میں ہے اور امام کی تعریف اسی طرح قرآن میں ہے۔ جتنی باتیں میں نے آج شروع سے لے کر اب تک کیں کیا اُس کا فلسفہ یہ نہیں بتلاتا ہے کہ امام دُنیا میں ہے جو کہ قرآن کی تشریح کرسکتا ہے اور قرآن کے حقیقی معنی بتلاسکتا ہے۔ لہٰذا آج ہم نے جو کچھ بھی کہا، اپنے اِس لیکچر کے سلسلے میں وہ سب امام کی تعریف ہے اور اسماعیلی مذہب کی تعریف ہے اب میں ترجمے کے لئے عرض کرتا ہوں۔

میری اُمید ہے کہ اِس لیکچر کے سلسلے میں جو مثالیں آپ کے سامنے دی جاتی ہیں اُن سے آپ مطمئن ہیں اِس لئے میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ اُن مثالوں کی طرف توجّہ دیتے ہوں گے اور اُن سے آپ کو اطمینان ہوتا ہوگا۔ اب ہم اُس کا چند الفاظ میں خلاصہ کرتے ہیں جو کچھ ہم نے کہا تھا اور درمیان میں بار بار میں نے تاویل کی طرف اشارہ کیا تھا تو تھوڑا سا اشارہ کرتا ہوں تاویل کا، وہ یہ کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کرنے کے لئے جو کچھ فرمایا گیا اور آج کے زمانے کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ اُن بعض احکامات پر آج عمل نہیں ہوسکتا ہے، جیسے غلاموں کی آزادی، جیسے یتیموں اور غریبوں کو کھانا کھلانا

اور جیسے گھوڑوں سے جنگ کرنا وغیرہ اِن تمام باتوں کو یکجا کر کے میں خلاصہ کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ اسماعیلی مذہب میں یہ ہے کہ جماعت سے جو کچھ ہوسکتا ہے مالی طور پر وہ کچھ اِس طرح سے امام کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں ادارے قائم ہیں، تعلیمی ادارے اور دیگر صحت سے متعلّق ادارے جو کچھ کہ جماعت کے لئے، جماعت کی بھلائی اور بہتری کے لئے اور ترقّی کے لئے چاہیئے اُن چیزوں کی طرف توجّہ دی جاتی ہے، تو بجائے اِس کے کہ کسی ایک یتیم کو کھانا کھلائیں کیا علم ایسا نہیں ہے کہ وہ کسی کے لئے کھانے کا کام دے اور اُس سے بڑھ کر کام کرے، کھانا ایک دن میں ختم ہوتا ہے اگر آپ کسی کو تعلیم دلاتے ہیں دُنیاوی تعلیم یا دینی تعلیم جو کچھ [بھی] ممکن ہو آپ کسی ایسے ادارے سے تعاون کرتے ہیں جس میں تعلیم دی جاتی ہے اپنی جماعت کے بچّوں کو تو وہ تعلیم، وہ علم آگے چل کر کھانے سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اِس زمانے میں اگر کوئی غلام نہیں ہے تو کیا ہوا، نہ ہونے دو، آپ کسی کو تعلیم دیں اور جہالت کے بندھنوں سے چھٹکارا دلادو، جہالت کی غلامی سے، جہالت ایک غلامی ہے نفس کی غلامی سے آپ آزادی دلائیں اور دُنیا کی لذّتوں کی غلامی سے آپ نجات دلائیں یا کم سے کم لاعلمی کی غلامی سے نجات دلائیں۔ بہرحال جو شخص جاہل ہو، لاعلم ہو جس کے پاس علم نہ ہو ہُنر نہ ہو، وہ جس کے پاس عقل نہ ہو وہ غلام کی طرح ہے۔ آپ جس کو علم سے آراستہ کرتے ہیں تو گویا کہ آپ غلاموں کو آزاد کر دیتے ہیں، آپ جب لوگوں کو علم دیتے ہیں دُنیاوی علم، دینی علم کسی ادارے سے تعاون کرتے ہیں، زکواۃ دیتے ہیں چندہ دیتے ہیں مالی طور پر مدد کرتے ہیں امام کے امر و فرمان کے مطابق تو آپ کا امام اور آپ جو اُس کے لشکر ہیں جہاد کرتے ہیں اور اپنے دین کو مضبوط کرتے ہیں، اور جب آپ بحیثیتِ مجموعی غربت کو دُور کرتے ہیں تو یہ [سب سے] بڑھ کر ہے، امام کی ہدایت کی روشنی میں پوری جماعت کے لئے آپ خدمت کرتے ہیں آپ ایک غریب کو کھانا نہیں کھلاتے ہیں، آپ بنیاد سے، جڑ سے غربت کو افلاس کو اُکھیڑ کے پھینکتے ہیں کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ اِس تصوّر کو ختم کریں، یتیمی کا تصوّر کتنا بُرا تصوّر ہے، آج کل کے معاشرے میں یہ یتیمی کا تصوّر تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ایک شخص جس کے والدین یا والد یا والدہ وقت سے پہلے گُزر جاتے ہیں تو اُس کو ایک الگ (Status) دینا معاشرے میں کتنی بُری بات ہے۔ یہ اچھا ہے کہ معلوم ہی نہ ہو، یہ اچھا ہے کہ وہ تصوّر بنیاد ہی سے ختم ہو جائے اور وہ جماعت کے (Level) پر اسکول میں جائیں اور علم کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔ اسی طرح کوئی غریب ہے تو اُس کو ایک الگ (Category) دیں اور اُس کو ہمیشہ غریب رکھیں تا کہ آپ کی زکواۃ ہے یا خیرات ہے اُس کو دیں اور اُس کے لئے کوئی جگہ چاہیئے، آپ کی زکواۃ کو آپ کی خیرات کو تا کہ آپ کو ثواب ملے کہ آپ اُس کی (Feeding) کر رہے ہیں کیا یہ اچھا ہے؟ یا کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی مختلف (Categories) نہ ہوں، معلوم ہی نہ ہو کہ کوئی غریب تھا یا نہیں تھا، کوئی یتیم تھا یا نہیں تھا، تو آج کے زمانے میں اور اسماعیلی مذہب میں خصوصی طور پر یہ بات ہے اور رسول اللہؐ کے لئے بہت مشکل زمانہ تھا۔ رسول اللہ تیئیس (۲۳) سال کے اندر اندر یہ سب کچھ کس طرح سے کر سکتا تھا،

یہ ناممکن تھا، تو آپ سوچیں یہ اچھا یا وہ اچھا۔ تو قرآن کے اندر بعض باتیں ایسی ہیں کہ اُس زمانے کا تصوّر آپ کے سامنے پیش کرتا ہے جو کہ وہ تصوّر آج نہیں ہے، آج کون ہے جو روٹی کے لئے محتاج ہو، ایک جوڑا لباس اِس معنی میں لے کہ وہ خود کو غریب ثابت کرے، مفلس قرار دے کہاں ہے وہ یتیم؟ کہاں ہے وہ غلام؟ تو بنیادی نیکی یہ ہے کہ بنی نوع انسان کا جو (Level) ہے وہ برابر ہو، حکومت کچھ ایسا بندوبست کرے اور قومیں کچھ ایسا اہتمام کریں کہ سب انسانوں کی مدد ہو، تھوڑا بہت تفاوت ہوگا لیکن کوئی بات نہیں ہے، کوئی بات نہیں ہے ایسا نہ ہو کہ ایک شخص ہے جس کو دو وقت کا کھانا نہیں مل رہا ہے تو یہ کس کی بدولت ہے؟ اِس کی بدولت ہے کہ امام نے جماعتوں کے لئے ادارے قائم کئے اور اُن کو علم کی دولت سے مالا مال کیا اور یہ امام کی ہدایت کا معجزہ ہے، تو جہاں پر گھوڑے کا سوال تھا اُس کی مُراد یہ تھی کہ زمانے میں جو بھی ہتھیار ہو، جو بھی اسلحہ ہو اُن کو تیار کر کے رکھنا چاہئے اگر یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آتی اور مُلّا مولوی لوگ اِس کی تعلیم دیتے تو آج مسلمان بہت مضبوط قوم بنتی۔ آج اِس بات کی ذمّہ داری اُن ہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ہم ہادی ہیں، ہم پیشوا ہیں اگر کوئی یہ سوال اُٹھانا چاہے کہ اِن باتوں کی روشنی میں ہم جس بات کا تقاضا رکھتے ہیں یا جو ہونا چاہئے وہ آج اسماعیلیوں میں کیوں نہیں ہے۔ دیکھئے، اسماعیلیوں پر صرف اسماعیلیوں پر اِس کمی کا الزام نہیں آسکتا ہے، اسماعیلی ٹھیک ہیں اور اگر اسماعیلیوں کے ساتھ ساتھ آج جتنے مسلمان ہیں وہ مل جاتے اور امام کی پیروی ہوتی، امام کے فرمان کو قبول کیا جاتا تو قرآن میں جو کچھ وعدہ خدا نے کیا ہے وہ پورا ہو جاتا، اِس میں اسماعیلیوں کا کیا قصور، انہوں نے تو امام کی پیروی کی اور اسماعیلی بہت تھوڑی تعداد میں ہیں جو دُنیا کے اندر اصل چیز ہوتی ہے وہ بہت ہی کم ہوتی ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اگر سب مسلمان رسول اللہؐ کے بعد علیؑ کی پیروی کرتے تو فرقہ فرقہ ہونے سے بچ جاتے بچ گئے اور ہر زمانے میں ایک رہتے، متحد رہتے خدا نے جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳:۱۰۳) اُن کو پتا چلتا کہ خدا کی حقیقی رسّی کون سی ہے اور اُس کو مضبوطی سے پکڑے رہتے تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، کوئی کمی نہیں ہوتی آج کسی بڑی قوم کے برابر ہوتے، آگے نہ صحیح کسی بڑی قوم کے برابر صحیح مسلمان، تو یہ کمی ہماری وجہ سے نہیں ہمارے بھائیوں کی وجہ سے ہے کہ انہوں نے پیغمبر کے بعد انتشار کو پسند کیا منتشر ہو گئے، فرقہ فرقہ ہو گئے۔ تو ایک فرقہ کیا کر سکتا ہے وہ یہ کر سکتا ہے کہ خود کو نجات دلائے، کل کو قیامت کے دن اُس پر (Blame) نہ آئے، اور وہ جو ہو سکتا ہے کہ خود کو بچائے اپنے اندر اصلاح کرے یہ ہو سکتا ہے، اور آخرت میں فضیلت ہو سکتی ہے، اور یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن سے منسلک رہے یہ ہو سکتا ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی سب مسلمان کے آپس میں ملنے سے جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ سب نہ ملیں اور جہاں پر خدا نے وعدہ کیا ہے مسلمانوں سے اُس کے لئے آپ پوچھیں گے کہ اِس صورت میں تو خدا کا وعدہ ہی غلط ثابت ہو گیا، ایسا نہیں وہ احکم الحاکمین ہے کل کو کچھ لوگ پیدا ہوں گے اور اُن پر خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا کچھ وقت کے بعد

پچاس برس کے بعد سو برس کے بعد کچھ لوگ پیدا ہوں گے خدا ایک ایسی صورت پیدا کرے گا کہ جس میں کچھ لوگ پیدا ہوں گے اور وہ حقیقی مسلم قرار پائیں گے اور اُن پر خدا کا جو وعدہ ہے پورا ہو جائے گا۔ بہر حال یہ پوئنٹ یہاں پر ختم ہو گیا۔

اِس کے بعد آپ کی دلچسپی کے لئے میں نے یہاں پر ایک خاکہ بنایا ہے، کیا کہتے ہیں خاکے کو آپ مجھے بتائیں (Sketch) کہتے ہیں، بہر حال کچھ بھی ہو درمیان درمیان سے میرا بھی فائدہ ہو، انگلش کا لفظ بھی آوے مجھے بھی فائدہ لینا ہے(This is a sketch, Please see on Blackboard)یہ امامت کا سلسلہ ہے اور یہ مختلف زمانوں کے لوگ ہیں، میں آپ کو ایک فارمولا بتاؤں گا قرآن کا، قرآن کے اندر بہت سے اصولات ہیں بہت سے (Principles) ہیں(Am I right to say principles) تو بات یہ ہے کہ خدا لوگوں کو قرآن میں طرح طرح سے مخاطب کرتا ہے بعض دفعہ کہتا ہے کہ: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا '' اِس سے کیا مُراد ہے؟ اے ایمان والوں! (Will one of you tell me meening of this portion '' یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا '' O You who beleive).(Thank you)اے ایمان والو! یا کہ اے وہ لوگوں جنہوں نے ایمان لایا، تو یہ خطاب سب لوگوں سے ہے یا کہ کچھ لوگوں سے ہے؟ کچھ لوگوں سے ہے، اُن سے ہے جنہوں نے ایمان لایا، اِس کے مقابلے میں (Please tell me meening of this portion'' یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ''اِس کا کیا مطلب ہے،(O you people).(Thank you) تو اسی طرح سے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡٓا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (۵۹:۴) یہ خطاب کن لوگوں سے ہے اور کہاں سے شروع کر کے کہاں پر ختم ہوتا ہے؟ یعنی دلچسپی کے لئے میں درمیان میں سوال کرتا ہوں تا کہ یہ جو لیکچر ہے دلچسپ ہو جائے ایسا نہیں ہے کہ آپ اسٹوڈنٹ ہیں معاف کرنا تو آپ مہربانی سے بتائیں کہ یہ خطاب کن لوگوں سے ہے اور کہاں سے کہاں تک ہے؟ اِس کا کچھ تعیّن ہو سکتا ہے؟ اچھا! آپ چاہیں بتائیں نہ چاہیں میں بتاؤں گا، تو یہ خطاب رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر قیامت تک کے جتنے لوگ ہیں سب سے ہے، ہے نا! یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡٓا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (۵۹:۴)، اے ایمان والو! جنہوں نے کلمہ پڑھا ہے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہو تو تم خدا کی اطاعت کرنا رسولؐ کی اطاعت کرنا اور اپنے اپنے وقت کے صاحبانِ امر کی اطاعت کرنا۔ اِس خطاب میں اللہ تعالیٰ اُن تمام لوگوں کو مخاطب کرتا ہے جو رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر قیامت تک ہونے والے تھے، اور اِس کے لئے میں نے یہ نقشہ بنایا ہے یہ لوگ ہیں مختلف زمانے کے لوگ ہیں جتنے لوگ دُنیا میں پیدا ہوئے ہیں، اچھا! میں ایک اور سوال کروں گا، لوگ رسول اللہؐ کے زمانے سے یعنی مسلمان رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر قیامت تک تو ایک ہیں لیکن اِن کی (Division)، اِن کی تقسیم کس بنیاد پر ہے، یہاں پر اماموں کی وجہ سے ہے اماموں کی وجہ سے ہے، جس طرح

پیغمبروں کے لحاظ سے ابراھیمؑ کی قوم، موسیٰؑ کی قوم اور اُس سے آگے نوحؑ کی قوم، آدمؑ کی قوم اور عیسیٰؑ کی قوم اور آنحضرتؐ کی قوم کو دیکھا، لوگوں میں تخصیص نہیں ہے، کوئی تقسیم نہیں ہے سوائے پیغمبروں کے اسی طرح جب خداوندِ عالم کہتا ہے کہ: "یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا"، "اٰمَنُوۡا" سے مُراد یہاں کلمہ پڑھنا ہے یا جیسا کہ ایمان لانا چاہئے اِس طرح سے ایمان لانے کا ذکر ہے، نہیں! صرف کلمہ پڑھنے کے بعد اسلام میں داخل ہونے کا ذکر ہے، اگر "یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" میں مسلمانوں کی تمام صفات مکمّل ہوتیں تو پھر "اَطِیۡعُوا اللّٰہَ" نہیں کہتا، "اَطِیۡعُوا اللّٰہَ" میں اسلام پر عمل کرنے اور صحیح معنوں میں ایمان لانے کے ہیں اور اگر "اَطِیۡعُوا اللّٰہَ" میں سب احکام ختم ہو جاتے تو "وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ" نہ فرماتا اور اگر دُوسرے (Stage) میں "وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ" میں اسلام کی ساری باتیں ساری تعلیمات سارے اعمال مکمّل ہو جاتے تو "وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ" نہ فرماتا، اِس سے معلوم ہوا کہ سب کچھ تمام ہوتا ہے کہاں پر "وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ" پر اسلام، دین، ایمان، حکم، فرمان، ہدایت ہر چیز یہیں پر ختم ہو جاتی ہے اور اسلام مکمّل ہو جاتا ہے۔

اچھا، بہر حال آپ کو نقشے کی مدد سے [جاننا ہے] بہت کچھ عرض کرنے کے لئے میں نے یہ نقشہ بنایا ہے، تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ قرآن کے خطابات کس طرح سے ہیں: یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (۵۹:۴) تو یاد رہے کہ یہ خطاب سب لوگوں سے ہے، سب لوگوں سے ہے اور لوگوں کے طبقات صرف اماموں کی وجہ سے ثابت ہوتے ہیں، تو دیکھا کس طرح سے امامت کی رسّی جو ہے وہ لوگوں کے درمیان سے گزرتی آئی ہے، نور کی جو زنجیر ہے نور کا جو سلسلہ ہے [وہ] کس شان سے چلا آیا ہے، اور لوگ کس طرح خدا کے سامنے ہیں۔ ایک بات آپ پوچھیں کہ جو لوگ ابھی دُنیا میں وُجود میں نہیں آئے تھے، نزولِ قرآن کے وقت جس وقت قرآن نازل ہوتا تھا اُس وقت خدا نے یہ پیشگی طور پر لوگوں کو مخاطب کیا آپ یہ سوال کریں۔ یاد رہے کہ خدا کا ماضی نہیں ہے، اور خدا کا مستقبل نہیں ہے، خدا کا صرف حال ہی حال ہے کیوں؟ (God has no Past, God has also no Future, Am I Right?) خدا کا ماضی نہیں ہے، مستقبل میرا ہے، کیوں؟ کچھ تو مجھ سے گزر گیا اُس تک میری نظر نہیں جاتی ہے، میرے احوال گزر گئے جب کہ میں پیدا ہوا تھا اور جب میں پیدا نہیں ہوا تھا، اُس سے آگے جو کچھ ہے وہ بھی ماضی ہے وہ تو اور زیادہ تاریک ہے، میرا ماضی گزر گیا (My Past have been lost, I cannot see it) میرا جو ماضی تھا وہ گزر گیا کچھ اُس میں سے تو بھول گیا ہوں، کچھ تھوڑا تھوڑا یاد ہے یہ میرا ماضی بن گیا اور جو (Future) ہے اُس کا تو مجھے پتا ہی نہیں، میں نہیں سمجھتا ہوں ماضی کیا ہے، اِس لئے خدا کا ماضی نہیں ہے خدا کا (Future) نہیں ہے سب حال ہی حال ہے۔ اچھا، اِس (Formula) کی روشنی میں، میں آپ کو بتاؤں خدا اُن سب لوگوں سے خطاب کرتا ہے، خدا کے سامنے ہیں جو دُنیا میں کون سے لوگ اور کتنے لوگ وجود میں آنے والے ہیں اُس کے سامنے روشن ہے۔ لہٰذا خداوندِ عالم نے

رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر قیامت تک جتنے مسلمان وجود میں آنے والے تھے اور امامت کے جتنے جامے بننے والے تھے اُس تقسیم کی بنا پر سب لوگوں کو کہا :یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (۵۹:۴)''وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ '' اگلے اماموں اور موجودہ امام کے اِرشادات کے درمیان اگر کچھ اختلاف ہوتا ہو تو تم اپنے وقت کے امام کی اطاعت کرنا، میں نے یہ نقشہ اِس لئے بنایا ہے کہ''مِنۡکُمۡ ''''مِنۡکُمۡ '' میں امامِ زمان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی اہمیت کا اشارہ موجود ہے،تو یہ ہے آپ اِس چیز کی طرف توجّہ فرمائیں کہ خدا کا ماضی نہیں ہے اور خدا کا مستقبل نہیں ہے، خدا کے لئے حال ہی حال ہے چونکہ وہ (Omnipresent) ہے زمانے کے لحاظ سے بھی، مکان کے لحاظ سے بھی، ہر جگہ پر ہے تو یعنی اُس کی نظر ہر چیز کو پاتی ہے۔لہٰذا خدا سے کوئی چیز گزرتی نہیں ہے کہاں جائے گی وہ؟ خدا کے علم کے تحت ایک نقطے کی طرح ہے ہر چیز لہٰذا خدا کے لئے ماضی نہیں ہے، مستقبل نہیں ہے حال ہی حال ہے اور احوال سب روشن ہیں۔لہٰذا خداوندِ عالم نے اِن تمام لوگوں کو جو دُنیا میں پیدا ہونے والے تھے قیامت تلک اُن کو مخاطب کیا اور اُن پر امامِ وقت کی فرمانبرداری واجب اور لازم کردی، تو دوسری بات یہ آیۂ اطاعت ہے جو آپ دُعا میں پڑھتے ہیں دُوسری ایک بات بہت اچھی بات ہے، لگے ہاتھ اِس نقشے کے ساتھ دُوسری بات بھی بتلائیں گے جس کا تعلّق اسی نقشے سے ہے،وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (۲:۱۴۳) یہ اماموں سے خطاب ہے سب اماموں سے، اے گروہِ ائمہ! میں نے تم کو ایک درمیانی امّت قرار دیا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو، تو یہ امام جو لوگوں پر گواہ ہے اور لوگوں کے درمیان ہیں لوگوں کے درمیان سے گزرتے آتے ہیں، اور وہ گواہ ہیں میں نے کبھی کسی لیکچر میں کہا تھا کہ خدا بھی گواہ ہے، رسولؐ بھی گواہ ہے اور امام بھی گواہ ہے، لیکن گواہی پوری ہوتی ہے امام پر آ کر جس طرح اطاعت خدا کی بھی اطاعت ہے، فرمانبرداری، رسول کی بھی اطاعت تھی لیکن پوری نہیں ہوتی ہے، جب تک کہ امام کا مرتبہ نہ آئے تو امام پر آ کر ہر چیز مکمّل ہو جاتی ہے۔ اِس سلسلے میں خدا کا مرتبہ دُوئی کا رنگ صحیح، اور رسولؐ کا مرتبہ بڑی شاخوں کی طرح صحیح اور امام کا مرتبہ چھوٹی چھوٹی شاخوں کی طرح صحیح لیکن پھل آپ کو کہاں ملے گا، تنے میں تو نہیں ملے گا، بڑی بڑی (Trunks) میں نہیں ملے گا، ملے گا نازک نازک شاخوں میں، امام کا ذکر آخر میں آتا ہے، تو آپ کو کیوں اِس سے احساس ہوتا ہے کہ امام کا درجہ آخر میں ہے اور آخر میں ہر چیز مکمّل ہو جاتی ہے۔پھل آپ کو امام سے ملے گا، خدا کی صفت امام میں مکمّل ہو جائے گی۔

ٹائپنگ: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: نورِ قرآن

کیسٹ نمبر: Q-3B تاریخ: ۳۱/ دسمبر/ ۱۹۷۷، کینیڈا

Click here for Audio

۔۔۔۔رسائی کی جو اُس زمانے میں تھے باقی سب لوگ تو نہیں پہنچتے ہیں اور اگر پہنچتے ہیں تو امام کے وسیلے سے پہنچتے ہیں۔ درخت کا فائدہ کہاں ظاہر ہے؟ شاخ میں! اگرچہ تنا میں بڑی شاخیں اور چھوٹی چھوٹی نازک شاخیں ایک ہیں درخت ایک ہے، تو خدا اور رسول اور امام کا مرتبہ ایک ہے، اگر آپ اِس کو (Division) میں سمجھنا چاہتے ہیں تو امام کا مرتبہ آخر میں آئے گا اور آخر میں آئے گا، اور مکمّل وہی ہوگا اور فائدہ اسی سے ملے گا رسائی اسی سے ہوگی، اِس لئے اگر یہ بات ہے تو اپنے زمانے کے امام سے آپ کو پھل ملے گا۔ اب آپ کو ترجمہ بتلایا جاتا ہے۔

اب ہم آتے ہیں ایک اور اہم پوئنٹ کی طرف جو کہ آپ کے اور ہمارے نزدیک بہت ہی ضروری ہے بلکہ انتہائی ضروری ہے، اور اُس میں عبادت کا بھی ذکر ہے اور اُس میں یہ بھی ذکر ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے سے باطنی تعلیمات کا [آغاز] شروع ہوا تھا، خصوصی حالت میں آنحضرتؐ باطنی، رُوحانی تعلیمات بھی دیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ قریش کے جو بڑے لوگ ہیں انہوں نے اعتراض اُٹھایا کہا کہ جب بھی ہم رسولؐ سے باتیں سننے کے لئے جاتے ہیں تو وہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو غریب طبقے سے ہیں، ہمارے برابر کے نہیں ہیں، وہ میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، اور اُس صورت میں ہماری بے حرمتی ہوتی ہے کہ ہم اُن کی قطار میں بیٹھیں اور رسولؐ سے باتیں کریں، جب تک رسولؐ اُن کو باہر نہیں نکالتے ہیں تو ہم پیغمبر کے پاس نہیں ٹھہریں گے باتیں نہیں سنیں گے، ایسا کہا اُن لوگوں نے وہ بھی مسلمان تھے، تو خداوندِ عالم نے ایک آیت نازل کی اِس سلسلے میں، اور اُس آیت کے اندر خدا کی طرف سے اعتراض تھا وہ کون لوگ تھے؟ جیسے سلمان فارسیؓ اور مقدادؓ وغیرہ ایسے اصحاب تھے اُن کو اسماعیلی کہنا چاہئے یا صوفی کہنا چاہئے، جو ظاہر ظاہر میں مسلمان تھے [لیکن] اُن سے بڑھ کر تھے یہ لوگ، جن کے بارے میں قریش کے اکابرین اعتراض کرتے تھے، تو اِس سلسلے میں قرآن کے اندر جو کچھ ارشاد ہے پہلے اُس کا تھوڑا سا میں خلاصہ آپ کو بتاتا ہوں پھر اُس کے بعد تشریح کرتا ہوں۔ (Send not away those who call on their Lord morning and the evening seeking his faith.) یہ سورہ چھ ہے اور آیت باوَن ہے (۶:۵۲) [وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ

شَیۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ] یعنی اُن لوگوں کو باہر نہ نکالا کریں آپ اے رسولؐ! جو صبح و شام دُعا پڑھتے ہیں اور دیدار چاہتے ہیں ۔میں نے یہ آیت اِس لئے منتخب کی ہے کہ اِس کے اندر اسماعیلی مذہب کا واضح طور سے ذکر ہے، ایک اِس لئے کہ اُس میں صبح و شام عبادت کرنے پر زور دیا گیا ہے یا کہ اُسی کی خصوصی طور سے تعریف کی گئی ہے، دُوسرا اِس میں یہ ذکر ہے کہ اِس عبادت کے نتیجے میں رُوحانی دیدار کا بیان آیا ہے، وہ اپنے پروردگار کے چہرے کو چاہتے ہیں یعنی وہ رُوحانی طور پر دیدار چاہتے ہیں ۔صوفی لوگوں کے نزدیک اِس آیت کا مطلب تصوّف ہے اور ہم اِس سے یہ مُراد لیتے ہیں کہ یہ اسماعیلی مذہب کی شان میں ہے کیونکہ صوفیوں کے وہاں ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف دو (۲) وقت عبادت کرتے ہوں، اِس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں سب لوگ دو (۲) وقت دعا پڑھتے تھے، وہ شرعی نماز پڑھتے تھے، اور یہ لوگ دین کے ساتھ مل کر دو (۲) وقت کے علاوہ شرعی نماز پڑھتے تھے اور میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں جو آج ہم دُعا پڑھتے ہیں وہی دُعا یہ لوگ پڑھتے تھے لیکن نہیں! وہ کچھ بھی پڑھتے تھے لیکن دو (۲) وقت خصوصی طور سے دُعا پڑھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی نیّت اُن کی مُراد یہ ہوتی تھی کہ اُن کو نورانی دیدار ہو جو اسماعیلی تصوّر ہے۔

اب اِس سے ظاہر ہے کہ اسماعیلیت کا آغاز رسول اللہؐ کے زمانے سے ہوا اگرچہ اُس وقت اِس مذہب کو اتنا نہیں ہونا چاہئے جو اب ہے کیونکہ کوئی چیز شروع میں اتنی نہیں ہوتی ہے، شروع میں تھوڑی سی ہوتی ہے ۔آپ درخت کی مثال لیں، ایک زمیندار اباغ میں پھل میں سے گٹھلی کو نکال کر زمین کے نیچے بوتا ہے، اور اُس کی ایک سوئی نکلتی ہے، [اسے] سوئی کہتے ہیں، کیا وہ سوئی یا وہ پودا ایک دم سے درخت بنتا ہے، پھل دیتا ہے، پھول بنتے ہیں، نہیں! وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، اُس کی نشو و نمائی آہستہ آہستہ ہوتی ہے، تو رسول اللہؐ کے زمانے میں اسماعیلی مذہب تھا، اُس زمانے کے رنگ میں تھا اب اِس زمانے کے رنگ میں ہے، رسول اللہؐ کے زمانے میں صرف رسول اللہؐ کے زمانے میں نہیں تھا، یہ مذہب تو بہت آگے سے تھا ازل سے تھا۔ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کس دین میں تھے؟ خدا کے دین میں تھے، انبیاء علیہم السّلام کے الگ الگ دین نہیں ہیں بالکل نہیں ہیں، ایک ہی دین ہے جو دینِ حق ہے، وہی دین یہی ہے جو آج آپ کے سامنے ہے ۔میں نے درمیان سے آنحضرتؐ کے قبل کے زمانے کی طرف اِس لئے اشارہ کیا کہ آپ کو یہ سوال نہ بنے اور آپ یہ نہ سوچیں کہ یہ دین جو ہے رسول اللہؐ کے زمانے سے ہے ایسا نہیں ہے، آپ نے فرامین میں پڑھا ہے واضح بات ہے، یہ بہت پہلے سے ہے ۔اب آپ اتنے سے نکتے کے بعد اُس کو چھوڑیں اور رسول اللہؐ کے زمانے کی طرف واپس آئیں اور رسول اللہؐ کے زمانے کا تصوّر کریں اور اسی آیت میں آئیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ دو (۲) وقت کی نماز، دُعا پڑھتے ہیں نماز [ادا] کرتے ہیں اور اپنے ربّ کے چہرے کو چاہتے ہیں یعنی باطنی دیدار کو چاہتے ہیں، تو اُن کو جس طرح آپ تعلیم دیتے ہیں دیتے رہیں، اُن کو نہ نکالیں کوئی آوے آوے اور کوئی نہ آوے تو ایسی کوئی بات نہیں

ہے، خدا نے یہ ارشاد فرمایا، اور اِس میں دعا کی تشریح ہے، دُعا کا ذکر ہے اور دیدار کا تصوّر ہے جو رفتہ رفتہ اِس تصوّر کا یا کہ اِس مذہب کا جو کام ہے آگے سے آگے بڑھتا چلا گیا، اور دُوسری بات میں نے جو کہا تھا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں اسماعیلی مذہب تھا اور میں نے یہ بھی کہا کہ اُس زمانے کے رنگ میں تھا، تو رسول اللہؐ کے زمانے میں جو لوگ خدا و رسولؐ اور اولو الامر کو جانتے تھے وہ اسماعیلی تھے، یہ نام نہیں تھا جو آج ہے نام تو بدلتا رہتا ہے دین کا نام بدلتا ہے اور ہر وقت بدلتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں اِس مذہب کا نام اسلام ہے اور اُس کے بعد یعنی شیعہ ہے، اُس کے بعد اسماعیلی ہے، اُس کے بعد پھر نزاری بھی ہے ایک ایک نام کا اضافہ ہوتا چلا آتا ہے، اُس کے بعد بعض لوگ ہم کو آغا خانی بھی کہتے ہیں، صحیح ہے غلط نہیں ہے ہم آغا خانی ہیں تو آدمی جیسے جیسے ترقّی کرتا ہے اُس کو ایک ایک ٹائٹل ملتا ہے اُس کے ناموں میں اضافہ ہوتا ہے حالات، واقعات اور کارناموں کی وجہ سے، اِس طرح مذہب جیسے آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ایک نام کا، ایک ٹائٹل کا اضافہ ہو جاتا ہے مگر دین کی اصلیت اور حقیقت وہی ہوتی ہے جو کبھی تھی۔ ہمارا موضوع ہے کہ قرآن کس طرح اسماعیلی مذہب کا (Favour) کرتا ہے وہی سلسلہ چل رہا ہے، کبھی (Directly) اور کبھی (Indirectly) آپ کو مثالیں بتاتے ہیں، سب قرآن کی حقیقت کو بتانا وقت کے لحاظ سے یعنی جتنا وقت آپ کو ہمیں مہیّا ہے وہ ناممکن ہے، اِس لئے درمیان درمیان سے کچھ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

اب ایک اور پوئنٹ آپ کے سامنے ہے، قرآن میں ایک اور آیت ہے: فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰاهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۶:۴)۔ اگر کافر لوگ محمدؐ کو ستائیں تکلیف دیں تو کیا ہوا خدا اُس کا مددگار ہے، جبرائیل اُس کا مددگار ہے اور صالح المومنین اُس کا مددگار ہے۔ تو خدا، خدا ہے جبرائیل، جبرائیل ہے یہ صالح المومنین کون ہے؟ مولانا مرتضیٰ علیؑ۔ اب ہم آرام آرام سے صالح المومنین کی تشریح کریں گے۔ اوّل صالح المومنین کے ٹائٹل کو ذرا سوچیں، کتنا عظیم ٹائٹل ہے، کس قدر شاندار ہے، صالح المومنین! مومنین الگ ہیں یہ صالح الگ ہے اور صالح المومنین ایک معنی میں مومنین میں سے بڑھ کر نیکو کار، سب مومنین سے بڑھ کر نیکو کار، اچھے سے اچھا کام کرنے والا اور صالح المومنین کے دُوسرے معنی ہیں مومنین کا صالح (Reformer)، اصلاح کرنے والا مصلح یہ صالح فاعل ہے۔ ماشاء اللہ آپ اور ہمارے پاس جاننے والے ہیں عربی کے الفاظ کو لغت کو وہ دیکھیں گے سنیں گے، آپ سوچ لینا کہ صالح کا مطلب اصلاح کرنے والا ہے۔ آپ کو تمام لغات سے یہ مطلب اس طرح سے نہیں ملے گا، تھوڑی سے کوشش کرنی پڑے گی اور میرے نزدیک صالح، مصلح دونوں کا مطلب ایک ہے، (Reformer) اصلاح کرنے والا۔ اصلاح کرنے والے کا کیا مطلب؟ (Amendments) کرنے والا، ترمیم کرنے والا، ترمیم کیوں کی جاتی ہے آپ کو معلوم ہے کسی آئین میں کسی (Constitution) میں ہے، کیا وہ پہلے وہ آئین غلط ہوتا ہے بعد میں اُن کو خیال آتا ہے، نہیں، پہلے غلط نہیں ہوتا ہے، یہ ترمیم وقت اور زمانے کے تقاضا کی وجہ سے ہوتی ہے، تو

یہ لفظ ایسا ہے کہ اِس کے اندر زمانے کے موافق دین اور آئین میں ترمیم کرنے کے معنی ہیں اور یہ حق صرف ایک شخص کو ایک شخصیت کو پہنچتا ہے جو صالح المومنین ہے۔ کس خوبصورتی سے خداوندِ عالم نے اِس لفظ کو مناسب جگہ پر چسپان کر دیا ہے صالح المومنین، سب کے لئے نہیں، دُنیا والوں کے لئے نہیں، صالح المومنین یہ (Reformer) اُن کا ہے جو مومنین ہیں، جو خدا کے نزدیک بھی مومنین ہیں، پیغمبر کے نزدیک بھی مومنین ہیں اور اُس ہستی کے نزدیک بھی مومنین ہیں جو کہ وہ صالح المومنین ہے، یہ چیز کچھ میری ایجاد نہیں ہے اِس کو مفسرین نے قبول کیا ہے، آپ تفسیروں میں جائیں گے، شیعہ تفاسیر اور کچھ سنّی تفاسیر اِس بات کو قبول کرتی ہیں کہ صالح المومنین علیؑ کی شان ہے۔ اگر مفسرین کے نزدیک، تفسیر کرنے والوں کے نزدیک یہ بات صحیح ہے کہ صالح المومنین علیؑ ہیں تو وہ علیؑ آج بھی ہونا چاہئے آج بھی اصلاح کی ضرورت ہے، چودہ سو سال گزرے کیا اِس میں (Amendments) کی ضرورت نہیں ہے۔ اُن ہدایت میں جو انسانوں کو چاہئے، مومنوں کو چاہئے اُن میں (Amendments) کی ضرورت ہے لیکن وہ لوگ کہاں مانیں گے، دُوسرے لوگ نہیں مانیں گے ہم آپ اِس ہدایت کو قبول کرنے والے ہیں جو خود خدا نے فرمایا ہے، تو (Amendments) کہاں ہونی چاہئیں؟ دین میں، آئین میں، ہدایات میں، امام کی اپنے ہدایات میں، قرآن کی تشریح میں، قرآن کی جو اصلی صورت ہے وہ اسی طرح سے رہے گی، اُس کی تشریح میں، کیا تفسیر میں (Amendments) نہیں ہے؟ تو [کوئی] ایک تفسیر لکھتا ہے تو دوسرا شخص اُس میں (Amendments) کرتا ہے لیکن قرآن کے اُوپر نہیں کرتا ہے قرآن کی اصلی حالت میں (Amendments) نہیں ہے، ترجمے میں ہے تشریح میں ہے اور اگر قرآن کی آیت کو مسخ کیا گیا تو بعد والوں کو کیا پتا چلے گا؟ کس طرح وہ ریسرچ کریں گے؟ اُس میں کچھ نہیں کرنے کا۔ ایک شخص نے تفسیر لکھی ہے دُوسرا شخص کہتا ہے کہ اُس نے اپنے طور سے تفسیر لکھی تھی مجھ کو بھی حق پہنچتا ہے میں بھی لکھوں گا، وہ بھی لکھتا ہے تیسرا بھی لکھتا ہے، چوتھا بھی لکھتا ہے، آج جتنی تفاسیر آپ کے سامنے ہیں بحیثیتِ مجموعی (As a whole) دیکھیں اُن میں ترمیم ہے یا نہیں ہے، ایک شخص نہیں قبول کرتا ہے لیکن دُوسرا شخص یعنی کہتا ہے کہ نہیں یہ بات ہے، تیسرا شخص کہتا ہے کہ نہیں یہ درست ہے، تو (As a whole) دیکھا جائے تو اُن کے وہاں بھی ایک ترمیم ہے اِس طرح سے نہیں ہے جس طرح ہم چاہتے ہیں وہ ہے ایک مجبوری کی ترمیم مگر ترمیم کی صورت ہے، اِس سے ثابت ہوا کہ ترمیم ہے، تو ایک چیز جہاں ہونی چاہئے اصلی صورت میں اُس کی ایک نقل بنانے کے لئے کوشش کی جاتی ہے، جب ایک چیز نہیں ملتی ہے تو دُنیا زمانہ اُن کو مجبور کرتا ہے کہ تم ایسی چیز بناؤ، وہ کوشش کرتے ہیں لیکن وہ چیز کامیاب نہیں ہوتی ہے، جو اصلی چیز ہے وہ اصلی چیز ہے، چونکہ اسلام کے اندر ترمیم کا فلسفہ موجود تھا اِس لئے یہ تقاضا کسی طرح سے مفسرین میں آ گیا وہ مجبور ہو گئے کیونکہ اگلے مفسر نے جو کچھ لکھا تھا وہ چسپان نہیں ہوتا تھا تو کچھ وقت کے بعد ایک اور مفسر نے دُوسری طرف سے لکھا اسی طرح کرتے کرتے آج تفسیر کی

بہت سی کتابیں موجود ہیں، تو یہ ایک گواہی ہے ایک ثبوت ہے، ترمیم ہے، کہاں؟ قرآن کی عبارت میں، نہیں! نعوذباللہ منہا، ترجمے میں، تشریح میں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ اگلی تشریح اُس وقت کی روشنی میں تھی اور بعد کی تشریح اِس وقت کے مطابق ہونی چاہئے، تو یہ کام بھی امام ہی کرسکتا ہے کیونکہ وہ صالح المومنین ہے، مومنین کا(Reformer) ہے، لیکن [اس کو] سب لوگ قبول نہیں کریں گے، آپ یہ ٹائٹل امام کو دینا چاہیں گے، اِس کی اشاعت کریں گے، اِس کا اعلان کروائیں گے، لوگ نہیں مانیں گے، لیکن یہ آپ کے لئے ہے ہمارے لئے ہے اور خدا کے نزدیک صحیح ہے قرآن کا لفظ ہے۔ اِس کے بعد ہاں، اِس کا ریفرینس یہ ہے کہ (۶۶:۴) نوٹ فرمائیں اور تفاسیر میں چاہیں شیعہ ترجموں میں حاشیے پر دیکھیں آپ کو ملے گا۔

آپ میں سے جن حضرات کو قرآن کی تعلیم سے (Interest) ہے اُن کو چاہئے کہ دونوں قسم کے ترجمے رکھیں، سنّی ترجمے بھی رکھیں اور شیعہ ترجمے بھی رکھیں، تو دونوں کے درمیان جو فرق ہے اُس کو دیکھیں۔ شیعہ تفسیروں میں، شیعہ ترجموں میں آپ کو بہت سی آیتیں ملیں گی جو کہ اہلِ بیت کی شان میں ہیں، امام کی شان میں ہیں اور امام کی تعریف کے طور پر ہیں اور جب آپ سنّی حضرات کے ترجموں کو دیکھیں گے تو اُن میں آپ کو یہ چیزیں نہیں ملیں گی سوائے سنّیوں کے کچھ کچھ مفسرین ہیں، بڑے بڑے اسکالرز ہیں جو اگلے زمانے کے ہیں انہوں نے اپنی تفسیروں میں اِس کا ذکر کیا ہے، اِس بارے میں زیادہ معلومات ہمارے محترم فقیر صاحب رکھتے ہیں۔ جلال الدین سیوطی ایک سنّی اسکالر ہیں اور اُن کی تفسیر بھی ہے اور دیگر کتابیں بھی ہیں جن میں مولانا علیؑ کی شان میں جو آیات نازل ہوئی تھیں اُن کا اِس نے ذکر کیا ہے اور بھی آپ اِن سے پوچھیں کہ دُوسری اور تفسیریں ہیں اُن میں سنّیوں کی تفسیریں ہیں جن میں کہ علیؑ کی شان میں کچھ آیات ہیں۔ ہاں! اِس کے علاوہ حدیثوں کا سیٹ اِس وقت میرے پاس بھی موجود ہے، علیؑ کی شان میں پیغمبر کی بہت سی حدیثیں جو مشہور ہوئی ہیں وہ ہیں، بڑی بڑی حدیث کی کتابوں میں ہے اور اِس کے علاوہ بہت ساری آیتوں کا بھی ذکر ہے کہ یہ آیات علی کی شان میں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پیغمبر کے بعد کسی شخصیت کی اہمیت اور ضرورت نہ ہوتی تو یہ ذکر کیوں ہے؟ پیغمبر کے بعد اگر سب مسلمان ایک جیسے ہیں اور مرتبہ اسی کا ہونا چاہئے جو لائق ہو جو زیادہ پڑھے اُسی کو اگر امام ہونا ہے، پیشوا ہونا ہے تو قرآن میں مخصوص ایک خاندان اور مخصوص ایک شخصیت کا ذکر کیوں ہے؟ یہ تصور کیوں دیا گیا ہے کہ رسولؐ کے بعد بھی کوئی ہے۔ اگر ہمارا عقیدہ صحیح نہیں ہے تو یہ بھی تو نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن بات ایسی نہیں ہے یہی ہے جو کچھ آپ جانتے ہیں جو کچھ آپ کا نظریہ ہے یہی صحیح ہے کہ رسولؐ کے بعد امام ہے۔ اِس کے بعد قرآن میں ایک آیت ہے۔ بہت عالی ہے، بہت حکمت خیز ہے: سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ (۳۷:۱۳۰)، سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ اِس کا ترجمہ ہے یاسین کی آل پر سلام ہو۔

شیعہ تفاسیر میں موجودہ قرآن کی ظاہری صورت میں کچھ تبدیلی نہیں ہے، اُس میں سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ

یَاسِیْنَ ہے(۳۷:۱۳۰)۔ اِس کا مطلب وہ یہ بتاتے ہیں کہ الیاس والوں پر سلام ہو لیکن الیاس بڑے بڑے پیغمبروں میں سے نہیں تھے کہ محمدؐ کا ذکر نہ ہو اور الیاس کا ذکر ہو، یہ کوئی منطق نہیں بنتی ہے۔ اصل میں ہونا چاہئے سَلَامٌ عَلٰی آلِ یَاسِیْنَ۔ سلام ہو یاسین کی آل پر۔ میں لکھ کر بتاتا ہوں کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے وہ کیوں فرق پیدا ہوا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے، حروف وہی ہیں لیکن ترتیب اور زیر و زبر میں فرق ہے، تھوڑا سا فرق ہے، ''اِل'' اور ''آل'' میں فرق ہے، یہ کیوں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے [کہ] رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن کے زیر و زبر وغیرہ نہیں تھے، جس کو اعراب کہا جاتا ہے کچھ نہیں تھا، رسولؐ پر صرف وحی آواز کی صورت میں آئی تھی، تحریری شکل میں نہیں آئی تھی اور وحی کا جو (Pronunciation) ہوتا ہے اگر میں اُس کا تھوڑا سا ذکر کروں تو دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اُس کا [یعنی] وحی کا جو (Pronunciation) ہوتا ہے وہ کچھ عجیب ہوتا ہے، بہت عجیب ہوتا ہے، یہ بات آپ کو کوئی نہیں بتائے گا ایک اسماعیلی آپ کو بتائے گا اور ایک اسماعیلی عالم بتائے گا جو میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وحی کی آواز

(Voice of revelation I asked my teacher, that he says voice of revelation, he says voice of revelation).

وہ مخصوص ہوتی ہے وحی کی آواز مخصوص ہوتی ہے۔ کسی (Word) میں اگر ''الف'' ہے تو اُس میں ''ع'' کی بھی امکانیت ہوتی ہے، یہ بعد میں کسی وقت آپ کو نکال کر بتاؤں گا، ''ا۔ل۔م'' ہو تو (Interesting) ہے، ''ا۔ل۔م'' جہاں ''الف'' ہے اُس میں ''ع'' کی بھی امکانیت ہوتی ہے اور اگر ''س'' ہے تو اُس میں ''ص'' اور بعض دفعہ ''ض'' کی بھی امکانیت ہوتی ہے اور ''ث'' کی بھی امکانیت ہوتی ہے، اگر یہاں پر سات (۷) حرف ہیں تو، سات (۷) [الفاظ] ممکن ہوتے ہیں اِس معنیٰ میں پیغمبر نے فرمایا کہ قرآن سات (۷) حروف پر نازل ہوا ہے یہ آپ نوٹ کریں، قرآن سات (۷) حروف پر نازل ہوا ہے اُس میں سے کوئی بھی حرف ہو سکتا ہے۔ مطلب کیا تھا مطلب ''اِلْ یَاسِیْنَ اور آلِ یَاسِیْنَ'' تھا۔ قرآن جب نازل ہوا تھا تو ''آلِ یَاسِیْنَ'' کی آواز یا کہ ''آلِ یَاسِیْنَ'' کا ہجّہ (Spell) زیادہ ممکن تھا اور لکھنے والوں نے یا کہ بعد میں زیر و زبر جنہوں نے لگایا انہوں نے ''اِلْ یَاسِیْنَ'' کر دیا ''آلِ یَاسِیْنَ'' نہیں کیا۔ آج شیعہ تفاسیر میں ''آلِ یَاسِیْنَ'' تشریح میں ہے اُوپر نہیں اور اماموں نے خود بتایا، امام جعفر الصادقؑ نے خود ارشاد کیا یہ ''آلِ یَاسِیْنَ'' ہے [کتاب: حیات القلوب، صفحہ: ۱۰۱، علامہ سیّد محمّد باقر مجلسی] منطق میں ثابت ہونے کے بعد اور اُس سے پیشتر امام کے فرمانے کے بعد ہمارے یہاں [یہ] بات صحیح ہے قابلِ قبول ہے۔ اگر کوئی ہدایت، کوئی تعلیم، علم کی کوئی بات، کوئی پوئنٹ، کوئی نکتہ امام جعفر الصادقؑ کہتے ہیں یا کوئی [بھی] امام کہتا ہے تو [وہ] ہمارے نزدیک قابلِ قبول ہے کیونکہ اسلام میں رسولؐ کے بعد امام سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے، کہ اُس کی بات کو ہم صحیح مانیں اور امام کی بات کو چھوڑیں، امام ہی ہیں جو کہ قرآن کو جانتے

ہیں امام کے فیصلے کے بعد سب مسلمانوں کو قبول کرنا چاہئے تھا، تو اگر یہاں پر خداوندِ عالم نے اپنی حکمت سے ایک ایسے لفظ کو لیا ہے ہمارے سامنے کہ اُس کو ہم سمجھیں، کیا لفظ ہے؟ ''آل'' تو ''آل'' کسی ایک شخص پر ختم نہیں ہوتی ہے، ''آل'' ایک شخص سے تعلّق رکھنے والا لفظ نہیں ہے، ''آل'' ایک سلسلہ ہے، ''آل'' معنی (Progeny) اور (Other word Decendent) تو آلِ یاسین رسول اللہؐ کے وقت میں علیؑ، حسنؑ، حسینؑ پھر زین العابدینؑ، محمد باقرؑ، علیٰ ھذا القیاس تا این دم اور اس وقت مولانا شاہ کریم الحسینی حاضر امام ہیں سَلَامٌ عَلٰٓی اٰلِ یَاسِیْنَ میں آرام سے اِس کی تشریح کروں گا کیونکہ میں مطمئن ہوں اِس لئے کہ آپ توجّہ دے رہے ہیں، میں مطمئن ہوں اس لئے کہ آپ کو مزا آرہا ہے، میں مطمئن ہوں اِس لئے کہ درمیان درمیان میں آپ ہنستے بھی ہیں مسکرا بھی دیتے ہیں، تو سَلَامٌ عَلٰٓی اٰلِ یَاسِیْنَ کے کیا معنی؟ فوری معنی مختصر معنی یہ ہیں کہ سلامتی ہے یا کہ سلامتی ہو محمدؐ کی آل پر، ہاں! یہ خوشی دینے والی تشریح نہیں ہے، کم ہے ہم اور زیادہ اِس میں سے خوشی چاہتے ہیں وہ یہ کہ دُنیا و زمانے کی کوئی آفت آلِ یاسین کو متاثر نہیں کرے گی، آلِ یاسین دُنیا میں ہمیشہ قائم اور دائم رہیں گے۔ آپ کسی کو دُعا دیتے ہیں تیرا تن سلامت رہے، اِس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یعنی تجھ کو کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی بیماری نہ ہو، کوئی آفت نہ آوے، تیری تندرستی قائم رہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے کہ آلِ یاسین دُنیا میں اِس شان سے ہیں، کہ وہ بالکل سلامتی سے ہیں، کوئی زمانے کی آفت اور دُنیا کی کوئی بلا اُن کے قریب نہیں جا سکتی ہے، آلِ یاسین تو سلامت ہے اور سلامتی کا سرچشمہ ہے، سَلَامٌ عَلٰٓی اٰلِ یَاسِیْنَ۔ وہ ہمیشہ سلامت ہیں، ہمارے امام سلامت ہیں اور سلامتی کے مالک ہیں جن کو خدا کہتا ہے کہ یہ سلامت ہے تو خدا کی طرف سے سلامتی اُسی چیز سے ہم کو مہیّا ہو سکتی ہے اور اِس آیت کے اندر ایک طرف سے اسماعیلی مذہب کا (Favour) ہے اور دُوسری طرف سے یعنی امامت کے سلسلے کے دُنیا میں ہمیشہ قائم و دائم ہونے کا ایک ثبوت ہے اور چونکہ میں نے بہت اچھی ایک آیت بتلائی ہے اور اِس کی تشریح بھی شاندار طریقے سے کی ہے، اِس واسطے دو (۲) منٹ کا (Rest) مجھے ملنا چاہئے۔

ایک بہت عمدہ پوئنٹ مخصوص رکھا ہے اور اُس کا مقصد ہے کہ اسے میں پیش کروں جب کہ آپ کو تھوڑا سا تھکان محسوس ہوتا ہے اور بہت اہم پوئنٹ ہے، میں سچ کہتا ہوں [کہ] جب تشریح کروں گا تو آپ باور کریں گے زیادہ بڑے پیمانے پر تو قرآن کی (۲۵:۳۰)، میں ہے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ یَارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا۔ قیامت کے دن رسولؐ خدا سے عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار! میری قوم نے قرآن کو بے کار پکڑا تھا، میری قوم نے قرآن کو بے کار پکڑا تھا تو رسولؐ قیامت کے دن اپنی پوری اُمّت کے (Complain)(Against) کریں گے، کہ رسول کی اُمّت نے قرآن کو بے کار پکڑا تھا، وَقَالَ الرَّسُوْلُ یَارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا اور رسول کہے گا، یا پروردگار! میری قوم نے اِس قرآن کو بے کار پکڑا تھا۔ ''ھَجْر'' سے ''مَھْجُوْرًا'' پکڑا تو ہے، پکڑا تو تھا مگر بے کار۔ آپ اِس

کے فلسفے کو بخوبی سمجھتے ہیں، ہم مزید آپ کی مدد کریں گے اِس کے سلسلے میں اِس کی وضاحت کے طور پر اور کتاب جو سب سے بڑی کتاب ہے اُس کا حوالہ بھی دیں گے۔ اِس کے ترجمے میں کسی نے کچھ نہیں کیا، آپ ترجمے کو بھی دیکھیں، ریفرینس آپ کے سامنے ہے ایک ترجمہ نہیں چند ترجموں کو دیکھیں، اور خیالات کو تولیں کہ کون سا مترجم کیا کہتا ہے اور کونسا مفسر کیا کہتا ہے؟ آپ سب کو دیکھیں۔

ہمارے پیروں میں سے ایک عظیم پیر سیدنا ناصر خسرو قس نے اپنی کتاب زاد المسافرین میں اِس آیت کی وضاحت کی ہے، زاد المسافرین کتاب، یہ آپ کا ریفرینس ہے، اور اِس آیت کے اندر ایسی حکمت ہے اور اِس آیت میں لوگوں کو اِس طرح گھیرے میں لیا ہے کہ وہ کوئی اور منطق نہیں بنا سکتے ہیں۔ ابھی صرف اِس کی تشریح باقی ہے آپ جانتے ہیں کہ کوئی قوم ہے یا کچھ لوگ ہیں اور اُن لوگوں کا کوئی سردار ہے تو [قرآن] کبھی اُن کو (Blame) کرتا ہے، اُن کی کسی کمزوری، سستی یا نافرمانی کی بنا پر اُن کو (Blame) کرتا ہے، تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب کے سب نافرمان ہیں، کچھ فرمانبردار بھی ہو سکتے ہیں لیکن اُس لیڈر کا نظریہ (As a whole) ہوتا ہے تو (As a whole) نافرمانوں کے درمیان میں فرمانبردار بھی آتے ہیں، چونکہ یہ بات بھی (As a whole) ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی ایک نے بھی قرآن کو نہیں سمجھا اور اُس پر عمل نہیں کیا اور اُس کی حکمت سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور قرآن کے ظاہر اور باطن کو اہمیت نہیں دی گئی، یہ بات نہیں ہے۔ ابھی ابھی میں نے جو نقشہ بنایا تھا اور اُس نقشے کے اندر جتنے لوگ ممکن تھے اُن سب لوگوں کی بات ہے یہ جتنے لوگوں کو اُمّت کہنا چاہئے اُس اُمّت کی بات ہے کہ خداوندِ عالم کے حضور میں قیامت کے دن رسول اللہؐ فریاد کریں گے کہ اے پروردگارا! میری اُمّت نے قرآن کو بے کار پکڑا، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے ظاہر پر عمل تو ہو چُکا لیکن اِس کے باوجود پیغمبر شکایت کرتے ہیں یہ بہت اہمیت والی بات ہے، یہ بڑا اہم پوئنٹ ہے، اِس کے باوجود رسولؐ کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ کیوں شکایت کرتے ہیں؟ کیوں فریاد کرتے ہیں؟ اِس لئے کہ قرآن کی حکمتوں کو نہیں سمجھا اور اُن کے سمجھنے کے لئے جو وسیلہ تھا اُس کے لئے انہوں نے اقرار نہیں کیا، قرآن کے ظاہر پر تو عمل ہو گیا اور ہوتا رہا ہے لیکن قرآن کے اندر جتنے معنی تھے جتنی حکمتیں تھیں جو ہر زمانے کے لئے اُس میں ہدایت تھی اُس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور جس طرح کہ ابھی کئی آیتوں میں ہم نے یہ سوال اٹھایا، (Point out) کیا کہ اِس کے اندر ہر قسم کی ہدایت موجود ہے لیکن کاش! لوگ معلّمِ قرآن کو بھی سمجھ پاتے تو کتنا اچھا ہوتا، کہ آج مسلم قوم بہت غالب اور فاتح قوم ہوتی، تو یہ کمی رہی یا نہیں رہی، اِس کے بارے میں پیغمبر کو افسوس ہوگا یا نہیں ہوگا؟ ضرور افسوس ہوگا اور جس کا نہ صرف اشارہ ہے۔۔۔۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: نورِ قرآن

کیسٹ نمبر: Q-3C تاریخ: ۳۱؍ دسمبر؍ ۱۹۷۷، کینیڈا

جنہوں نے قرآن کے ظاہر پر بھی عمل کیا اور باطن پر بھی عمل کیا، کیا وہی لوگ صرف پیغمبر کی قوم کہلاتے ہیں اور دُوسرے لوگ پیغمبر کی قوم نہیں ہیں؟ تو پھر اِس صورت میں وہ سب لوگ پیغمبر کی قوم کے دائرے سے خارج ہو گئے، نکل گئے کیونکہ پیغمبر نے یہاں کہا ہے کہ: ’’قَوْمِی‘‘ (۲۵:۳۰) میری قوم نے۔ اب اس میں جن جن کو پیغمبر کی قوم ہونے کا دعویٰ ہے اور جنہوں نے قرآن کو پکڑا ہے اُن پر یہ الزام ہے۔ اِس میں بحیثیتِ مجموعی سب ہیں، سب ہیں لیکن اِس کے باوجود انفرادی حیثیت اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ اگر کسی مسلمان نے یا مسلمانوں میں سے کسی فرقے نے، کسی ایک جماعت نے صحیح کام کیا ہے تو اُس کو نجات ملے گی تو بحیثیتِ مجموعی یہ ایک بات تھی اور جو لوگ ایسے ہوں کہ انہوں نے قرآن کے ظاہر کو اور باطن کو نہیں سمجھا ہے تو اُن پر (Blame) آئے گا اور اِس کے گھیرے سے کوئی شخص نکل نہیں سکتا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ قرآن کے اندر کیسی کیسی حکمتیں ہیں تو اسماعیلیہ ایسوسی ایشن نے جو یہ سلسلہ رکھا ہے واعظوں کا اور سیمیناروں کا اور (Discussion) کا، اِس کا مقصد یہی ہے کہ ہم قرآن کو اسماعیلی نکتۂ نگاہ سے دیکھیں اور معلوم کریں کہ اُس میں اسماعیلیت کی حکمتیں کیسی ہیں اور کس طرح اُن سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ میں یہاں پر رُکتا ہوں اور پھر اِس کے بعد اِن شاءاللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

علم اور حکمت کے سلسلے میں ایک نقشہ تیار ہوتا ہے، تو انسان اپنی تمام قوتوں کو اُس کی طرف مرکوز کرتا ہے اور پوری طرح سے توجّہ دیتا ہے پھر سمجھتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں آپ جانتے ہیں کہ جو کامیاب ادارے ہیں وہ (Audio Visuals) وغیرہ سے کام لے کر سکھلائی وغیرہ کا کام کرتے ہیں، یہ بات اب سے نہیں ہے بلکہ بہت پہلے سے ہے۔ آپ جب اسماعیلی کتابوں کو دیکھیں گے تو بعض کتابوں میں نقشے بھی ہیں، مثلاً ہمارے ایک داعی نے جو سیدنا حمید الدّین کرمانی ہیں انہوں نے ایک چوٹی کے فلسفے کی کتاب لکھی ہے جو عربی میں ہے، جس میں سے ایک (Chapter) پر ہمارے محترم فقیر صاحب کام کر رہے ہیں جو کہ نظریۂ توحید سے متعلّق ہے۔ اُس کتاب میں بہت سے نقشے ہیں اور اچھی طرح سے مطلب واضح ہو جاتا ہے، اور حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ اُن نقشوں کا تقاضا کیا ہے۔ اِسی طرح ایک نقشہ ہے میں آپ کو جس

کی تشریح کرنا چاہتا ہوں، تو دیکھئے سب سے پہلے سب مسلمان روزانہ تقریباً پانچ مرتبہ یا اِس سے زیادہ پڑھتے ہیں: اھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ (۱:۵)۔ اِس کا کیا مطلب؟ یہ بہت عالیشان فلسفہ ہے جو جاننا چاہئے چونکہ [یہ] بنیادی ہے اور ہر چیز بنیاد میں بہت اہمیّت رکھتی ہے، اور خصوصاً عقائد اور نظریات کو بنیاد سے سمجھ لیا جائے، تو اُس سے بہت ہی فائدہ ہوتا ہے۔ میں خیر خواہی سے کہتا ہوں اور صداقت سے عرض کرتا ہوں، کہ اِس چیز کے جاننے میں بڑے فائدے ہیں، اھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ (۱:۵) کے معنی پر بہت سے لوگوں نے توجّہ نہیں دی ہے حالانکہ لگتا یوں ہے کہ یہ بہت آسان بات ہے کہ ''خداوندا! ہم کو راہِ راست بتلا'' لیکن یہ بہت مشکل چیز ہے۔ اِس لئے کہ کوئی شخص کس طرح کہتا ہے اور کن معنوں میں کہتا ہے، کوئی شخص اِس رستے پر قائم رہتے ہوئے کہتا ہے کہ خدایا! ہم کو راہِ راست بتلا یا یہیں سے، کہیں سے کہتا ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ میں نے یہ نقشہ اِس لئے بنایا ہے کہ ایسی بنیادی حقیقتوں کی طرف آپ کی توجّہ مبذول ہو۔ اھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ (۱:۵) کوئی یہاں رہتے ہوئے، یہاں رہتے ہوئے اِس رستے سے باہر رہتے ہوئے کہتا ہے یا یہاں سے کہتا ہے، اگر یہاں سے کہتا ہے، کہ خدایا ہم کو راہِ راست دکھلا تو یہ ایک ایسی طلب ہوگی کہ ایک شخص ہاتھ میں کوئی چیز لیتا ہے اور کہتا ہے کہ خدایا مجھ کو یہ دو میں نے تجھ کو دے دی ہے یہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اِس کی کوئی منطق نہیں بنے گی اور اگر یہیں کہیں سے کہا جاتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے، کیسے ممکن ہے کہ جو لوگ رسولؐ کے دین میں ہوں اور خدا کے رستے پر ہوں [اور] وہ کہتے ہوں کہ خدایا ہم کو راہِ راست دکھا۔ آپ نے کبھی غور فرمایا تھا اِس سلسلے میں، جنہوں نے غور فرمایا تھا وہ ہاتھ اُٹھائیں مہربانی کر کے، آپ نے غور نہیں فرمایا تھا، ٹھیک ہے، تو یہاں سے نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو راہِ راست بتلا، یہ تو غیر مسلم کو یوں پڑھنا چاہئے یا تو الحمد، غیر مسلم یہ پڑھیں: اِھدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیمَ (۱:۵) کسی بھی زبان میں کہیں، عربی میں کہیں، فارسی میں کہیں کسی بھی زبان میں کہیں، نہیں کہا جاتا ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ غیر مسلم کہتا ہو ساتھ والی جو آیت ہے وہ تصدیق نہیں کرتی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۞ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞ مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۞ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۞ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱:۱۔۵)۔ یہ اِس میں غیر مسلم کی بات نہیں ہے، کیونکہ سب تعریف خدا کی ہے جو ربّ العالمین ہے، جو رحمان و رحیم ہے، جو قیامت کے دن کا مالک ہے اور پھر اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (۱:۴)۔ ہم تجھ کو توحید سے پرستش کرتے ہیں، یہ تو مومن کی بات ہوئی، یہ تو مسلمان کی بات ہوئی غیروں کی بات نہیں ہے کہ ہم تجھ کو، تیری توحید میں پوجتے ہیں اور تجھ سے مدد چاہتے ہیں، اِس سے لگتا یہ ہے کہ یہ جو دُعا مانگتے ہیں ایسے لوگ ہیں جو یہاں کہیں ہیں پھر اِس کے کیا معنی کہ وہ راہِ راست پر ہیں، پھر کہتے ہیں ہم کو دکھا، ہم کو راہِ راست دکھا، دکھا تو دیا ہے اسلام ہے، اسلام ہے، پیغمبر کا راستہ ہے، اور پھر کیا وجہ ہے کہ روز، روز، روز یہی دُعا مانگی جاتی ہے۔ اِس کے معنی ہیں کہ دکھا نہیں چلا، چلا ہم کو راہِ راست پر ترقّی دے اور آگے سے آگے بڑھا (Guide us)۔ (Guide us) کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

آگے بڑھا، منزل تک ہم کو پہنچا اِس کے معنی یہ ہیں، کیونکہ اگر ہم کہیں کہ راہِ راست دکھا، تو اُس میں یہ امکانیت بھی ہوسکتی ہے کہ کوئی یہاں کہیں پر ہے اور جس کو راہِ راست کا پتا نہیں ہے، اور راہِ راست سے باہر ہے، راہِ راست سے باہر ہے، جو کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ خدا اُس کو دکھائے ایسی بات نہیں ہے۔ آپ قرآن کے ترجموں میں جائیں گے تو کچھ کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے، چلا ہے، دکھا نہیں چلا، آگے بڑھا اور انگلش میں شاید اِس کا یہی ایک لفظ کافی ہے اردو میں کافی نہیں ہے۔ دکھا اور چلا یہ دو الگ الگ لفظ ہیں لیکن انگلش میں (Guide us) یہ شاید صحیح ہے اِس کے علاوہ بھی کوئی لفظ ہو سکتا ہے لیکن میں اُس کو نہیں جانتا ہوں، مفہوم کو اور مطلب کو جانتا ہوں۔

اچھا ہم مان گئے کہ ''اِھْدِنَا'' کا مطلب ہے کہ ہم کو راہِ راست پر آگے سے آگے بڑھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵:۱) کے جو معنی ہیں وہ اسماعیلی نظریے کے موافق ہیں یا غیر اسماعیلیوں کے (Favour) میں ہیں، آپ دیکھیں، میں تو یہ کہوں گا کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵:۱) کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مومنین نے یہ دُعا گزاری تھی، کہ انہوں نے اپنے وقت میں ترقّی کی اور اُن کے جانشینوں نے ترقّی کی اور کرتے کرتے وہ یہاں تک آئے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں یہاں اِس منزل میں تھے، یہ صراطِ مستقیم ہے خدا کا رستہ اسلام اور اِس کی پہلی منزل یہاں تک ہے، دُوسری منزل پہلی منزل شریعت ہے، دُوسری منزل طریقت، تیسری منزل حقیقت اور آخری منزل معرفت ہے جو یہاں ہے، اور اِس دُعا کا مطلب ہے کہ کوئی مومن ترقّی کرے شریعت سے طریقت میں، طریقت سے حقیقت میں اور حقیقت سے معرفت میں اور وہاں سے خانۂ حکمت میں داخل ہو جائے، کیونکہ رستے کا مقصد کوئی (Destination) ہوتا ہے یا باغ یا گھر یا بنگلہ یا کوئی شہر، کوئی بھی منزل، یہ تصوّر ہے، یہ اشارہ ہے۔ جب اسلام کی مثال ایک رستے سے دی گئی ہے تو سمجھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ اِس کا مقصد کوئی منزل ہے، کوئی آرام کی جگہ ہے، جس کی طرف جانے کے لئے یہ رستہ مقرّر ہے، اِس کے بغیر رستے کا سوال ہی نہیں ہے اور وہ منزل بھی پیغمبر ہی بتلا سکتے ہیں اور انہوں نے بتلایا کہ: اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا (مشکوٰۃ، جلد پنجم، حدیث نمبر: ۷۱۱)۔ چونکہ قرآن کی وضاحت حدیث سے ہوسکتی ہے اور ایک ہی حدیث کئی کئی آیتوں کو (Cover) کرسکتی ہے تشریح کے لحاظ سے تو اِس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵:۱) کی تشریح ہے یہ جو فرمایا گیا کہ: اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا۔ میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اُس کا دروازہ ہے۔

اگر یہ بات دُرست ہے اور یقیناً دُرست ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ سب حکمت پیغمبر کے نور میں ہے، کبھی شاید پچھلی دفعہ ہم نے یہ نقشہ آپ کو بتایا تھا، کہ دو دائرے کے اِس طرح لکھنے سے تیسرا ایک دائرہ بنتا ہے، چنانچہ امامؑ اور پیغمبر اسی طرح ایک دُوسرے سے قریب ہیں، یہ امامؑ کی شخصیّت ہے اور یہ رسولؐ کی شخصیّت ہے یہ اُن دونوں کی رُوحانیت ہے جہاں پر کہ نور ہے، یہی نور خدا کا نور، یہی نور قرآن کا نور، یہی نور پیغمبر کا نور اور یہی نور امام کا نور، نور ایک ہے، تو اِس نور کی روشنی

میں حکمت ،علم سب کچھ یہیں پر ہے اور علی خود گائیڈ ہیں اور علی خود گیٹ ہیں ،علی گائیڈ بھی ہیں ،علی گیٹ بھی ہیں ۔گیٹ کے بارے میں ابھی میں نے آپ کو حدیث بتلائی :اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا ،تو گائیڈ کے بارے میں میں آپ کو بتاؤں : یا علی! الصراط صراطك والموقف موقفك [54 : قال: وروى البرقي في كتاب الآيات عن أبي عبد الله عليه السلام أن رسول الله صلى الله عليه وآله قال لأمير المؤمنين عليه السلام: يا علي أنت ديان هذه الأمة، والمتولي حسابهم ، وأنت ركن الله الأعظم يوم القيامة، ألا وإن المآب إليك، والحساب عليك والصراط صراطك، والميزان ميزانك، والموقف موقفك (بحار الانوار،عربی ،علامہ باقر مجلسی ،جلد: ۲۴،ص: ۲۷۲)] ۔ اے علی ! جو رستہ ہے وہ تیرا رستہ ہے اور جو منزلیں ہیں وہ تیری منزلیں ہیں اور جو منزلِ مقصود ہے وہ تیرا منزلِ مقصود ہے ۔ پھر سے سنئے ،یا علی! الصراط صراطك والموقف موقفك ،اے علی ! جو رستہ ہے یعنی اسلام کا رستہ یعنی صراطِ مستقیم وہ تیرے رستے کا نام ہے ،یعنی تیری ہدایت جس طرف سے جا رہی ہو وہ صراطِ مستقیم ہے اور تو ہی صراطِ مستقیم ہے اِس معنی میں ،اور جہاں پر ٹھہرنے کی جگہ ہے وہ بھی آپ ہی کی ٹھہرنے کی جگہ ہے ،یہ موقف ،یہ منزلیں ،یہ رستہ سب علیؑ کا ہے تو رسول اللہؐ نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو جمع کیا تھا اور اُن کو (Starting point) پر یہاں رکھا تھا ۔ اب ذرا اِس میں وہ (Show) کریں ،جو مختلف مذاہب کے لوگوں کو رسول اللہؐ نے دعوت دی تو ہر طرف سے لوگ آئے اور جہاں پر رسول اللہؐ کی دعوت ہے ،یہ رسول اللہؐ کی دعوت کی شکل ہے ،صورت ہے ،تو یہاں پر جمع ہو گئے ،کہاں جمع ہو گئے ،شریعت میں جمع ہو گئے ،لیکن اب تک وہ وہاں پر ہیں اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا ،حالانکہ خدا اور رسولؐ نے اسلام کو ایک رستے کی طرح پیش کیا تھا تا کہ وہ سمجھیں ۔ اب یہ جو آیت ہے :اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱:۵) تو اِس کا مطلب قرآن میں ایک جگہ پر نہیں ہے ۔ بہت سی جگہوں میں ہے یعنی جہاں پر صراطِ مستقیم کا ذکر ہے وہ بھی اِس کے بارے میں ہے ،جہاں پر گمراہی کا ذکر ہے وہ بھی یہی مضمون ہے ،جہاں پر ہادی کا ذکر ہے ،ہادی ،گائیڈ وہ بھی یہی ہے ،جہاں پر سبیل اللہ ،خدا کے رستے کا ذکر ہے وہ بھی یہی ہے اور جہاں پر اسلام کا ذکر ہے وہ بھی یہی ہے ،جہاں پر دین کا ذکر ہے وہ بھی یہی ہے ،جہاں پر خدا کے نور کا ذکر ہے وہ بھی اِسی رستے پر چلنے کے لئے ہے ،جہاں پر خدا کی کتاب کا ذکر ہے وہ بھی یہی رستہ بتلاتی ہے ،جہاں پر قرآن ہے وہ بھی یہی ہے ،جہاں پر فرمانبرداری کا ذکر ہے وہ بھی یہی ہے ،تو غرض یہ کہ قرآن کے اندر کوئی حکم اِس رستے سے الگ اور جدا نہیں ہے ،جہاں پر تاریکی کا ذکر ہے وہ بھی اِس سے بھٹک جانے کا ذکر ہے ،اور جہاں پر علم کا ذکر ہے وہ بھی یہی ہے کہ علم آگے بڑھنے کا ہے ،اور جہاں پر پیغمبر کی پیروی ،پیغمبر کے پیچھے پیچھے چلنے کا ذکر ہے وہ بھی یہی ہے ۔ غرض یہ کہ میں نے ایک جگہ پر دعویٰ کیا تھا تحریر میں اور لکھا تھا کہ ہزاروں سوالات کے جوابات اسی نقشے کی مدد سے نقشہ سامنے رکھ کر بتلائے جا سکتے ہیں ،ہزاروں سوالات کے جوابات اسی نقشے کے اندر اور اسی نقشے کی روشنی میں بتلائے جا سکتے ہیں ،

تو یہ ہے اور علم کا تعلّق اِس سے اِس لئے ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ : اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُہَا ،(شرح الاخبار، جلد:۱،صفحہ:۸۹) ۔مشہور حدیث ہے میں علم کا شہر ہوں (I am the city of the knowledge and Ali is its gate) ، میں آپ کو ہنسانے کے لئے کوشش کرتا ہوں مجھے شوق نہیں ہے انگریزی کا ،اب تو اِس عمر میں کیا انگریزی سیکھنا ہے، مقصد یہ ہے کہ ایک لطیفہ بن جائے اور درمیان میں ہنس پڑیں، تو بہر حال یہ آپ کے سامنے ہے: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱:۵) کا مطلب یہ ہے کہ آگے بڑھیں جب آگے بڑھنے کا تصوّر صحیح ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ صراطِ مستقیم کس چیز پر واقع ہے۔(Where is it?) یہ صراطِ مستقیم کہاں ہے اور کہاں سے یہ صراطِ مستقیم چلا آرہا ہے؟ بہر حال رستہ کہیں ہوتا ہے نا! اُس کے لئے تو جگہ کی ضرورت ہے، یہ زمان [یعنی] زمانے کے درمیان سے گزرتا ہے اور اِس کی مسافت یعنی (Distance) رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر قیامت تک ہے (As a whole) کہاں سے ہے، ویسے تو ازل سے ہے لیکن اسلام کے لحاظ سے یہ رسول اللہؐ کے زمانے سے قیامت تک ہے اور یہ زمانے کے اُوپر ہے جب اسلام کا یہ رستہ زمانے کے اُوپر ہے (It is upon the time, upon the age) تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ مسافر کے لئے جیسے جیسے رستے کا ماحول بدلتا ہے وہ ویسے ویسے اپنی تیاری کو (Change) کرتا ہے۔ گرم علاقہ ہو تو ہلکے کپڑوں سے ملبوس ہو جاتا ہے اور کینیڈا کی طرح ٹھنڈا ہو تو پہنوا اور پہنوا اور لباس پر لباس پہنو حتیٰ کہ اوور کوٹ پہنوا اور کچھ تو ہو اور گرم غذائیں بھی کھاؤ، تو اگر یہ زمانے کے اُوپر ہے اور ہر بار اِس کا ماحول بدلتا جاتا ہے تو اُس ماحول کے مطابق تیّاری بھی ہوگی۔ سامانِ سفر جو ہیں وہ الگ الگ ہوں گے یعنی رسول اللہؐ کے زمانے میں جو کچھ ماحول تھا اِس کے مطابق بعد کے زمانے میں اور اِسی طرح۔

اب میں تاریخی پروف پیش کروں گا، رسول اللہؐ کے زمانے میں بے شک ہر چیز کی امکانیت تھی اور شریعت کے علاوہ طریقت، حقیقت کی بھی تعلیمات دے دیا کرتے تھے سب کو نہیں کچھ لوگوں کو۔ آپ کو علماء نے واعظین نے مشنریوں نے بتلایا ہوگا ایک بات کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں نجویٰ کا طریقہ تھا (۵۸:۱۲)۔ نجویٰ، اب میں پوچھتا ہوں اُستاد سے کہ نجویٰ کا کیا ترجمہ ہو سکتا ہے (Private talk or to get secrets from Prophet) کچھ مہمانی پیش کی جاتی تھی اِس کا نام قرآن میں صدقہ ہے (۵۸:۱۳) صدقہ کوئی بُری چیز نہیں ہے یہ لفظ ''صدق'' سے ہے، تو اُس کے بعد پیغمبر کے ساتھ راز داری ہوتی تھی، راز داری ہوتی تھی، جس طرح آج امامؑ بول کے سلسلے میں اسمِ اعظم کے دینے کے بارے میں مخصوص ٹولیوں کو یا افراد کو لیتے ہیں، اور اُن کو ہدایت، اسپیشل ہدایت دیتے ہیں جو کہ وہ اسپیشل ہدایت اجتماع سے الگ ہوتی ہے اسی طرح رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی یہ ہوا کرتا تھا۔ اب کوئی بتلائے کہ اِس میں کیا راز تھا

کہ رسول اللہؐ سب مسلمانوں کو چھوڑ کر کچھ مخصوص افراد کو الگ طریقے سے کچھ باتیں بتلایا کرتے تھے۔کیا یہ بات ممکن ہے کوئی کہے کہ وہ دُنیا کی باتیں تھیں یا خانگی امور تھے،نہیں! دُنیا کی اگر باتیں ہوتیں تو وہ (Open) تعلیم ہوتی،اور خانگی امور ہوتے تو اُن کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں خصوصی تعلیم تھی، اسمِ اعظم دیا کرتے تھے اور حقیقت کی تعلیم دیتے تھے،اگر ہم کہیں کہ حقیقت کی تعلیم بہت زیادہ نہیں دیتے تھے اور صرف اسمِ اعظم دیتے تھے تو بھی یہی بات ہوتی ہے کہ اسمِ اعظم سے وہ یہ چاہتے تھے کہ رُوحانی طور سے اُن سے رابطہ رکھیں اور حقیقت کی، نورانیت کی، رُوحانیت کی تعلیم دیں،اگر اُس وقت (Level) ایک جیسا ہوتا اور سب مسلمان اِس قابل ہوتے تو پیغمبر کو چاہئے تھا کہ جو کچھ وہ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں وہ (Open) کریں تا کہ سب یکسان ہوں،تو یہ بات نہیں ہے اُس کے لئے کچھ خاص لوگ تھے تو اِس لئے رسول اللہؐ کچھ لوگوں کو الگ الگ تعلیم دیا کرتے تھے۔جس طرح کہ ابھی ابھی ایک آیت آپ کے سامنے پڑھی گئی اور اُس کی تشریح کی گئی کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کچھ لوگ تھے وہ صبح وشام کی عبادت کرتے تھے، وہ دیدار کے لئے جدوجہد کرتے تھے جس طرح آپ ''بیتُ الخیال'' میں اور ''بڑے کام'' میں دیدار کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور اِسی طریقۂ نجویٰ میں بھی یہی بات ہے،تو میں نے یہ اِس لئے کہا کہ رسول اللہؐ کا منشا تھا کہ لوگ آگے بڑھیں،آگے سے آگے بڑھیں اور اِس کا پُروف یہ ہے کہ رسول اللہؐ کچھ مخصوص لوگوں کو مخصوص تعلیمات دے دیا کرتے تھے،لیکن دُوسرے لوگ یہیں پر ٹھہرے رہے اور اب تک یہیں پر ہیں اور اِس کے نتیجے کے طور پر بعد میں تصوّف کے نام سے ایک طبقہ اُبھرا،یہ ثبوت ہے کہ اسلام کے اندر آگے بڑھنے کی گنجائش ہے،اگر گنجائش نہیں ہے تو وہ اہلِ طریقت کیوں کہلائے، اُن کو چاہئے تھا کہ شریعت سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھتے جو صوفی لوگ ہیں۔میں ابھی فی الحال اسماعیلیت کی بات نہیں کرتا ہوں،طریقت کی بات کرتا ہوں،صوفیوں کی بات کرتا ہوں،کہ وہ کہاں سے اُبھرے،کدھر سے آئے،کہاں سے پیدا ہوئے،اسلام ہی سے پیدا ہوئے اور ایک زمانہ وہ تھا جس میں کہ صوفیوں کا بہت چرچا تھا یہ ایک ترقّی تھی اسلام کی ہم مانتے ہیں تصوّف ہے اسلام کے اندر،اور بہت اچھی چیز ہے،ہم بعض دفعہ صوفیوں سے مثالیں پیش کرتے ہیں،مولائے رومؒ سے اور عطارؒ سے اور دُوسروں سے اِس لئے تا کہ اِن کو سمجھائیں،اِن کو سمجھائیں،اِن کے ذریعے سے،آپ کی باتوں سے اُن کو نہیں سمجھا سکتے ہیں،دو منزل،دو منزلوں کی باتیں وہ کس طرح سمجھ سکتے ہیں،کسی کو آگے بڑھانا ہے تو یہاں سے بتائیں گے،بعد سے نہیں اور اِن کو بتانا ہے تو یہاں سے بتائیں گے اور اِن کو کچھ بتانا ہے آگے بڑھانا ہے تو یہاں سے مثال دیں گے۔لہٰذا شریعت کو سمجھانے کے لئے ہم صوفیوں کی مثالیں بتلاتے ہیں جبکہ صوفی ہم سے پیچھے ہیں ایک منزل پیچھے ہیں۔مولانے فرمایا ہے کہ تصوّف طریقت ہے،ہمارا دین حقیقت ہے[دارالسّلام،۲۹۔۹۔۱۸۹۹ء]۔ہمارے جو بزرگ ہیں وہ معرفت،اور اُس نور تک رسا ہیں،پہنچے ہوئے ہیں،ہم عوام یہاں پر ہیں،ہمارے دین کے جتنے بزرگ گزرے ہیں اور جو

حقیقی مومنین ہیں وہ یہاں سے یہاں تک رسا ہیں اور امام کا مقام یہ ہے، تو جو صوفی ہیں وہ ہم سے پیچھے ہیں، اہلِ طریقت ہیں، اور جو اہلِ شریعت ہے وہ یہاں ہیں۔ اسلام جب ایک رستہ ہے خدا کی طرف جانے کے لئے، تو اِس میں طبقات و درجات ثابت ہیں، درجات ثابت ہیں، انہوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ ہم اہلِ حقیقت یا اہلِ طریقت ہیں وہ تو اِس کو نہیں مانتے ہیں وہ کہتے ہیں شریعت ہے، انہوں نے کہا اعلان کیا کہ ہم اہلِ طریقت ہیں اور یہ تو اہلِ حقیقت ہیں اور یہاں اہلِ معرفت ہیں، یہ سب کے سامنے ہیں یہ کوئی، اِس میں کوئی اُلجھن نہیں ہے بالکل واضح ہے، ایک نقشہ ہے، ایک ڈایا گرام ہے، تو اِس سے قرآن کی دُوسری باتیں بھی ہم سمجھ سکتے ہیں کہ امام کہاں ہیں اور شخصیت کے لحاظ سے کس طرح امامؑ ثابت ہیں پیغمبر میں اور نور کے لحاظ سے پیغمبر سے کس طرح وابستہ ہیں جہاں پر قرآن ہے قرآن کی رُوح ہے یہاں پر نور ہے، ہدایت ہے اور سب کچھ۔

اب اُس آیت کو بھی اِس کے ساتھ ملائیں خدا نے جو کہا ہے کہ: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۴:۳۵)۔ یہ ایک مثال ہے مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ (۲۴:۳۵)۔ اُس کے نور کی مثال ایک جلتے ہوئے روشن چراغ کی طرح ہے جو کہ ایک طاقچے میں ہو اور طاقچے کے بارے میں بتلایا تھا کہ (Niche) کہتے ہیں انگریزی زبان میں، وہ ایک (Niche) میں ہے زمانہ قدیم میں گھر کے اندر یہاں ایک جگہ ہوتی تھی یہاں اُس میں چراغ رکھتے تھے۔ اُس آیت کے اندر خدا نے کہا ہے کہ میرا نور ایک گھر میں ہے، کس گھر میں ہے؟ میرے گھر میں، آپ کے گھر میں، اِن کے گھر میں، اُن کے گھر میں، کس کے گھر میں؟ وہ خانہ حکمت یہ ہے یہ گھر ہے، اِس گھر کے اندر ہے خدا کا نور اور یہیں پر ہے، تو اُس نور کی طرف رستہ جاتا ہے اور اگر آپ کو نور نظر آیا ہے تو مبارک ہو، کہ آپ نے انفرادی طور پر یہ منزلیں طے کیں اور آپ یہاں تک پہنچ رہے ہیں اور یہاں سے آپ کو روشنی نظر آ رہی ہے، نور ایک جگہ پر ہے۔ بہت سی جگہوں میں نہیں ہے۔ اب ہم ترجمے کے لئے انتظار کرتے ہیں تا کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کے لئے موقع ملے۔

ایک بات مجھ سے فراموش ہوگئی تھی وہ یہ کہ تواریخی طور پر یہ بتانا تھا کہ جس طرح تصوّف ایک مخصوص وقت میں اُبھرا اُسی طرح حقیقت کا اعلان کب ہوا، کب حقیقت کا ظہور ہوا اُس کی طرف بھی ایک اشارہ کرنا تھا۔ چونکہ یہاں ایک ترتیب ہے، پہلے شریعت ہے اُس کے بعد طریقت اور پھر حقیقت، اگرچہ اِن تمام باتوں کی امکانیت رسول اللہؐ کے زمانے میں تھی تاہم اِس کے لئے ایک (Period) بھی ہونا چاہئے تواریخ کے لحاظ سے، تو جس طرح ایک خاص زمانے میں آپ تواریخ پڑھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ صوفیوں کا چرچا کب ہوا، اسی طرح ایک وقت آیا جس میں کہ اسماعیلی مذہب میں حقیقت کا اعلان کیا گیا، یہ ایران کا (Period) تھا، الموت میں اعلان کیا گیا کہ اب دورِ قیامت ہے اور دورِ حقیقت ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ دُنیا جو پیچھے رہنے والے ہیں اُن کی بات نہیں ہے دُنیا تو اریخ یہاں تک آئی تھی اُس وقت، تو اِس سے

آپ کو ثبوت ملا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں صوفیوں نے کچھ اعلان تو نہیں کیا تھا وہ آگے چل کر اُن کا ظہور ہوگیا اور پھر حقیقت اگرچہ شروع سے تھی لیکن اُس کا اعلان اور برملا تبلیغ و دعوت ایک خاص وقت میں ہوئی اور وہ وقت ایران (Period) ہے اور اُس وقت حقیقت کا ظہور ہوا، یہ بات بتلانا تھا۔

اِس کے بعد ایک خاص آیت کی طرف آپ کو توجّہ دلائی جاتی ہے وہ آیت ہے پانچویں سورہ اور چوالیس آیت (۵:۴۴)۔ اُس میں ہے: وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ اور وہ کتاب پر گواہ تھے، قرآن پر گواہ تھے۔ آیت چھوٹی سی ہے مگر اِس میں بہت ہی اہم معنی ہیں بہت روشن حقیقتیں ہیں، یہ اماموں کی شان میں ہے، اماموں کی شان میں ہے، اور اماموں کی طرف سے پیروں پر اور بزرگوں پر اور اگلی قطار کے حقیقی مومنوں پر بھی اِس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اصل میں قرآن کا گواہ کون ہوسکتا تھا، ایسا کوئی شخص ہوسکتا تھا جو کہ پیغمبر کے ساتھ ساتھ موجود ہو، وہ غارِ حرا میں بھی موجود ہو، وہ معراج میں بھی موجود ہو، نزولِ قرآن کے وقت دیکھے اور پیغمبر کے دل میں جھانکے اور وحی کس طرح ہوتی ہے، جبرائیل کس طرح وحی لے آتے ہیں اور اُس جبرائیل کے ساتھ اور کوئی فرشتہ ہوتا ہے یا اکیلا جبرائیل ہوتا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ جبرائیل کے ساتھ میکائیل بھی ہو، اسرافیل، عزرائیل بھی ہو، یہ چاروں فرشتے ہوں اور دُوسرے فرشتے بھی ہوں، سب رُوحیں ہوں، تو اِس کو دیکھنے کے لئے اِس کو گواہ کے طور پر لینے کے لئے اِس بات کی ضرورت ہے کہ پیغمبر کی رُوحانیت میں کوئی جائے، پیغمبر کے باطن کو دیکھے، پیغمبر کے نور کو دیکھے، اُس زمانے کو پائے جو قرآن نازل ہونے کا زمانہ تھا، کیا ایسا ممکن ہے، ہاں! یہ سب سے پہلے امامؑ کے لئے ممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ "شُهَدَآ" وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (۵:۴۴) اور وہ قرآن پر حاضر تھے یعنی یہ قرآن جب نازل ہو رہا تھا وہ حاضر تھے، اُس قرآن کے نازل ہوتے وقت یا تو وہ اُس کے گواہ تھے، چونکہ "شُهَدَآ" دو معنی میں تھے اِس کے، ایک معنی ہیں حاضر اور ایک معنی ہیں گواہ، دونوں کا مطلب ایک ہے، کسی (Case) میں، کسی واقعہ میں جو حاضر ہو وہی گواہ بھی ہے اور جو گواہ ہے وہ حاضر بھی ہے، تو بہت عجیب حقیقت ہے جو ہم کو تصوّر ملتا ہے، کہ قرآن کے نزول کے وقت کچھ ہستیاں وہاں موجود تھیں۔ کہاں؟ وحی کے مقام پر اور جہاں سے وحی آتی تھی اور جہاں پر وحی پہنچتی تھی اور جبرائیل جس طرح وحی لاتے تھے، رُوحانیت کے مناظر کو، اُن کے جلوؤں کو، روشنیوں کو سب چیز کو وہ دیکھتے تھے۔

یہی مطلب دُوسری آیت میں بھی ہے اُس میں صیغۂ واحد میں ہے یہاں جمع میں ہے۔ اگر میں غلط بولتا ہوں تو (Correct) کرنا ابھی میں انگریزی شروع کر رہا ہوں (Please) وہ (Singular) میں ہے یہ (Plural) میں ہے (Am I right?) تو وہ (Singular) میں یہ ہے: وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۱۳:۴۳)۔ کافر لوگ کہا کرتے ہیں اے رسول! کیا آپ پیغمبر نہیں، آپ کہیں میں پیغمبر ہوں یا نہیں ہوں اِس کا گواہ خدا ہے، اُس نے دیکھا ہے، وہ جانتا ہے اور خدا کے ساتھ ساتھ ایک اور شخصیّت

گواہ ہے۔ وہ کیوں گواہ ہے؟ کیونکر گواہ ہوسکتا تھا؟ اُس کے پاس قرآن کی حقیقت کا علم ہے اُس نے دیکھا ہے تب گواہ ہے، تو یہ علیؑ کی شان میں ہے جو (Singular) میں ہے۔ دیکھئے! وہ بات بعد میں کریں گے کہ علیؑ کا مرتبہ کیا ہے اور خدا کا مرتبہ کیا ہے، آپ فی الحال اِس بحث میں نہ جائیں۔ قرآن کے سمجھنے کے لئے ایک (Formula) ہے یا (Theory) ہے، (Theory) یا (Theory any how) (May be any thing any pronunciation not important) تو جو (Theory) ہے وہ ایک مخصوص (Theory) ہے اُس کو ہم (Change) نہیں کر سکتے ہیں اور ہمارا جو آخری عقیدہ ہے وہ حقیقت کے مقام پر ہے ہمیں ترتیب سے بولنا ہے قرآن کی ظاہری زبان کے مطابق اور فلسفے کے مطابق بیان دینا ہے، یہ وہی چیز ہے اور کسی مومن کو یہ شک نہ ہو، کہ ہم شریعت بول رہے ہیں، شریعت بول رہے ہیں لیکن حقیقت کو اُجاگر کر رہے ہیں اُس میں سے۔ درخت کا ذکر کر رہے ہیں لیکن پھل بتلاتے تو مجھے درخت کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر پتّوں کا بھی ذکر کرتا ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے درخت کے ساتھ پتّے بھی ہیں اور چھلکے بھی ہیں سب چیز ہیں لیکن ہمارا مقصد پھل ہے تو پھل کے ذکر میں درخت کی سب باتیں آئیں گی، تو آنے دیجئے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ کافر کہا کرتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں پیغمبر نہیں ہیں، اے پیغمبر اُن کو بتلاؤ کہ میں پیغمبر ہوں یا نہیں ہوں اُس کا پتا خدا کو ہے اور اُس شخص کو ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔ یہاں پر کتاب کا علم ایک مخصوص شخص کے پاس نظر آتا ہے اِس آیت کی روشنی میں ایک، اور دُوسری بات یہ ہے کہ ایک شخصیّت ایسی نظر آتی ہے یعنی وہی شخص ایسا ہے جس کے پاس قرآن کا علم اِس معنی میں ہے، اِس لئے ہے کہ اُس نے دیکھا ہے، کیا دیکھا ہے؟ قرآن کو نازل ہوتے دیکھا ہے، جبرائیل کو دیکھا ہے، تو وہ علیؑ ہیں، وہ علیؑ ہیں، اچھا علیؑ ہے، تو یہاں علیؑ کی شخصیّت کا ذکر نہیں ہے، علیؑ کی شخصیّت کا ذکر ہے مگر نور کی وجہ سے ہے، علیؑ کی شخصیّت معراج پر کہاں تھی؟ علیؑ کی شخصیّت غارِ حرا میں کہاں تھی؟ لیکن چونکہ وہ نور محمدؐ اور علیؑ دونوں میں مشترک تھا تو اُس نور کی وجہ سے اور اُس نور کے وسیلے سے علیؑ معراج پر بھی تھے، علیؑ غارِ حرا میں بھی تھے، اور جہاں کہیں وحی نازل ہوتی تھی وہاں پر علیؑ کا نور موجود تھا، علیؑ اپنے نور سے اُس بات کو جانتے تھے۔ لہٰذا اب علیؑ کی شخصیّت کے بارے میں کہا گیا، کہ ایک شخصیّت ایسی ہے کہ خدا کے مرتبے کے ساتھ ساتھ اُس شخصیّت کا بھی اتنا مرتبہ ہے کہ وہ پیغمبر کی پیغمبری کا گواہ (Witness) ہوسکتا ہے اور گواہ ہوسکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہاں پر بالکل واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ علیؑ وہ ہیں جس نے قرآن کو بنیاد سے دیکھا ہے، قرآن کا نزول یہاں ہے، میں نے پہلے وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ بات ہوگی وہ نقشے پر میں بتلاؤں گا۔ قرآن کا ظہور اِس نور سے ہوا، جو کچھ ہوا یہیں ہوا۔ جب یہ نور امام کا نور ہے اور پیغمبر کا نور ہے، تو پھر اِن کو کیسے پتا نہیں ہوگا، اور یہی بات ہر امام پر اِس کا اطلاق ہوتا ہے اِس لئے یہاں صیغہ جمع میں ہے اور (Plural) میں ہے، وہ آیت جو ہے وہ (Singular) میں ہے، یہ آیت کہ وہ کتاب پر حاضر ہیں، یہ سب اماموں کے

بارے میں ہے اور امامؑ قرآن کی حقیقت اور تاویل اِس معنی میں جانتے ہیں کہ امامؑ کے سامنے وہ (Picture)، وہ نور حاضر ہے جو قرآن کے نزول کے وقت (Set) ہوئی تھی۔ امامؑ تو کیا امامؑ ہی ہیں ہمارے پیر بھی اِس حقیقت کو امامؑ کے بعد امامؑ کے وسیلے سے امامؑ کی رحمت سے اِس چیز کو جانتے تھے۔ پیر کیا پیروں کے بعد اگلی قطار کے مومنین بھی اِن چیزوں کو جانتے ہیں، اب بھی جانتے ہیں۔ ہمارے بھائیوں اور بہنوں میں سے جن حضرات نے روشنی دیکھی ہے اور کافی آگے ترقّی کی ہو وہ اگر چہ زبان سے وضاحت نہیں کر سکتے ہیں لیکن اُس (Sense) کو اور (Essence) کو جانتے ہیں، رُوح جانتے ہیں، اُس چیز کو دیکھتے ہیں لیکن وضاحت کرنے کے لئے (Interpret) کرنے کے لئے زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کی زبان سمجھیں، اصطلاحات کو سمجھیں، مطالب کو سمجھیں تو کوئی بیان بھی کر سکتا ہے، دیکھنے کے علاوہ، ایک شخص نے سب چیز دیکھی ہے لیکن دیکھی ہوئی چیز کو ظاہر نہیں کر سکتا ہے، کیونکہ اُس کو جس زبان میں ادا کرنا چاہئے وہ زبان نہیں ہے، اِس کے لئے اسماعیلیوں کو اور خصوصاً اُن لوگوں کو جو (Preacher) ہیں داعی ہیں اُن کو چاہئے کہ قرآن کی زبان کو سمجھیں تا کہ رُوحانیت کو قرآن کی زبان میں ادا کریں تو یہ تاویل ہوگی، اِس کا نام تاویل ہے، تو امامؑ کے پاس اسی طرح تاویل ہے کہ امام نور ہے اور نور میں قرآن کی (Movie) ہے، (Pictures) ہیں، صورتیں ہیں، تصویریں ہیں، اشارے ہیں۔

اب میں ذرا رُک کر چونکہ میں نے بتلایا کہ قرآن امام کے نور میں کس طرح ہے دو چار باتیں میں بتلاؤں گا آرام آرام سے۔ وحی کے معنی اشارہ، وحی کے معنی اشارہ، اشارے کو کیا کہتے ہیں (Sign)، (Signal) اور بھی (Indication)، (Hint also) اچھا! قرآن کے سلسلے میں وحی اِس معنی میں کہتے ہیں کہ اُس میں اشارے ہیں، مثالیں ہیں۔ اچھا، (Please I ask you Wahi) آپ اِس کا (Interpret) کریں، کوئی بھی، ذرا (Interesting) ہو ذرا آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اِس کے معنی بتائیں وحی، (One) اور بھی اِس کے معنی ہو سکتے ہیں (Signal thats right) اور (One) (Up Heaven) اور (Sky) اور (God) اور میں بہت اچھی بات بتلانا چاہتا ہوں (Please, please help me) اچھا۔ بہت اچھی بات میں بتلاؤں گا میں سچ بتلاتا ہوں میں بہت اچھی بات بتلاؤں گا، دیکھا اشارے کے اندر جتنے معنی سموتے ہیں وہ متعیّن لفظ میں سموتے نہیں ہیں، اگر میں ایک دم سے خود معنی بتلاتا اور معنی کو محدود اور (Limit) کرتا کہتا (One) تو آپ تشریح نہیں کر سکتے، آپ نے سمجھا کہ اشارے کے اندر جتنے معنی آتے ہیں اتنے معنی کسی چیز میں نہیں آتے ہیں، اُس میں بہت گنجائش ہوتی ہے اِس لئے کہا گیا کہ: العقل فی الاشارہ۔ عقل جو اعلیٰ سے اعلیٰ حقیقتوں کی صورت میں ہوا کرتی ہے اُس کی گنجائش اشارے میں ہے، وضاحت میں نہیں ہے چونکہ وضاحت ایک عام چیز بنتی ہے، اور اشارے میں بہت سے معنی ہوتے ہیں، اِس لئے وحی کا مطلب اشارہ ہے،

اور اشارے کے اندر بہت سی چیزیں آتی ہیں تا کہ بہت حکمت ہو بہت حکمت ہو قرآن کے اندر ۔لہٰذا خداوندِ عالم نے اشارے سے کام لیا ایک اشارے سے کام نہیں لیا، قرآن کے اندر تین چیزیں ہیں ۔ ذرا مضمون دلچسپ ہوگا مجھے وضاحت کرنے دیجئے، کہ تین (Stages) ہیں، (Revelation) کے قرآن کے (First of all) جبرائیل کے وسیلے سے آیات یعنی وحی آتی رہی اور (Second) میں پردے کے پیچھے سے خدا نے کلام کیا، کس سے؟ کس سے کلام کیا؟ حضرت نبیؐ سے کلام کیا یہ بھی قرآن کا ایک حصّہ ہے اور آخری مرحلے میں خدا کا ظہور ہوا اور اُس ظہور کی حالت میں کچھ خاص اشارے ہوئے اگر چہ وہ اشارے بہت زیادہ نہیں تھے وہ تھوڑے تھے، لیکن اُن اشاروں میں اتنا علم تھا، اتنی وسعت تھی، اتنی حکمتیں تھیں کہ بیان میں نہیں آسکتی ہیں، تو یہ (Three stages) ہیں ۔میں وہ آیت بتلاؤں وہ ریفرینس مجھے یاد نہیں ہے یہاں پر بعد میں بتلائیں گے [وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۚ (۴۲:۵۱)] آپ صرف اُس آیت کی امکانیت کو سننا، ''وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ ''کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے، ''اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ'' کہ خدا اُس سے باتیں کرے، ''اِلَّا وَحْيًا ''مگر وحی کے ذریعے سے خدا کسی انسان سے کلام کرسکتا ہے، ''اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ''یا پردے کے پیچھے سے کلام کرسکتا ہے، ''اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا'' یا کوئی رسول فرشتہ بھیج سکتا ہے، ''فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ''تو وہ رسول یعنی فرشتہ خدا کے حکم سے جو مناسب ہو وحی کرتا ہے، تو تین باتیں ہوگئیں یعنی خدا فرماتا ہے کہ کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ آمنے سامنے بیٹھے اور گفتگو کرے، یہ ممکن نہیں ہے کسی انسان کے لئے کسی عام انسان کے لئے مگر ممکن یہ ہے کہ خدا کا ظہور ہو اور ایک اشارہ اُس کو دیا جائے اُس آدمی کو انسان کو اور دُوسری یہ امکانیت ہے کہ پردے کے پیچھے سے خدا کلام کرے دُوسری امکانیت یہ ہے اُوپر سے نیچے کی طرف ہے یہ اور تیسری امکانیت یہ ہے کہ کوئی پیغامبر آئے یعنی جبرائیل جیسا کوئی فرشتہ آوے اور وہ وحی لائے ۔ یہ بات ایسی ہے کہ جنرل ہے سب پیغمبروں کے لئے بھی ہے، سب انسانوں کے لئے بھی ہے اور آنحضرتؐ کے لئے خود ہے ۔ دیکھا اُصول کو (۴۲:۵۱) انہوں نے بتلایا ہے ریفرینس، آپ ذرا پڑھیں :وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۚ (۴۲:۵۱)۔کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے

(Not possible for human being)(It is not fitting for a man that God should speak with him except by inspiration, or from behind a veil, or by sending of a messenger to reveal, with God's permission, what God wills)اور شروع میں جو بتلایا (Revelation) ترجمہ کیا ہے وہ وحیَ خاص ہے ایک وحیَ عام ہے، ایک حجاب کے پیچھے سے کلام کرنا ہے تو تین صورتوں میں خداوندِ عالم کلام کرتا ہے ۔

اصل میں ہم کس پوئنٹ سے روانہ ہوتے تھے وہ یہاں سے روانہ ہوئے تھے کہ کتاب پر کس طرح امامؑ حاضر ہے، کتاب، آسمانی کتاب، قرآن امامؑ کے سامنے کس طرح سے ہے۔ آگے چل کر ہم نے وحی کی تشریح شروع کی تھی تو وحی کسے کہتے ہیں؟ اشارہ اور وہ اشارہ دو طرح سے ہے، ایک خصوصی اشارہ ہے کہ جب خداوندِ عالم کے نور کا ظہور ہو جاتا ہے اُس کا جلوہ سامنے آتا ہے تو اُس میں کچھ خاص اشارے ہوتے ہیں یا ایک اشارہ ہوتا ہے وہ اشارہ اتنا دُور رس ہے، کس قدر ہمہ گیر ہے کہ اُس کے اندر تمام حکمتیں سمٹ سمٹ کر سمو جاتی ہیں وہ اشارہ خدا کا اشارہ، اتنا وسیع معنی رکھتا ہے اتنا وسیع ہے، اور دُوسرا پردے کے پیچھے سے خدا بالکل کلام کرتا ہے پردے کے پیچھے سے، اور اِس کے نیچے شروع میں جبرائیل فرشتے کے ذریعے سے وحی آتی ہے تو قرآن اِن تین (Stages) کا نتیجہ ہے، (Result) ہے، اور یہ سب چیزیں روشنی میں، تصاویر میں، (Pictures) میں، صورتوں میں، شکلوں میں، اشاروں میں یہ سب چیزیں ہوتی ہیں، لیکن وہ چونکہ ایک نور ہے اور نور قائم رہتا ہے تو وہ اِس شکل میں موجود ہے، اُس کی یہ شکل بنتی ہے ہمیشہ کے لئے اِس تک کوئی انسان رسا ہو سکتا ہے، (Approach) کر سکتا ہے مگر اُس میں یہ بات ہے کہ کوئی تو اِس کا (Interpret) کر سکتا ہے کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ جب قرآن کی زبان، اسلام کی زبان اور مثالیں آتی ہیں تو وہ (Interpret) کر سکتا ہے، نہیں تو نہیں کر سکتا ہے، اُس پر جو کیفیت گزرتی ہے، گزرتی ہے وہ کچھ عربی زبان میں تو نہیں ہوتی ہے وہ حکمت کی زبان میں ہوتی ہے، رُوحانیت کی زبان میں ہوتی ہے۔ تو لہٰذا کسی کتاب پر یا آسمانی کتاب پر حاضر ہونا امام کا کوئی بڑی بات نہیں ہے، جب کہ پیر بھی حاضر ہوتے ہیں، جب کہ اگلی قطار کے مومنین بھی اِس رُوحانیت پر حاضر ہوتے ہیں، تو یہ بتلانا تھا۔ اب کم وقفے میں ترجمہ کریں گے کیونکہ آپ سنتے سنتے تھک رہے ہیں اور ہم بولتے بولتے تھک رہے ہیں۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: سورۂ دَہر (۷۶) کی چند حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-04 تاریخ: ۲۹؍ دسمبر؍ ۱۹۸۳ کراچی

یا علی مدد! عزیزانِ من! آج ہم سورۂ دَہر کے بارے میں کچھ حقائق بیان کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ یہ سورہ کئی اعتبار سے بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے، اور اِس میں ایسی بہت سی حقیقتیں ہیں جن کے سمجھنے سے علمی طور پر بہت کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔ اِس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں انسان کے متعلّق ایک ایسا ارشاد ہے کہ اگر ہم اُس میں صحیح طور سے سوچ سکیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کی حقیقت قدیم ہے، یعنی وہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ کے لئے ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: هَلۡ اَتٰى عَلَى الۡاِنۡسَانِ حِيۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡـئًا مَّذۡكُوۡرًا (۷۶:۱)۔ کیا انسان پر دہر میں سے ایک ایسا وقت آیا ہے، کہ جس میں وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا، اِس میں اللہ تعالیٰ کا بطریقِ سوال یہ فرمانا کہ کیا انسان پر ایک ایسا وقت آیا ہے دہر میں سے کہ جس میں وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا یا ایسا لگتا ہے کہ انسان پر پہلے یہ واقعہ ایک بار گزر چکا ہے، اور انسان ایک ایسی حقیقت کی حیثیت سے ہے کہ وہ حقیقت بے مثال ہے، [اور وہ] ہمیشہ سے موجود رہا ہے، اور وہی کیفیت اِس پر بارِ دوم گزرنے والی ہے جس کے بارے میں اشارہ فرمایا جاتا ہے۔ اب یہاں دہر کے متعلّق کچھ وضاحت کی ضرورت ہے کہ دہر ایسے زمان کو کہتے ہیں کہ وہ اٹل ہے، ساکن یعنی ٹھہرا ہوا ہے، برخلاف اِس زمان کے جو گزرنے والا ہے، اور دہر کس طرح ٹھہرا ہوا ہے اِس کو سمجھنے کے لئے ہم اِس کائنات کو بمع سورج کے فرضی طور پر سامنے سے ہٹا سکتے ہیں، یعنی جب ہم فرض کرتے ہیں کہ کائنات نہیں ہے، سورج بھی نہیں ہے، تو اُس وقت دن رات کا تصوّر یا کہ گزرجانے والا وقت کا تصوّر یکسر ختم ہو جاتا ہے اور پھر ایک اٹل وقت یعنی ٹھہرا ہوا وقت سامنے آتا ہے، تو وہ ٹھہرا ہوا وقت جس کے شب و روز نہیں ہیں دہر ہے۔ ہمارے لئے دہر کی کیفیت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے، کیونکہ اعلیٰ ترین حقائق کو اِس کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ پس اِس پر اچھی طرح سے غور کرنا چاہئے، کہ اِس مادّی کائنات کو فرضی طور پر سامنے سے ہٹانے سے دہر کا تصوّر بن جاتا ہے یعنی اٹل اور ٹھہرے ہوئے وقت کا تصوّر، اور یہاں اسی اٹل وقت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ جب کوئی شخص رُوحانی طور پر اِس مادّی دُنیا سے بالاتر ہو جاتا ہے، تو اُس کے سامنے دہر کا تصوّر ہوتا ہے اور جہاں ازل اور ابد آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ لامکان اور لازمان بھی یکجا ہوتے ہیں، اور اُسی مقام پر وہ تمام واقعات جو ازل

سے متعلّق ہیں، اور وہ سارے حالات جو ابد سے متعلّق ہیں یکجا طور پر سامنے آتے ہیں۔ اب یہ سوال کہ ایسے مقام پر انسان کا کوئی نام نہیں ہوتا ہے، تو بات بالکل واضح ہے کہ جہاں قرآن کے دُوسرے ارشادات میں انسان کے فنا ہو جانے کا ذکر آتا ہے تو یہ وہی بات ہے کہ انسان فنا ہو جاتا ہے، جب فنا ہو جاتا ہے، تو اُس کے وُجود کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے، وہ اُس مقام پر خدا سے واصل رہتا ہے، جب وہ خدا سے واصل ہو جاتا ہے، تو اُس کی خودی کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے، کہ کسی طرح سے اُس کا نام باقی ہو۔ دُوسرے لفظوں میں انسان اپنی انائے سفلی کو چھوڑ کر انائے علوی میں منتقل ہو جاتا ہے، تو اُس صورت میں سفلی کی طرف سے اُس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے، یہ ہوا انسان کا کوئی قابلِ ذکر چیز نہ ہو جانا یا یوں کہا جائے کہ انسان بے مثال ہو جاتا ہے، جب بے مثال ہو جاتا ہے تو کوئی مثال نہیں ملتی ہے کہ اُس کو بیان کیا جائے۔

اِس کے بعد دُوسری آیت (۷۶:۲) میں یہ ذکر ملتا ہے کہ [اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۷۶:۲)] انسان جسمانی حالت میں دو مخلوط نطفوں سے پیدا کیا گیا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر انسان ماں باپ سے پیدا ہوا ہے، اور یہ ایک ایسا کُلّیہ ہے کہ اِس کا اطلاق نہ صرف حضرت عیسیٰؑ پر ہوتا ہے بلکہ حضرت آدمؑ بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان ایک ایسا نام ہے کہ اِس کا اطلاق انسان کے ہر فرد پر ہوتا ہے، اور اللہ جب کوئی ارشاد فرماتا ہے تو وہ ایک اٹل قانون بن جاتا ہے، اور اُس سے کسی کو استثنیٰ نہیں ہو سکتا، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمؑ کے بھی ماں باپ تھے، اور اگر یہ مانا جائے کہ آدم کسی اور سیّارے سے آیا ہے یا بہشت سے آیا ہے تو پھر بھی اُس کے ماں باپ تھے اور وہ اپنے والدین کی اولاد تھے۔

اِس کے بعد تیسری آیت (۷۶:۳) میں ہدایت کا ذکر آتا ہے کہ [اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (۷۶:۳)] ہدایت محیط ہے خیر وشر دونوں پر کہ خداوندِ عالم انسان کو نہ صرف خیر کا رستہ سکھاتا ہے بلکہ شر کی راہ کو بھی واضح کر کے چھوڑتا ہے تا کہ وہ اُس کو دیکھے، اُس کے نتائج کو سمجھے اور اُس کے مضر نتائج سے خود کو بچائے، کہ اگر خداوندِ عالم صرف خیر کا راستہ بتاتا اور شر کی وضاحت نہ کرتا، تو پھر اُس کی طرف سے انصاف نہیں ہوتا کہ اس نے خیر وشر کو ایک ساتھ پیدا کیا مگر شر کی وضاحت نہیں کی۔

اِس کے بعد ارشاد ہے کہ [اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ سَلَاسِلَا وَاَغْلَالًا وَّسَعِيْرًا (۷۶:۴)] خداوندِ عالم نے کافروں کے لئے زنجیریں اور غُل اور آگ کا عذاب تیار کیا ہے۔ یہاں زنجیروں سے مُراد گمراہ کن روایات ہیں، اغلال سے مُراد غلط تقلید ہے، اور آگ سے مُراد جہالت ونادانی ہے۔

سورہ ۷۶ آیت ۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ: [اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (۷۶:۵)] خداوندِ عالم نے نیکوں کے لئے یعنی نیک لوگوں کے لئے ایک ایسے پیالے کو تیار رکھا ہے کہ اُس کی آمیزش کافور کی ہے، یہ

سرچشمۂ عقل کی طرف ایک اشارہ ہے، اِس لئے کہ لُولُوئے عقل کی تشبیہ بلحاظِ رنگ کافور سے دی گئی ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ [عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (۷۶:۶)] وہ ایک چشمہ ہے اور ایسا چشمہ ہے کہ خدا کے خاص بندے اُسی میں سے پیتے ہیں، اور اُس چشمہ میں سے ہر بندۂ مومن ایک نہر اپنی طرف بہا کے لے جاتا ہے۔ دُنیا میں اگر کہیں کوئی چشمہ ہے تو اُس چشمے کا قانون یہ ہوتا ہے، کہ وہ صرف میدان میں بہتا ہے اور بلندی کی طرف اُس کا پانی نہیں بہہ سکتا اور ممکن نہیں ہے کہ جو چاہے اُس میں سے ایک نہر اپنی طرف بہا کے لے جائے۔ اِس کے برعکس یہاں جس سرچشمے کا ذکر ہے یعنی سرچشمۂ عقل اور سرچشمۂ علم، وہ اِس حالت میں ہے، کہ ہر بندۂ مومن اُس میں سے ایک نہر اپنی طرف بآسانی لے جا سکتا ہے۔ اِس سے نورانی ہدایت مُراد ہے، اِس سے رُوحانی علم مُراد ہے جو مکانی بُعد کے فرق کے بغیر بندۂ مومن کے دل و دماغ کو یہ نور کا پانی پہنچ سکتا ہے۔

پھر اِس کے بعد خدا کے بندوں کے نیک اعمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اُس میں اِس صفت کا ذکر ہے کہ [يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷۶:۷)] بندۂ مومن جس چیز کے لئے نذر مانتا ہے اُس کو پورا کرتا ہے، اور دُوسری یہ صفت بیان ہوئی ہے، کہ ایسے بندے ایک ایسے دن سے خوف رکھتے ہیں جس کی بُرائی پھیل جانے والی ہوتی ہے۔ اِس کے بعد یہ ذکر ہے کہ [وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (۷۶:۸)] ایسے نیک بندے خدا کی محبّت میں کھانا کھلاتے ہیں، مسکینوں کو، یتیموں کو، اور اسیروں کو۔ اِس عبارت کے دو معنوی رُخ ہیں یا کہ دو پہلو ہیں ایک ظاہری ہے جو بیان ہوا، اور دُوسرا باطنی پہلو ہے اور وہ باطنی پہلو یہ ہے کہ خدا کی محبّت میں مسکینوں، یتیموں، اور اسیروں کو کھانا کھلانا کچھ اِس طرح سے ہے کہ ایسی تعلیم کے لئے اہتمام کیا جائے، کہ جس کی طرف سے لوگ مسکین بھی ہیں، یتیم بھی ہیں اور اسیر بھی ہیں۔ یعنی دینِ حق کی تعلیمات کو عام کرنا، لوگوں میں جو علم کی بھوک ہے اُس کے خلاف اُن کو رُوحانی غذا کا اہتمام کرنا، عقلی اور رُوحانی طور پر ایک دسترخوان کو بچھانا، اور اُس پر لوگوں کو دعوتِ عام دینا تو اِس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اگر لوگ جسمانی طور پر بھوکے ہیں تو آج دُنیا میں بھوکے ہیں، اِس کی کوئی بات نہیں ہے یہ تو جسم کی بات ہے یہ تو دُنیا کی بات ہے، اِس میں اُن کے لئے نقصان نہیں ہے۔ نقصان اِس میں ہے کہ کوئی عقلی اور علمی طور پر بھوکا رہے یعنی جاہل رہے، نادان رہے، یہ بہت ہی خطرناک بات ہے۔ اِس کے لئے دینِ حق کے دسترخوان کو بچھانا اور اُس پر امامؑ کی علمی نعمتیں چننا یہ بہت بڑا کارِ ثواب ہے، اور یہاں مسکین اور یتیم و اسیر کا ذکر ہے تو اِس کے بھی رُوحانی طور پر بھی دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ کہ اِس کا ذکر ہوا کہ لوگ کس طرح مسکین ہیں حقیقی علم کی طرف سے، کس طرح اسیر ہیں، کس طرح یتیم ہیں اِس کا ذکر ہوا، اور دُوسرا ذکر یہ ہے کہ حدودِ دین کی طرف سے لوگوں کے لئے رُوحانی غذاؤں کا اہتمام کرنا ایسا ہے جیسے ہم نے پیروں کو اور حدودِ دین کو کھلایا۔ جیسے ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک دن خداوندِ عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے فرمایا کہ: اے موسیٰ!

میں بیمار تھا تم نے بیمار پُرسی نہیں کی، میری عیادت نہیں کی، میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہیں دیا، میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، تو خداوندِ عالم نے اِس قسم کی شکایات کیں ہیں۔ سو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ کی اِن باتوں سے حیرت ہوئی اور عرض کرنے لگے کہ: اے بارِ خدایا! تو اِن باتوں سے بڑا پاک و مقدّس ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ بیمار ہوجائیں، آپ کو پیاس لگے، آپ کو بھوک لگے، یہ تو انسانوں کی بات ہے، پھر اِس طرح خداوندِ عالم نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ: بے شک میں ہر چیز سے پاک تو ہوں لیکن میرا فلان بندہ بیمار رہا، تو سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں بھی بیمار ہوا اور فلان بندہ پیاسا تھا تو فرض کرلینا چاہئے تھا کہ مجھے پیاس لگی تھی اور فلان بندہ جو ہے بھوکا تھا۔ آپ اگر اُس کی کوئی خدمت کرتے تو مانا جاتا کہ آپ نے میری خدمت کی۔

اسی طرح قرآن میں مسکین، یتیم اور اسیر کا ذکر آتا ہے، اور اِس کے تاویلی پس منظر میں حدود کا ذکر ہوتا ہے اور ہمارے بزرگانِ دین نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ یتیم منفرد کو کہا جاتا ہے، یکتا کو کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سیپ جو ایک جانور ہے اُس میں سے ایک اکیلا موتی نکلے تو وہ بڑا گرانقدر ہوا کرتا ہے، اُس کو فارسی میں ''دِرِّ یتیم'' کہتے ہیں یعنی گوہرِ یکتا، منفرد موتی۔ اسی طرح قرآن میں لفظِ یتیم جب آتا ہے تو ظاہر میں کوئی ایسا شخص یا کوئی ایسا بچّہ مُراد ہوتا ہے جس کا باپ نہ ہو یا ماں نہ ہو یا دونوں نہ ہوں، لیکن امام دونوں معنوں میں یتیم ہیں، کہ اُس کے ماں باپ بنیاد ہی سے نہیں ہیں اِس لئے بھی، اور وہ یکتا اور منفرد ہیں اِس لئے بھی۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ (Code words) ہوتے ہیں کئی اداروں میں، کئی حکومتوں میں اور دُنیا کے کئی کاموں میں، اسی طرح قرآن کے بھی (Code words) ہیں، اور اُن سے امامؑ اور اُس کے حدود واقف ہوتے ہیں تاکہ قرآن کی حکمت کا رُخ خاص لوگوں کی طرف ہو، اور جو لوگ اِس کے حق دار نہیں ہیں وہ اِس خزانے کو زبردستی سے نہ اُٹھا سکیں، استحقاق کے بغیر، حقداری کے بغیر، وہ کہتے ہیں کہ [اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶:۹)] ہم یہ جو کھانے کھلانے کا اہتمام کرتے ہیں اِس کا مقصد یہ نہیں کہ ہم کوئی صلہ چاہتے ہیں یا شکر گزاری چاہتے ہیں بلکہ یہ ہم محض رضائے الٰہی کیخاطر یہ کام کرتے ہیں ''لِوَجْهِ اللّٰه'' (۷۶:۹) کے دو معنی ہیں رضائے الٰہی کی خاطر یا یہ کہ دیدار کے لئے، کہ رُوحانیت میں دیدار ایک بہت بڑا موضوع ہے اِس لئے کہ دیدار کئی طرح کے ہوتے ہیں اور ایک دیدار ایسا ہے جو مقامِ آخر پر ہے جہاں پر فنا، فنائیت ہوتی ہے اور اِس لئے، اور ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ [اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (۷۶:۱۰)] ہم اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ایک ایسے دن کی بابت کہ وہ دن جب آئے گا تو اُس میں لوگوں پر سختی گزرے گی اور تلخی اور وہ منہ بنائے ہوئے ہوں گے ''عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا'' اُردو میں کہتے ہیں منہ بنانا، رُوحانیت کے بڑے بڑے مقامات ایسے ہیں کہ وہاں پر کیفیت یوں ہوتی ہے کہ اُس میں منہ بنانا پڑتا ہے تو اِس سے ہم ڈرتے ہیں، اُن کا کہنا ہے۔

اِس کے بعد خداوندِ عالم کا یہ ارشاد ہے [فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (۷۶:۱۱)] کہ خدا نے ایسے دن کی بُرائی سے بچالیا اور اُن کو تازگی اور خوشی دی بجائے اِس کے کہ وہ منہ بنائے بیٹھیں، خدا نے اُن کو ہشاش بشاش اور خوشحال بنایا، اور اُن کو خدا نے اجر وصلہ عنایت فرمایا [وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (۷۶:۱۲)] اِس لئے کہ انہوں نے دُنیا کی زندگی میں بڑا صبر سے کام لیا تھا، اور خداوندِ عالم کا اجر وصلہ اِس طرح سے اُن کو دیا گیا کہ اُن کو جنّت ملی اور ریشم کے لباس ملے۔ اِس مقام پر جنّت کے ساتھ ساتھ ریشمی لباس کا ذکر قابلِ غور ہے کہ اگر ریشمی لباس ایک چھوٹی سی چیز ہوتی تو جنّت کے ضمن میں اِس کا ذکر خود بخود آنا چاہئے تھا، لیکن یہاں اِس کو بیان میں نمایاں کیا گیا تا کہ ہم اِس کو سمجھیں اور غور کریں، یہ کہ ریشمی لباس سے مُراد لطیف جسم ہے، لطیف جسم ایک طرف اور جنّت ایک طرف اِس کی بہت بڑی اہمیت ہے، لطیف جسم ملے اور اِس کثیف جسم سے انسان کو نجات ملے یہ بہت بڑی بات ہے، بہت بڑی بات ہے۔ ہمیں اِس دُنیا میں جسمانی طور پر جو کچھ تکلیف ملتی ہے وہ اِس جسم کی وجہ سے ہے یہ جسم بہت ہی کمزور ہے، یہ بار بار بیماری سے دُوچار ہوجانے والا جسم ہے اور خداوندِ عالم کی حکمت یوں تھی کہ ہم اِس دُنیا کی زندگی میں اسی جسم میں رہیں اور مشقتوں کو برداشت کریں اور دُوسروں کے ساتھ رہیں جو اِس دُنیا میں بستے ہیں۔ اگر وہ جسم یہاں ہمیں دیا جاتا یا ہم سے بڑھ کر پیغمبروں کو اور اماموں کو ملتا تو یہ عجیب بات ہوتی، وہ آزمائش نہیں ہوتی، وہ امتحان نہیں ہوتا اور اُس سے صبر نہیں بنتا، بندگی نہیں ہوتی۔ پھر اِس دُنیا میں آنے کا جو مقصد ہے وہ فوت ہوجاتا۔ لہٰذا جہاں پر ایک کمزور سا جسم سب کے ساتھ ملا کر دیا گیا ہے۔ اِس جسم میں ہم محنت اُٹھائیں، بیماری جھیلیں، تکلیف برداشت کریں تو پھر ہم کو ایک ایسا جسم ملے گا کہ اُس میں نہ تو بیماری ہے، نہ کوئی دُکھ ہے، نہ تکلیف ہے، نہ اُس میں خون ہے، نہ کوئی رُطوبت ہے، وہ بڑا صاف ستھرا ہے، اور نورانی ہے، اُس کی تشبیہہ دینے کے لئے خداوند نے ریشم کو لیا، دیکھیں کہ ریشم کس اہتمام سے بنتا ہے اور کتنے مراحل سے تیار ہوتا ہے اور ریشم ایک ایسے جانور سے بنتا ہے کہ اُس جانور پر زندگی کے دو مرحلے گزرتے ہیں اور اِس کا بارہا ذکر ہو چکا ہے۔

اور فرمایا: [مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (۷۶:۱۳)] اور وہ تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے تختوں پر اُس مقام پر وہ نہ تو دھوپ کی سختی کو دیکھیں گے اور نہ جاڑے کی سختی کو دیکھیں گے۔ اور [وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا (۷۶:۱۴)] جنّت کے سائے اُن کے لئے نزدیک ہوں گے اور جنّت کے میوے اُن کے لئے نزدیک ہوں گے۔ بڑی حکمت ہے اِس بیان میں کہ ایک آیت میں ہے کہ جنّت کی مثال اگر مادّی طور پر دی جائے تو وہ آسمان و زمین میں پھیلی ہوئی ہے۔ پھر اِس جیسی دُوسری آیات میں ارشاد ہے کہ جنّت کا ایک قانون یہ ہے کہ اُس کی ہر چیز نزدیک کی جاتی ہے یعنی اگرچہ جنّت اِس پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے لیکن اِس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ بندۂ مومن اِس کائنات میں اِدھر اُدھر دوڑے پھرے بھاگے بلکہ جنّت کا میوہ ایسا ہے، جنّت کے

سائے ایسے ہیں کہ وہ خود بخود بندۂ مومن کے قریب آجاتے ہیں۔ ہاں! یہ تو خداوندِ عالم کی شان ہے، پھیلاؤ کے لحاظ سے جنّت اگرچہ اِس کائنات کے برابر ہے لیکن جیسا کہ ایک ارشاد ہے، کہ خداوندِ عالم اِس پوری کائنات کو ایک موتی کے برابر کر کے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لے گا(۳۹:۶۷)۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جنّت اگرچہ پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے لیکن وہ بندۂ مومن کے دل و دماغ میں سموئی ہوئی ہے اور وہ ایک مثال میں ہے، وہ ایک کلمے میں ہے اور رُوحِ مومن میں ہے۔

اِس کے بعد ارشاد ہے کہ [وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا (۷۶:۱۵) قَوَارِيْرَ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا (۷۶:۱۶)] وہاں پر چاندی کے برتنوں میں اور شیشے کے آب خوروں میں طرح طرح کی نعمتیں لے کر خدمت کرنے والے جو خادم ہیں وہ اِن کے اِرد گرد پھرا کریں گے اور [وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا (۷۶:۱۷)] اُن کو وہاں ایک ایسے جام سے پلایا جائے گا کہ اُس کی آمیزش زنجبیل کی ہے اور [عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا (۷۶:۱۸)] ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے اور ارشاد ہے: [وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا (۷۶:۱۹)]۔ اُن کی خدمت میں ایسے بچّے پھرا کریں گے جو کہ وہ دائمی طور پر بچّے ہی ہیں۔ جب آپ اُن کو دیکھیں گے تو گمان کریں گے کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں

اِس میں رُوح کے ظہورات کی بات ہے، اور جنّت کے خادموں کی بات ہے اور یہ اشارہ ہے کہ مومن کی جو رُوحانی سلطنت ہوگی جو رُوحانی بادشاہی ہوگی وہ مقامِ عقل پر ہوگی، اور ہر وہ چیز جو مومن کو مل رہی ہے عقلی صورت میں ہوگی۔ جس طرح آج دُنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اِن ہی چار عناصر سے طرح طرح کی نعمتیں بنتی ہیں مٹّی، پانی، ہوا، اور آگ کی حرارت سے اتنی ساری گوناگون نعمتیں، غذائیں اور طرح طرح کی چیزیں پھل، پھول وغیرہ، حالانکہ بنیاد کو دیکھیں تو بس یہی چار عناصر ہیں، اسی طرح باور کرنا چاہئے کہ جب کوئی بندۂ مومن مقامِ عقل پر پہنچ جاتا ہے تو باور کیا جاتا ہے کہ مقامِ عقل پر بھی بہت ساری نعمتیں ہیں، لیکن وہ عقل و جان کے عناصر سے ہیں۔ یہاں یہ فرمانا کہ وہ جو خدمت گزار بچّے ہوں گے وہ بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ہوں گے، سے مُراد رُوح کے ظہورات ہیں اور رُوح کا مرتبہ ہے، رُوح کے جلوے ہیں اور بہشت کو جو لوگ سمجھتے ہیں [وہ] اِس سے بالاتر ہے اور ہمیں سب سے بڑھ کر عقلی طور پر تسلیم کرنا چاہئے کہ ساری بہترین نعمتیں عقلی اور علمی حیثیت میں ہوں گی۔

پھر یہ ارشاد ہے کہ: وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (۷۶:۲۰)۔ یہاں پر دو دفعہ دیکھنے کا ذکر ہے کہ ''اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ'' ایک اِس کی جھلک زندگی میں دیکھنا ہے اور پھر اِس کے بعد مرنے کے بعد دیکھنا ہے، تو اُس صورت میں مرنے کے بعد عظیم سلطنت کی صورت میں ساری یہ چیزیں سامنے آئیں گی۔ پھر ریشمی لباس کا ذکر آتا ہے

[عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَّسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (۷۶:۲۱)] کہ دو

قسم کے ریشمی لباس ہوں گے، ایک باریک ریشم کے کپڑے ہوں گے اور دُوسرے دبیز ریشم کے کپڑے ہوں گے۔ جس طرح قرآن میں ہے کہ خداوندِ عالم نے دو قسم کے کُرتے بنائے ہیں (۱۶:۸۱)۔ گرمی سے بچانے والے کُرتے اور جنگ سے بچانے والے کُرتے، گرمی سے بچانے والے کُرتوں سے مُراد وہ لطیف نورانی جسم جو بہت زیادہ روشنی کے ساتھ ہے، جنگ سے بچانے والے کُرتوں کا مطلب وہ ہستی جو سب سے آخر میں سامنے آتی ہے، جو ایک معیّن شخصیت ہے جو ایک آخری ظہور ہے، جو ایک انائے علوی ہے، تو یہاں بھی دو قسم کے لباس کا ذکر ہے کہ نفیس اور باریک ریشمی کپڑا اور دبیز ریشمی کپڑا۔ پہلے نفیس ریشمی کپڑے کا ذکر ہے پھر اُس کے بعد دبیز ریشمی کپڑے کا ذکر ہے، یہ بات نہ ہوتی اور صرف دُنیاوی قسم کے ریشم کی بات ہوتی تو پھر خدا کے نزدیک کوئی نعمت نہیں ہوتی، اور اِس صورت میں وہ لوگ خوش نصیب ہوتے اور جنّت میں ہوتے جو آج دُنیا میں ہوتے ہوئے ریشمی لباس کو زیبِ تن کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، بات کچھ اور ہے اور بہت بڑی بات ہے، وہ لطیف جسم کی بات ہے، لطیف جسم کی بات ہے یہ راز امامؑ کے خزانے کے سوا آج کوئی نہیں جانتا، کوئی جانتا ہوتا تو بڑے فخر سے کوئی صوفی کوئی رشی، کوئی سادھو، کوئی فقیر اپنی کسی تحریر میں لکھتے۔ یہ بات نہیں ہے، یہ بہت بڑی شناخت ہے کہ آج ہم لطیف جسم پر بحث کر رہے ہیں۔

وقت کے لحاظ سے ہم کچھ آگے بڑھ کر ایک خاص بات کی طرف آتے ہیں وہ یہ کہ: نَّحۡنُ خَلَقۡنَاهُمۡ وَشَدَدۡنَآ اَسۡرَهُمۡ ۖ وَاِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَآ اَمۡثَالَهُمۡ تَبۡدِيۡلًا (۷۶:۲۸)۔ یہاں پر وہ خاص بات اور زیادہ واضح الفاظ میں آ گئی کہ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ ہم نے اُن کے بندھن کو مضبوط کیا ہے، ہم نے اُن کو پیدا کیا اور اُن کے بندھن کو مضبوط کیا اور جب ہم چاہیں گے تو اُن کی مثال کو تبدیل کریں گے۔ اِس کی وضاحت یوں ہے، خدا نے انسانوں کو پیدا کیا اور اُن کے بندھن کو مضبوط کرنے کا مطلب یوں ہے کہ مومن اور اُس کے لطیف جسم کے درمیان جو بندھن ہے وہ بہت ہی مضبوط ہے۔ لطیف جسم سے کیا مُراد ہے، لطیف جسم ہمارے حدودِ دین ہیں، ہمارے امامؑ ہیں اور اُس کے تحت جو پیر درجے کے حدود ہیں وہ ہیں، ہماری انائے علوی وہ ہیں، اُن ہی کے ساتھ ہمارا بندھن ہے جو بہت ہی مضبوط ہے، جو بہت ہی مضبوط ہے۔ وہ ہمارے اجسامِ مثالی ہیں ہم میں سے ہر ایک کا ایک جسمِ مثالی ہے، مثالی جسم، جب ہم اِس دُنیا سے گزر جائیں گے تو ہم اپنے لطیف جسم میں منتقل ہو جائیں گے بڑی آسانی کے ساتھ، لیکن اب سے یہ تصوّر رکھنا چاہئے، اب سے ہمیں یہ جاننا چاہئے اِس پر غور کرنا چاہئے، اِس پر سوچنا چاہئے کہ کس طرح ہماری انا سفلی سے علوی میں منتقل ہو سکتی ہے۔ ہمارے ریشمی لباس ہوں گے دو قسم کے لباس، دو قسم کے کُرتے۔ اسماعیلی مذہب میں یہ اصطلاح عام ہے، کہ امامؑ کے سلسلے میں ہم کہتے ہیں کہ امامؑ نے اپنے جامہ کو چھوڑ دیا، دُوسرے جامہ کو اختیار کیا اِس عنصری جسم کے اعتبار سے ہم کہتے ہیں کہ اِس جسم کو ہم جامہ یعنی لباس قرار دیتے ہیں اور بے شک یہ لباس ہے، بدن لباس ہے رُوح کے لئے، تو وہ ہمارے ریشمی لباس ہیں اور وہ

ہمارے وہ لباس ہیں جسے ہم بہشت میں استعمال کریں گے، اور وہ ہمارا سب کچھ ہے، اسی کے ساتھ آج کی کلاس کو ہم (Close) کرتے ہیں۔ شکریہ مہربانی کہ آپ نے ریکارڈنگ کا اہتمام کیا اور توجہ سے سنا شکریہ۔

سوال: کیا حضرت آدمؑ کے والدین کے ناموں کا کوئی تذکرہ بھی کہیں ملتا ہے، یعنی اُن کا نام کہیں لکھا ہوا ہے؟

جواب: والدین کا نام ملتا ہوگا، جب کہ مستند تاریخ یہاں تک (Approach) کرتی ہے کہ آدمؑ کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں انسان رہتے تھے تو پھر اس سے اگر چہ اُن کے ماں باپ کے صحیح نام کا پتا نہ چلے تو پھر بھی یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ ایک ایسے دَور میں رہتے تھے کہ جس میں انسانوں کی آبادی تھی وغیرہ۔ اِس کے علاوہ قرآن میں بھی کئی آیات ہیں، مثلاً یہ آیت کہ: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (۲:۲۱۳)۔ لوگ انبیاء کے سلسلے سے قبل ایک ایسے معاشرے میں رہتے تھے کہ وہ معاشرہ ایک جیسا تھا، خواہ کوئی دین تھا یا نہیں تھا یا تو (Communism) جیسا تھا تو سب لوگ ایک ہی طریق پر تھے، تو پھر پیغمبروں کا سلسلہ بعد میں شروع ہوگیا۔ اِس آیت سے یوں پتا چلتا ہے کہ انسانیت کا دَور آگے ہے نبوّت کا دَور بعد میں شروع ہوا ہے اور آدمؑ تو انبیاء علیہم السّلام کے سلسلے میں آتا ہے نہ کہ عام انسانوں کے سلسلے میں تو اگر یہ بھی مانا جائے کہ اِس سیارۂ زمین کی ایک ابتدا ہے، ایسا نہیں کہ یہ تب سے ہو جب سے خدا ہے، تو پھر بھی اگر مانا جائے کہ آدم کسی دُوسرے سیّارے سے آیا ہے تو ٹھیک ہے ہر حالت میں اُس کے والدین تھے اور کیونکہ جس طرح خدا کی خدائی کا کوئی آغاز نہیں ہے اِسی طرح انسانوں کی بھی کوئی ابتداء نہیں ہے یہ ہمیشہ سے ہیں، اور اِس تصوّر کو جو مدد ملتی ہے وہ خدا کا تصوّر ہے کہ خدا ہمیشہ سے ہے جب خدا ہمیشہ سے ہے تو اُس کے اوصاف ہمیشہ سے ہیں، اُس کی خدائی، خداوندی اُس کی بادشاہی ہمیشہ سے ہے، تو اِس لئے لازم نہیں آتا ہے کہ انسان کے ماں باپ نہ ہوں اور دُوسری بات یہ ہے کہ خدا کہتا ہے کہ: فِطْرَتَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰:۳۰)۔ خدا کی پیدائش یہی ہے جو تمہارے سامنے ہے جو تمہارے زمانے میں انسانوں کو پیدا کرنا ہے شروع ہی سے یہی ہے، تو ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ خدا کی عادت میں اور اُس کی سنّت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے اور ایک ہی راستہ ہے ایک ہی طریقہ ہے۔

سوال: ایک تو عصر کا ذکر آتا ہے اور دوسرا دَہر کا، اِن دونوں کے آپس میں کیا رشتہ ہے؟ یا کیا (Relation) ہے؟

جواب: (Relation)، جی ہاں! اُس صورت میں کہ جب رُوحانی وقت ہوتا ہے اور رُوحانیت میں جو وقت ہوتا ہے وہی دَہر ہے کیونکہ رُوحانیت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اِس مادّی زمانے کے زیرِ اثر نہیں ہوتا ہے۔ رُوحانیت میں ازلی اور ابدی واقعات سامنے آتے ہیں جو زمان و مکان سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا عصر بھی دَہر ہے۔ دَہر ٹھہرا ہوا وقت کس طرح سے ہے اُس کی کچھ مثال دینے کی ضرورت ہے، مثال کے طور پر جب کوئی بندۂ مومن رُوحانیت میں کامیاب ہو جائے گا تو اُس کے سامنے جو واقعۂ آدم ہے جو قصۂ آدم ہے وہ اُس کے سامنے آئے گا، مطلب اِس کا یہ ہوا کہ یعنی یہ آدمؑ سے آگے پہنچ

جائے گا۔ آدم سے آگے پہنچنے کے علاوہ یہ ازل اور ابد کے واقعات کو پہنچے گا، تو اِس معنیٰ میں جو رُوحانیت ہے وہ زمان اور مکان کے تحت نہیں ہے اِس سے اُوپر ہے۔ اِس کی مثال یہ کہ سائنس سے مثال دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر آدمؑ کے واقعات کی فلم بنائی جاتی تو پھر ایک شخص جو زمانۂ آدمؑ سے بہت بعد میں دُنیا میں آیا ہے، واقعاتِ آدم کو سامنے اور ماضی کے طور پر نہیں حال کے طور پر دیکھتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تاریخ کی دُوری کو درمیان سے بُعد کو اُٹھایا گیا اتنی مسافت کو درمیان سے اُٹھایا گیا اور اِس شخص کو اِس فلم کے ذریعے سے آدمؑ سے ملایا گیا ہے، گویا اِس کے لئے جو ماضی تھا اور ماضی کی جو مسافت تھی وہ ختم ہوگئی، تو اسی طرح جو رُوحانیت ہے وہ خود زمان اور مکان سے بالاتر ہے، اور قرآن میں جہاں کہیں بھی آسمان سے اُوپر کی باتیں یعنی عرش کی باتیں جب ہوتی ہیں تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان سے اُوپر کی باتیں ہوتی ہیں اور شیاطین کو آسمانِ اوّل کے نیچے رکھنا اِس لئے ہے، کہ اُن کو زمان و مکان کے اُوپر کی حقیقتوں کو نہیں بتانا چاہتے ہیں۔ خداوند اُن کو اس اُلجھن میں رکھنا چاہتے ہیں کس طرح زمان و مکان سے اُوپر کی جو حقیقتیں ہیں اُن سے اِن کو آگاہ رکھنا نہیں چاہتا ہے، جب بھی قرآن میں عرش کی بات آگئی تو پھر وہ زمان اور مکان سے اُوپر کی بات ہوگئی۔ قرآن میں آسمان کی تخلیق کا ذکر آتا ہے، زمین کی تخلیق کا ذکر آتا ہے مگر عرش کی تخلیق کا ذکر نہیں آتا ہے اِس لئے کہ عرش قدیم ہے وہ ہمیشہ سے ہے۔ جب عرش قدیم ہے تو عرش کے ماحول کی باتیں بھی قدیم ہیں۔ معراج کے سلسلے میں یہ جو روایت ہے کہ آنحضرتؐ عرشِ اعلیٰ پر گئے تو اِس سے مُراد یہ ہے کہ آنحضرتؐ زمان و مکان سے بالاتر ہو گئے یعنی حضورؐ نے اپنے اِس رُوحانی سفر میں زمان و مکان کو زیرِ پا لایا یہ ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: لفظِ فرقان کی وضاحت، سورۂ حدید کی چند حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-5A تاریخ: ۲/جولائی/۱۹۸۲، کراچی

عزیزانِ من! دُنیا کا کام ایسا بکھرا ہوا ہے کہ جس طرح ہم چاہتے ہیں اُس طرح سے نہیں کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ رُوحانی عالم میں جس طرح سب رُوحیں ایک ہی مقام پر جمع ہوتی ہیں دُنیا ایسی نہیں ہے، یہ حسرتوں کا مقام ہے۔ آج جو میں آپ کے ساتھ بیٹھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں یہ پھر تقریباً دو مہینے کے لیے میرے لئے پھر مشکل ہو جائے گی، اِس لئے آج کی مجلس میرے لئے کافی اہمیّت رکھتی ہے، تو اب اِس وقت بہت اچھا موقع ہے کہ آپ سب اپنے مولا کو یاد کر کے آئے ہیں اور صبح کا وقت ہے، موسم سے بھی کوئی خاص شکایت نہیں ہے، اِس لئے ہم یہ کوشش کریں گے کہ اِس میں علم کی کچھ خاص باتیں بتائی جائیں۔ علم میں سے البتہ ہم قرآن کو لیں گے اور قرآنی حکمت کی باتیں بتانا چاہیں گے۔ اِس لئے کہ آپ جانتے ہیں علم کے بہت سے شعبے ہیں، بہت سی شاخیں ہیں اور اِن میں سے جو قرآن کا علم ہے بہت ہی عالی قدر ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ خداوند کا کلام ہے۔ ہمیشہ سے خدا کے پاک کلام کی طرف مومنین کی خاص توجّہ رہی ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پیغمبر اور امام صلوات اللہ علیہما کے الگ الگ دو (۲) معجزے ہیں، حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا معجزہ تو یہ ہے کہ آپ نے خدا کے حضور سے قرآن کو حاصل کیا، اور امامِ برحق صلوات اللہ علیہ کا یہ معجزہ ہے کہ آپ قرآن کی تاویل کو جانتے ہیں۔ جس آسمانی کتاب میں ہمارے برحق امام کے علمی معجزات ہوں، تو ہم اُن معجزات کی طرف کیسے توجّہ نہ دیں گے، اِس کے علاوہ قرآنی حکمت کی اہمیّت کی بہت سے وُجُوہ ہیں، بہرحال اِس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنی حکمت اسماعیلی نکتۂ نگاہ سے بہت ضروری ہے ہر زمانے میں، اور اِس زمانے میں بھی۔ آج کے زمانے میں آپ امامِ عالی مقامؑ کے علمی پروگراموں کو دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ امام کس قدر چاہتے ہیں کہ جن افراد کو اسماعیلی علوم سے تعلّق ہے یا ہونا چاہئے اُن کے پاس کس گہرائی کا قرآنی علم ہونا چاہئے۔ آپ کے لندن میں جو امامِ برحق کا سب سے عظیم ادارہ ہے جو انسٹیٹیوٹ آف اسماعیلی اسٹڈیز ہے، اِس کے پروگراموں کو دیکھیں کہ مولا کس قدر عربی زبان کو اور قرآن کو اہمیّت دیتے ہیں اور [اس کی] اہمیّت ہے، اِس لئے خانۂ حکمت کا یہ ایک پروگرام ہے، کہ جس قدر بھی ہو سکے قرآن سے متعلّق کوئی خدمت کی جائے یعنی قرآن کی تاویلات پر کچھ کام کیا جائے، قرآن کی بے انتہا حکمتوں میں سے کچھ حصّہ جماعت کے سامنے رکھا جائے یہ خانۂ حکمت کا پروگرام ہے، اور جب خانۂ حکمت کا یہ پروگرام ہے تو اِس میں یہ لازم آتا ہے کہ سب سے پہلے ہم مجلس میں (Discuss) کریں،

قرآن پر کچھ بولیں، کچھ باتیں بیان کریں تا کہ وہ باتیں کیسٹ میں آئیں اور کچھ قابل افراد اُن باتوں کو نوٹ بھی کریں پھر اُس کے بعد کسی نہ کسی طرح سے یا کسی نہ کسی شکل میں جماعتوں کے سامنے حکمت اور تاویل کی وہ باتیں آسکتی ہیں۔

اب میں کچھ بہت اہم باتیں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں، اِس میں ایک نکتہ ہے یعنی ایک پوئنٹ، مجھے اُمید ہے کہ آپ خوب اِس پوئنٹ کی طرف توجّہ دیں گے اور وہ پوئنٹ ہے قرآن کے جتنے ٹائیٹلز ہیں قرآن کے جتنے نام ہیں اُن میں سے ایک نام ''فرقان'' ہے، میں اِس پر کچھ قرآن کی روشنی میں بولنا چاہتا ہوں۔ فرقان عربی [زبان] کا ایک لفظ ہے جو ''فرق'' کی (Root) سے ہے، فرق ایک عام لفظ ہے جو اب عام ہو چکا ہے جو آپ عام (Language) میں اِس کو استعمال کرتے ہیں، اِس میں کوئی فرق نہیں اور فرقان اِسی (Root) سے ایک ایسا لفظ ہے کہ اِس کے معنی فرق کرنے، فرق بتانے یا کہ فرق و امتیاز کرنے کے ہیں، اور یہ قرآنِ مقدّس کا ٹائیٹل اِس (Sense) میں ہے کہ قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہونے کی حیثیت سے حق اور باطل کے درمیان فرق بتاتی ہے۔ یعنی اُس میں یہ قوت ہے کہ ظاہر کرے کہ یہ باطل ہے، غلط ہے، جھوٹ ہے اور یہ سچ ہے، حق ہے، صحیح ہے، تو دینی چیزوں کے سلسلے میں [قرآن] ایسا فرق و امتیاز کرسکتا ہے لیکن یہ آخری بات نہیں ہے، میں نے جو کچھ کہا وہ تو اِس اصطلاح کے مطابق کہا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اِس میں کیا کیا (Conditions) ہیں، کب، کس صورت میں اور کہاں قرآن یہ کام کرسکتا ہے؟ آیا یہ ہر مقام پر اور ہر شخص کے ہاتھ سے یہ کام کرسکتا ہے یا اِس کے لئے کوئی شرط ہے اور اِس سلسلے میں قرآن کی وضاحت، قرآن کی تفسیر کیا ہے؟ تو اِس سوال کا جواب اِس طرح سے ہے کہ بے شک جہاں یہ پاک آسمانی کتاب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر نازل ہوئی اُس مقام پر اپنی بھرپور صفت کے ساتھ یہ کام کرسکتا ہے۔ کیونکہ خداوندِ عالم نے فرمایا ہے، اِس وقت جو قرآن کی آیت ہے کہ خداوندِ عالم نے قرآن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر اِسی صفت میں اور اِسی قوت کے ساتھ بھیجا یعنی فرقان کی حیثیت سے (۱:۲۵)۔ جب [فرقان] آنحضرتؐ کے ہاتھ میں ہے، جب حضورؐ کے تصرّف میں ہے اور جب امامؑ کے پاس ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ قرآن کا کوئی رُوحانی پس منظر ہے، اُس کی کوئی رُوح ہے، اُس کے لئے کوئی نور ہے، اُس کی ایک زندہ رُوحانیت ہے، اُس کا ایک تاویلی (Background) ہے اور یہ ساری چیزیں یا تو پیغمبرؐ کے پاس مکمّل ہیں یا امامؑ کے پاس، جب پیغمبرؐ اور امامؑ سے ہٹ کر قرآن لوگوں کے پاس آتا ہے، تو اُن مکمّل چیزوں کے ساتھ اور اُس رُوحانیت کے ساتھ، اُس نور کے ساتھ، اُس آسمانی رُوحانیت کے پس منظر کے ساتھ نہیں آسکتا ہے، تو صرف قرآن کا ظاہر ہی آسکتا ہے اور قرآن کا ظاہر یہ کام نہیں کرسکتا ہے۔

اِس کی دو (۲) دلیلیں ہیں کہ جب قرآن عوام کے ہاتھ میں ہے تو وہ اپنا مکمّل کام نہیں کرسکتا ہے۔ اِس کی دو (۲) دلیلیں ہیں، ایک دلیل تو یہ ہے جو بہت ہی روشن ہے اور بہت ہی واضح ہے کہ آج اسلام کے اتنے فرقے ہوئے ہیں اگر

اِس موجودہ صورت میں رُوحانیت کے بغیر، نور کے بغیر، پیغمبر کے بغیر اور امام کے بغیر قرآن بجائے خود اور بذاتِ خود فرقان ہوسکتا، وہ یہ معیار ہوسکتا کہ حق کو حق کہے اور باطل کو باطل ٹھہرائے، تو اُس صورت میں یہ حالت نہ ہوتی اور اتنے مختلف اور ایک دُوسرے کے مخالف فرقے اسلام کے اندر نہ بنتے۔ جو غلطی پر ہوتا قرآن اُس کو براہِ راست کسی لحاظ کے بغیر کسی رعایت کے بغیر کہہ سکتا، چونکہ وہ فرقان ہے، اپنے معجزے سے، اور جو صحیح ہے جو سیدھے رستے پر ہے، جو سچّا ہے، جو حق پر ہے اُس کے متعلّق کہہ دیتا کہ یہ صحیح ہے۔ آج قرآن جو لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ مجبور ہے یہ کام نہیں کرسکتا ہے، تو یہ دلیل ظاہر ہے اور اِس کے علاوہ دُوسری دلیل بھی ہے جو قرآنی ہے، یہ تو منطقی دلیل تھی (Logical Proof) تھا۔ دُوسری دلیل جو قرآن سے متعلّق ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے، خداوند فرماتا ہے کہ: اے لوگوں! اگر تم تقویٰ اختیار کروگے تو تب خدا تمہارے لئے ایک فرقان مقرّر کرے گا (۲۹:۸) قرآن کے نزول کے ساتھ ساتھ اور قرآن کے کتنے حصّے کے لوگوں کے سامنے آنے کے بعد خدا فرماتا ہے، کہتا ہے کہ اگر تم خدا سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو اور ایمان لاؤ، صحیح مومن بنو تو تب خدا تمہارے لئے فرقان ایسا مقرّر کرے گا کہ جس کی مدد سے تم حق اور باطل کو سمجھنے لگو گے، تم دیکھ سکو گے کہ یہ حق ہے، تم جان سکو گے کہ یہ باطل ہے۔ اب دیکھا آیت کے اِس مفہوم کے اندر کہ قرآن عوام کے لئے (Conditional) ہے یعنی مشروط ہے، کچھ شرطیں ہیں، وہ شرطیں پوری ہوجائیں تو قرآن سے ہدایت، رہنمائی، علم، حکمت اور فرقان ہونے کی صفت قرآن سے ظاہر ہوسکتی ہے۔ اُس آیت کے اندر خدا یہ نہیں بتاتا ہے کہ وہ شرط کیا ہے لیکن قرآن کی دُوسری آیتوں میں یہ شرط ہے کہ قرآن کے ساتھ ایک نور ہے قرآن کے ساتھ ساتھ اُس نور کو بھی لیا جائے، قرآن کو اُس نور کی روشنی میں پڑھا جائے تو اُس کی حکمتیں اُجاگر ہوجاتی ہیں (۱۵:۵) تو تب اُس نور کی بدولت اور اُس نور کی روشنی میں قرآن فرقان کہلاسکتا ہے اور درحقیقت اپنے اصل مقام پر قرآن فرقان ہے، اور اصل مقام سے مراد پیغمبر اور امام ہیں، تو اِس کے بغیر فرقان نہیں ہے، یہ دو دلیلیں ہیں۔

اِس میں ہمارے عزیزوں میں سے جو زیادہ لکھنے کی ذمّہ داری رکھتے ہیں، جو کورس کے طور پر اِس مجلس کو (Attend) کرتے ہیں اُن کو ہم یہ آیت دُوسری آیت بتائیں گے اور اب بھی یہ بتاسکتے ہیں کہ کس آیت میں خدا فرماتا ہے کہ: اے ایمان والو! تم تقویٰ اختیار کرو اور صحیح معنوں میں مومن بنو تاکہ خداوند تمہارے لئے ایک فرقان مقرّر کرے گا (۲۹:۸)۔ اُس میں قرآن کا نام نہیں ہے، تو مطلب فرقان امام کو کہیئے اور فرقان قرآن کو کہیئے جب کہ قرآن اور امام ایک ہیں رُوحانی طور پر، تو اُس میں کوئی فرق نہیں ہے قرآن امام سے مل کر فرقان ہے، امام قرآن کے ساتھ فرقان ہے، امام خود بھی فرقان ہے اور قرآن امام سے الگ فرقان نہیں ہے یہ تو مجبوری ہے۔ آپ سوال کرسکتے ہیں کیوں ایسا ہے، وجہ اِس کی یہ ہے کہ قرآن کی ایک رُوح ہے، ایک زندہ رُوح اور تعجّب کی بات یہ ہے کہ قرآن کی رُوح امام میں ہے، قرآن کی

زندہ رُوح قرآن میں نہیں ہوسکتی ہے اِس لئے کہ ایک زندہ رُوح زندے میں رہ سکتی ہے اور ایک زندہ رُوح ایک خاموش اور جامد چیز میں ٹھہر نہیں سکتی ہے۔ لہٰذا قرآن کا نور کہئے یا کہ قرآن کی رُوح کہئے وہ امام میں ہے اِس واسطے امام قرآنِ ناطق ہے، اِس لئے کہ قرآن کی رُوحانیت، قرآن کی رُوح، قرآن کا نور امام میں ہے، تو کہنا چاہئے بڑی جرأت مندی سے کہ قرآن امام کے لئے محتاج ہے اور امام قرآن کے لئے محتاج نہیں ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ قرآن کی رُوحانیت، قرآن کی رُوح امام میں ہے اور وہ بولنے والا قرآن ہے اور قرآنِ صامت اِس لئے محتاج ہے کہ وہ بول نہیں سکتا ہے، اِس کی خوبیوں کو ظاہر کرنے کے لئے، اُس کی حکمتوں کو ظاہر کرنے کے لئے، اُس کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے، اُس کی بزرگی کو بتانے کے لئے، اُس کے بھیدوں کو کھول کھول کر بتانے کے لئے، اُس کی قدر و قیمت کو ظاہر کرنے کے لئے امام کی ضرورت ہے۔ اِس لئے جو صامت ہے وہ ناطق کا محتاج ہے کیونکہ امام (Interpreter) ہے قرآن کا اور وحی کا، (Interpreter) کا مطلب اُردو میں ترجمان، ترجمان کا مطلب یعنی ترجمہ کرنے والا، جو اصل ترجمہ کرنے والا ہے وہ امام ہے اور اِسی لئے رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اِرشاد فرمایا: ایک دن بے شک اِنَّ مِنْكُمْ تمہارے درمیان وہ شخص بھی ہے، مَنْ يُقَاتِلُ علىٰ تَأْوِيْلِ الْقُرْاٰنِ جو قرآن کی تاویل پر جنگ کرے گا، كَمَا قَاتَلْتُ علىٰ تَنْزِيْلِهٖ جس طرح میں نے قرآن کے ظاہری احکام پر جنگ کی (المُستدرك، الجزءُ الثلِث، كتاب معرفة الصّحابة، ص: ۱۳۲)۔ اِس حدیث سے ظاہر ہے اور یہ حدیث اُس آیت کے مطابق ہے جس میں ارشاد کیا گیا ہے کہ: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)۔ بے شک تمہارے پاس نور بھی آیا ہے اور کتاب بھی آئی ہے۔ ایک آیت میں دو (۲) چیزوں کا جب ذکر ایک ساتھ ہوتا ہے تو مطلب (Clear) ہو جاتا ہے کہ نور قرآن کے سوا ہے، قرآن کے علاوہ ہے، اگر نور قرآن ہی ہوتا تو اِس آیت کے اندر دو (۲) چیزوں کا ذکر نہیں ہوتا، فرمایا جاتا یہی کتاب خود نور ہے، تو یہ قرآن کے ایک ٹائیٹل جو فرقان ہے اُس کے متعلّق بات ہوئی۔

سورۂ حدید کی چند حکمتیں

اب ہم کچھ اور باتیں قرآن میں سے بتانا چاہتے ہیں وہ بہت اہمیّت والی بات ہے، مجھے اُمید ہے کہ آپ اِس کو اچھی طرح سے سُن لیں گے اور توجّہ سے سُنیں گے اور اِس کو ذہن نشین بھی کر لیں گے۔ خدائے جلیل و جبّار کا ارشاد ہے کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۵۷:۲۵)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا یعنی معجزات دے کر بھیجا، اور اُن پر کتابیں نازل کیں، یہاں ترجمے میں اِس نے جمع لکھا ہے یہ تو اِس نے غضب کر دیا۔ اپنی طرف سے لکھا اور اُن پر کتاب نازل کی اور ترازو تا کہ لوگ انصاف

پر قائم رہیں، اور لوہے کو نازل کیا اِس میں سخت جنگ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور یہ اِس لئے کہ جو لوگ غیب میں نادیدہ طور پر خدا اور اُس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں خدا اُن کو معلوم کرے [یا جان لے] بے شک خدا تعالیٰ غالب ہے۔ اب میں اِن الفاظ کو الگ الگ لے کر وضاحت کرنا چاہتا ہوں، سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اُس نے پیغمبروں کو معجزات کے ساتھ بھیجا، کسی کا معجزہ ظاہری تھا تو کسی کا معجزہ باطنی تھا، کسی کا معجزہ ہنگامی تھا، تو کسی کا معجزہ دائمی تھا اور کسی کو رُوحانی معجزات دیئے اور کسی کو مادّی معجزات دیئے۔ جیسے موسیٰؑ کی لاٹھی سے جو معجزہ ہوتا تھا وہ حسّی تھا کہ حواس سے اُس کو دیکھا جا سکتا تھا اور ہنگامی تھا یعنی کہ وہ ہمیشہ کے لئے نہیں تھا، اور اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا یہ معجزہ کہ وہ نابیناؤں کو بصارت بخشتا تھا اور بیماروں کو اچھا کرتا تھا، اِس سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کے بھی شاید معجزات تھے اور یقیناً آنحضرتؐ کے معجزات تھے، تو آنحضرت کے معجزات رُوحانی تھے، علمی تھے، دائمی تھے، تو قرآن ہے اور اُس کی حکمت ہے اور جو امام ہے، امام بھی پیغمبرؑ کے معجزات میں آتے ہیں، تو آنحضرتؐ کے جو دو (۲) معجزات ہیں وہ عظیم ہیں، سب سے عظیم ہیں، دُوسرے پیغمبروں کے جو معجزات تھے وہ ہنگامی تھے دائمی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر موسیٰ علیہ السّلام کے جو معجزات ہیں کوئی بیان کرے تو وہ ایک حکایت ایک کہانی بن جائے گی، اُس کے لئے سامنے کوئی پروف نہیں ہے اور حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کرتا تھا تو یہ بھی ایک قصّہ بن گیا، اِس کے بھی سامنے کوئی پُروف نہیں ہے، مگر آنحضرتؐ کے جتنے معجزات تھے وہ قرآن اور امام کے سپرد ہو گئے، تو اِس لئے قرآن اور امام سے لوگوں کو فائدے ہو سکتے ہیں یہ ممکن ہے، مگر دُوسرے پیغمبروں کے معجزات سے کوئی نشان باقی نہیں ہے اور قرآن میں جو معجزات ہیں وہ بھی امام کی بدولت ہیں یعنی آنحضرتؐ نے اپنے پیچھے ایک تو اپنی کتاب چھوڑی اور ایک اپنے وارث کو چھوڑا، اور اب یہ کتاب آنحضرتؐ کے وارث کے ساتھ مل کر لوگوں کو فائدہ دلا سکتی ہے، اور جاننا چاہیئے کہ کسی بھی پیغمبر کے جو معجزات ہیں اُن میں سے وہ معجزہ عمدہ ہے اور بہت ہی مفید ہے جس سے کہ لوگوں کو فائدہ ہو۔ اگر موسیٰؑ کی لاٹھی جو اژدھے کی شکل اختیار کرتی تھی اُس سے کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا، اِس لئے کہ وہ ایک تو ہنگامی یعنی کہ وقتی معجزہ تھا، اور دُوسرا یہ کہ وہ علمی اور عقلی معجزہ نہیں تھا، وہ حسّی معجزہ تھا اور حضرت عیسیٰؑ جو مان لیا جائے کہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے، تو اِس میں بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ اگر کسی مُردے کو زندہ کیا تو کیا ہوا، زیادہ سے زیادہ پچاس برس کے بعد یا سو برس کے بعد پھر وہ مر گیا، تو یہ معجزہ ایسا نہیں ہے کہ جو ہمیشہ کے لئے دنیا میں قائم رہے، اِس کے برعکس پیغمبروں کے معجزات جو امام میں ہیں اِس سے لوگوں کے لئے بہت سے فائدے ہیں، یہ کہ پیغمبر کے یہ معجزات جو امام کے سپرد ہیں علمی ہیں، عرفانی ہیں اور پیغمبر اپنے وقت میں ذاتی طور پر اور اپنے بعد اپنے وصی کے ذریعے سے مُردوں کو جس معنیٰ میں زندہ کرتے تھے وہ معجزہ اب بھی ہے۔ ایسے مُردوں کو زندہ کرنا کیا ہی اچھا ہے جو جہالت کی موت مرتے ہیں، چونکہ موت دو قسم کی ہے، ایک جسمانی موت یہ تو عام چیز ہے یہ تو سب

کے سامنے ہے، اس سے کسی کو گُریز نہیں ہے، دُوسری رُوحانی موت جو جہالت کی موت ہے، اگر رُوحانیت کی موت میں مرے ہوؤں کو زندہ کیا جائے، تو یہ اتنا احسان ہے لوگوں پر اتنی مہربانی ہے کہ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی ہے۔ اگر کسی مادّی مُردے کو ظاہری اور جسمانی موت سے بچالیا گیا تو یہ ایک دُنیا کا ڈاکٹر بھی کرسکتا ہے آخر اُس شخص کو مرنا تو ہے ہمیشہ کے لئے دُنیا میں اِس جسم میں زندہ رہنا ناممکن ہے، لہٰذا اُس میں کچھ فرق نہیں پڑتا ہے اور اگر وقتی طور پر تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے تو بعد میں وہ فرق ختم ہو جاتا ہے وہ دُوسروں کے ساتھ مرکر برابر ہو جاتا ہے جو مرے ہوئے ہیں۔ لیکن پیغمبرؐ نے جس طرح اسلام کی رُوح میں بہت سے نُفوس کو زندہ کیا اسی طرح آپ کے جانشین نے یعنی امام نے ہر وقت لوگوں کو اور جہالت کی موت میں مرے ہوؤں کو امام نے زندہ کیا، اور امام کے نمائندوں نے، پیروں نے، بزرگوں نے، تو جو رُوح الایمان کے بغیر ہے وہ مُردہ ہے، مذہبی معنی میں بس ایک ہی زندگی ہے وہ ایمان کی زندگی ہے اُس کے لئے ایک رُوح ہے مخصوص روح، اس کا نام ہے رُوح الایمان ہے۔

ایمان کی جو تعریف ہونی چاہئے، ایمان کی جو شرطیں ہیں اُن کے ساتھ ایک ہی زندگی ہے، جو ایمانی زندگی ہے، جو رُوح الایمان کی زندگی ہے، جو شخص رُوح الایمان میں زندہ ہے، جس کے پاس رُوح الایمان ہے وہ زندہ ہے باقی سب مُردے ہیں۔ ویسے تو اگر حرکت کو دیکھنا ہے، چلنے کو دیکھنا ہے تو حیوان بھی زندہ ہے، درخت بھی ایک طرح سے زندہ ہے، وہ بھی زمین سے غذا کو حاصل کرتا ہے۔ اگر حقیقی زندگی کو لینا ہے تو حقیقی زندگی جو خدا کی نظر میں زندگی ہے، جو رسول کے معیار کے مطابق زندگی ہے، جو امام کے نظر میں زندگی ہے وہ ایمان کی زندگی ہے، کیونکہ ایمان یہ ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے، رسول کی اطاعت کی جائے، اور صاحبِ امر کی اطاعت کی جائے یہ ایمان ہے یہ قرآن کی بات ہے، تو کہنا یوں ہے کہ جو معجزات مفید ہیں جو معجزات علمی ہیں رُوحانی ہیں وہ امام کی ذات میں ہیں، تو خداوندِ عالم نے بہرحال مختلف معجزات دے کر پیغمبر بھیجے اور اُن سب کے ساتھ ایک ہی کتاب ہے ایک ہی کتاب اُن سب کو دی (۲۵:۵۷)۔ ظاہر میں دیکھا جائے تو موسیٰؑ کو تورات دی گئی، عیسیٰؑ کو انجیل دی گئی، داؤدؑ کو زبور دی گئی اور ابراھیمؑ کو صُحف دیا گیا اور آنحضرتؐ کو قرآن عطا کیا گیا۔ لیکن اِس آیات کے اندر ایک ہی کتاب کا ذکر ہے، اور بے شک سب پیغمبروں کے درمیان مشترکہ طور پر ایک ہی آسمانی کتاب ہے، کیونکہ جس طرح سب پیغمبر ایک عظیم مقصد کے لئے ایک ہیں، ایک جان کی طرح متحّد ہیں اسی طرح اللہ کی جتنی کتابیں ہیں وہ ایک ہیں، اُس کو ''اَلْکِتَابَ'' کہا جاتا ہے، تو خدا نے سب پیغمبروں کو مشترکہ طور پر ایک کتاب دی ''وَالْمِیْزَانَ'' اور اُن کو ایک ترازو بھی دیا۔ کیا ہے یہ ترازو؟ دُنیا کا ترازو جس میں دُنیا کی چیزیں تولی جاتی ہیں، نہیں! یہ حکمت، یہ آسمانی کتاب قرآن کی تاویل ہے، تو کتاب ایک ہے الگ ہے یعنی ظاہری کتاب اور میزان تاویل ہے، (Wisdom) ہے، حکمت ہے، کیونکہ کتاب سے چیزیں نہیں تولی جاتی ہیں اور کتاب کے اندر جو تاویل ہے اُس سے تولی

جاتی ہیں۔جس طرح ابھی ابھی کہا گیا تھا کہ قرآن کا ایک ٹائیٹل فرقان ہے یعنی اُس کی رُوحانیت، اُس کی تاویل اور جہاں تاویل نہ ہو، تاویل کے بغیر ہو تو قرآن فرقان نہیں ہوسکتا ہے، اِس طرح یہاں دُوسرا لفظ استعمال کیا گیا اور اسی کو میزان کہا گیا۔میزان عربی میں ترازو کو کہتے ہیں ''لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' تاکہ کتاب کے ساتھ ترازو بھی ہو یعنی اُس کی (Wisdom) بھی ہو تب دین کی چیزوں کو تول سکیں اور انصاف قائم رہ سکیں۔

اِس کے بعد الگ طور پر فرمایا جاتا ہے کہ: ''وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ'' (۵۷:۲۵)۔ خدا فرماتا ہے کہ اُس نے لوہا نازل کیا جس میں سخت جنگ ہے اور جنگ کے علاوہ لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں۔اب سوچنے کی بات ہے کہ آیا اِس سے وہ ظاہری لوہا، مادّی لوہا مُراد ہوسکتا ہے یا اِس میں کوئی راز کی بات ہے۔اِس ربط میں اور اِس موضوع میں ظاہری لوہے کا کیا ذکر ہوسکتا ہے۔لوہے کی تاویل یہاں امام ہے اور لوہے کی تاویل حجّت بھی ہوسکتی ہے، چونکہ امام ہی سب سے بڑے حجّت اور پھر امام ہوتے ہیں تو یہ حجّت کا جو ٹائیٹل ہے یہ بھی امام کو پہنچتا ہے لہٰذا اِس لوہے سے امام مُراد ہیں اور امام کا رُوحانی علم مُراد ہے اور یہ فرمانا کہ لوہے میں سخت جنگ ہے۔اگر ذرا ظاہری نظر سے دیکھا جائے تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوہے سے تلوار بنتی ہے، نیزہ، تیر، گُرز، زِرہ بکتر اور آج کے زمانے میں لوہے کے کیا کیا ہتھیار نہیں ہیں، جہاز اور دیگر سامانِ جنگ سب اسی لوہے میں آجاتے ہیں، ظاہری طور پر، لیکن جہاں لوہے سے مُراد امام کا علم ہے تو اُس کے مطابق اُس رُوحانی لوہے سے رُوحانی قسم کا سامانِ جنگ مراد ہے، رُوحانی جنگ مناظرہ ہے، رُوحانی جنگ تبلیغ ہے، رُوحانی جنگ دعوت ہے جو ہمارے اماموں نے اور ہمارے حجّتوں نے، داعیوں نے، پیروں نے یہ جنگ لڑی اور اب بھی ہے، تو لوہے سے سامانِ جنگ کے بنانے کا اشارہ یہ ہے کہ اِس علم رُوحانی سے رُوحانی اسلحہ، رُوحانی ہتھیار بنتے ہیں اور سخت جنگ سے مُراد یہ ہے کہ لوہے میں تو بہت یعنی سخت قسم کے اسلحہ بن جاتے ہیں، بہت سخت قسم کے اسلحہ۔ہمارے بزرگوں نے اپنے اپنے وقت میں اسی لوہے سے علم کے، امام کے علم کے لوہے سے اسلحہ بنا کے لوگوں کو عاجز کر دیا، دینی اور علمی جنگ میں فتح پائی اور یہ فرمانا کہ اُس میں فائدے بھی ہیں، تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ علم کے دو (۲) حصّے ہیں یا یہ کہ علم سے دو (۲) طرح سے کام لیا جاتا ہے ایک تو تبلیغ، بحث اور سوال کے جواب کے لئے علم کو استعمال کیا جاتا ہے وہ جنگ کی مثال ہے ایک عام طور پر اپنی شناخت کے لئے، معرفت کے لئے، جاننے کے لئے، سمجھنے کے لئے، خدا کو پہچاننے کے لئے، رسول کو پہچاننے کے لئے، امام کو، اپنی ذات کو پہچاننے کے لئے علم کو استعمال کیا جاتا ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ لوہے سے دو (۲) قسم کا کام لیا جاتا ہے ایک تو اِس سے سامانِ جنگ اور اِس سے عام استعمال کے سامان اور دیگر فائدے کی چیزیں بن جاتی ہیں، تو اسی طرح علم امامت سے دو (۲) قسم کا کام لیا جاتا ہے، ایک تبلیغ و دعوت اور مناظرہ و بحث کا کام لیا جاتا ہے، ایک یہ کہ عام یعنی فائدے کا علم اور خود شناسی کا علم، دین شناسی کا علم، حقائق کو

جاننے کا علم اور آسمان زمین کے ظاہر و باطن کے بھیدوں کو جاننے کا جو علم ہے، تو یہ ہے لوہے کی تاویل۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ [وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ] اور یہ سب کچھ اِس لئے ہے کہ خدا یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کون اُس کے پیغمبروں کی مدد کرتا ہے اور اُس کی کون مدد کرتا ہے۔ مثلاً خدا نے یہ لوہا دیا، جن لوگوں کو یہ لوہا دیا اور اُن لوگوں نے یہ اسلحہ بنایا تو خدا یہ جاننا چاہتا ہے کہ کون لوگ ایسے ہیں جو کہ اِن اسلحہ سے اور اِس فائدے سے خدا کی مدد کرتے ہیں، پھر اُس کے تمام پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں یہ خدا جاننا چاہتا ہے، ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح ظاہری جہاد خدا کی مدد ہے، خدا کے دین کی مدد ہے ظاہری جہاد، لوہے کی تلوار کے ساتھ جہاد کرنا، خدا اپنے اُوپر اِس کا احسان رکھتا ہے اور اِس کو اپنی مدد قرار دیتا ہے، اِس طرح اِس رُوحانی لوہے سے جو اسلحہ بنتا ہے اِن اسلحہ کو (Use) کر کے دین کی حفاظت کرنا، اپنوں کو سمجھانا، اُس کے علم کو پھیلانا۔ دُنیا میں جتنے پیغمبر آئے اُن کی گنتی ایک اعتبار سے ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، اُن سب کے الگ الگ مقاصد نہیں تھے، سب کا ایک مشترکہ مقصد تھا، وہ کیا تھا؟ دینِ خدا کی دعوت اور حفاظت اور اللہ کی رضا، تو یہی مقصد خدا کے سامنے تھا اور یہی مقصد کُل انبیاء کے سامنے تھا۔ اب اِس مقصد کی تکمیل کے لئے جو مومنین اِس رُوحانی علم کو (Use) کرتے ہیں اِس سے کام لیتے ہیں تو یہ اللہ کی مدد قرار پاتی ہے اور رسولوں کی مدد قرار پاتی ہے، جنہوں نے خدا کے دین کو چلایا۔

یاد رہے کہ قرآنِ مقدّس کے اندر ایک خاص اندازِ بیان ہے، اُس کی میں نشاندہی کروں گا کہ وہ کیا ہے۔ جب کسی کام کی بہت بڑی اہمیّت ہوتی ہے تو اُس وقت اللہ، خدا ہونے کے باوجود اپنے اُوپر مومنوں کی طرف سے احسان رکھتا ہے، حالانکہ حقیقت میں اُس کا احسان ہم پر ہونا چاہئے، وہ خود کو ایسا دکھاتا ہے ایسا ظاہر کرتا ہے جیسا کہ وہ محتاج ہے حالانکہ حقیقت میں وہ محتاج نہیں ہے، اُس کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، اُس کے لئے ایک خاص (Style) ہے، کہیں تو یہ کہتا ہے کہ مجھ کو قرضہ دو (۵۷:۱۱)۔ ابھی جس مومن کو ذرا بھی ہوش ہے تو وہ جانتا ہے کہ اللہ اور قرضہ یہ کیا بات ہے!! یہ اپنے اُوپر احسان رکھتا ہے اور اِس سے اُس کام کی اہمیّت ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ کام بہت (Important) ہے۔ مجھے اچھی طرح سے تفصیل سے یعنی بتانا چاہئے کہ خداوندِ عالم جہاں فرماتا ہے کہ ''وَاٰتُوا الزَّكَاةَ'' زکوٰۃ دو، اِس میں حکم ہے، (Command) ہے شاہانہ طریقے سے، اِس میں کچھ احسان نہیں ہے بلکہ اگر کوئی زکوٰۃ نہ دے تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجرم قرار پائے ڈر ہے، کیونکہ بادشاہ کا حکم ہے اور جہاں کہتا ہے کہ مجھ کو قرضِ حسنہ دو اِس کام کی بہت اہمیّت ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا ہے تو کوئی بات نہیں ہے وہ خود اِس بڑی فضیلت سے رہ جاتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک دم سے وہ مجرم ٹھہرایا جائے۔ بالکل اسی طرح جہاں خدا کسی بات کے سلسلے میں کہتا ہے کہ مجھ کو مدد دو، آسمان زمین کا مالک جو سب کی مدد کرتا ہے، جو سب کا مددگار ہے، اور ساری مخلوق کی دستگیری فرماتا ہے، ہم ایسے حقیر مخلوق سے کیا مدد ہو سکتی ہے، لیکن اِس کام کی اہمیّت

کی وجہ سے اور بے شک وہ قدرت والا ہے، اِس کام سے گویا کہ ایک ایسے کام کو انجام دیتا ہے کہ اُس کو مدد کی حیثیت حاصل ہو یا مدد کی شکل دے، مدد کی صورت دے، مدد کا درجہ دے یہ اُس کے ہاتھ میں ہے، یہ وہ کرسکتا ہے، تو دیکھا آپ نے کہ یہ علم کا جو کام ہے یہ کتنا (Important) ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو دُنیا میں آئے تھے وہ اپنے اپنے وقت میں اچھی طرح سے کام کرکے دُنیا سے رحلت ہو گئے۔ اب وہ ایک کام کے محتاج ہیں کیا؟ اُن کا ایک نظریہ تھا، اُن کا ایک دین تھا، اُن کے سامنے ایک مقصد تھا وہ مقصد آخر کو نہیں پہنچا تھا، وہ مقصد قیامت تک ہے۔ لہٰذا اِس مقصد کی تکمیل کے لئے کچھ مومنین ایسے ہوں دُنیا میں، کہ وہ اُن ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی نمائندگی کریں، اُس چیز کو آگے بڑھائیں جو سب پیغمبروں کے سامنے تھی یا اُس دین کی حفاظت کریں جس کی [حفاظت] کبھی پیغمبروں نے کی تھی، اُس دین کی خدمت کریں جس کی خدمت سب پیغمبروں نے اپنے اپنے وقت میں کی تھی، اُس دین کی خدمت کریں جو اللہ کا دین ہے۔ اللہ ایک انسان کے بھیس میں دُنیا میں آکر چھوٹے چھوٹے حقیر کام انجام نہیں دے سکتا ہے، ایک طرح سے نہیں دے سکتا ہے، یہ اُس کی شان کے لئے مناسب نہیں ہے، زیبا نہیں ہے کہ وہ ایک حقیر سی مخلوق، آپ ہم جیسی بن کے دُنیا میں آئے اور چھوٹے چھوٹے کام کرے، لیکن قادر ہے کہ اُس نے آپ کو، ہم کو، سب کو پیدا کیا اِس کام کے لئے اور وہ آپ کے دیگر مومنین کے توسّط سے یہ کام انجام دے سکتا ہے لیکن ذاتی طور پر یہ کام انجام نہیں دے سکتا ہے۔ لہٰذا اُس نے ایک لفظ کو استعمال کیا جو حقیقت میں دیکھا جائے کہ یہ لفظ اُس کے لئے شایانِ شان نہیں ہے، یہ کہا کہ خدا یہ جاننا چاہتا ہے، خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے، خدا یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کون اُس کی مدد کرتا ہے۔ اگر ہم تاویل میں نہ جائیں، تو لوہے کو لوہا مانیں اور شریعت کے مقام پر ٹھہر کر بات کریں تو اِس کا مطلب یہ ہوگا جیسے زمانۂ رسولؐ میں تلوار تھی، نیزہ تھا اور لوہے کے سامان تھے، اِن سے جنگ کرنا، اللہ اُس زمانے کے مطابق شریعت کے (Level) پر اپنی مدد قرار دیتا ہے کوئی شک نہیں اگر تاویل میں جائیں تو لوہے کی تاویل بنے گی چونکہ جہاد دو قسم کا ہے، ابھی ابھی میں نے وہ حدیث پڑھ کر سنائی رسولؐ نے فرمایا تھا کہ میں نے تنزیلی جنگ کی تھی تو علیؑ تاویلی جنگ کریں گے۔ جس چیز کی یا جس بات کی رسولؐ نے پیش گوئی کی ہے تو وہ تو ہو کر رہنے والی ہے، یعنی رسولؐ نے فرمایا تھا کہ علیؑ میرے بعد تاویلی جنگ کریں گے، تو علی سے مُراد ائمہ ہیں، سب امامؑ ہیں۔ جس طرح خدا کی طرف سے رسولؐ نے جنگ کی اور رسول کی طرف سے علیؑ نے جنگ کی اور علیؑ سے سب امام مُراد ہیں اور ائمہ کے سب لشکر ہوتے ہیں، لشکر ہوا کرتے ہیں، ہر امام کے لشکر ہوتے ہیں۔ اگر زمانہ شریعت کا ہے تو ظاہری جہاد ہوتا، اگر زمانہ حقیقت کا ہے تو تاویلی جہاد ہوتا ہے اور تاویلی جہاد علم کا ہوتا ہے، علمی جہاد میں علمی (Activities) ہوتی ہیں یعنی علم کو فروغ دینا، اُس کو مضبوط کرنا، اُس کو پھیلانا اور جس طرح دُنیا میں کوئی (Super-power) اِس لئے (Super-power) ہے کہ اُس کے پاس سامانِ جنگ ہے، وہ اسلحہ بناتی ہے، اُس

کے پاس اسلحہ کے کارخانے ہیں، وہ اسلحہ کو (Supply) بھی کرتی ہے، یہ دُنیا کی بات ہوگئی، تو اسی طرح رُوحانی اور تاویلی جنگ میں علم کا ہونا ایسے علم کا ہونا جو صحیح معنوں میں بہت ہی مضبوط ہو، بہت ہی پختہ اور صاف ستھرا ہو مِاس کے لئے قرآنی علم کی ضرورت ہے۔ قرآنی علم یعنی قرآن کی تاویل جو حقیقت میں امام کی تاویل ہے، تو یہ ہے لوہا اور لوہے کا ہتھیار۔ اِس لئے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم خدا کے دین کی حفاظت کے لئے علم کے اسلحہ کو تیار رکھیں اور دین کی حفاظت کریں، اپنوں کو علم دیں اور اِس کی قدر کریں، اِس کی اہمیّت کو سمجھیں اور اُس چیز کو ضائع نہ ہونے دیں تو یہ ہے لوہے کی تاویل۔ یہ سورۂ حدید ہے جو (۵۷) نمبر کی سورہ ہے اور جو آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی وہ (۲۵) نمبر کی آیت ہے اور اس سے آگے جو میں نے پڑھا تھا، وہ سورۂ فرقان ہے جو (۲۵:۱) ہے۔ تو اِس کے بعد میں ذرا رُکتا ہوں تاکہ اگر کوئی اِس سلسلے میں سوال ہو تو اُس سوال کے حل کے لئے کوشش کریں۔

ہمارے اِن عزیز نے سوال یہ کیا میری ایک بات کے حوالے سے کہ جس میں، میں نے کہا تھا کہ پیغمبرؐ صاحبِ تنزیل ہیں صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور اساس یعنی علیؑ صاحبِ تاویل ہیں ایک حدیث کے مطابق، تو انہوں نے اِس میں سے سوال پیش کیا کہ کیا آنحضرتؐ بذاتِ خود تنزیل اور تاویل دونوں کا کام نہیں کر سکتے تھے، اِس میں کیا بات تھی؟ انہوں نے ایسا سوال کیا۔ اِس کے لئے جواباً گزارش ہے کہ بے شک آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم جس طرح تنزیل جانتے تھے اسی طرح تاویل بھی جانتے تھے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تئیس (۲۳) سال کی نبوّت و رسالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ اب آپ کے بعد آپ کے جانشین کو وہ کام کرنا تھا جو حضورؐ کا کام تھا، تنزیل کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ آسمان سے کوئی کتاب حاصل کی جائے، تو یہ بات ناممکن تھی اور نہ اِس کی ضرورت تھی کہ ایک نئی کتاب آسمان سے حاصل کی جائے، قرآن موجود تھا، نازل ہوا تھا۔ اب اِس کا کون سا کام باقی رہا تھا؟ تنزیل اور تاویل جو پیغمبرؐ کے کام تھے تو تنزیل لوگوں کے سامنے تھی یعنی قرآن کا ظاہر اور تاویل لوگوں کے سامنے نہیں تھی، لہٰذا رسولؐ کے اِن دو (۲) کاموں میں سے زیادہ سے زیادہ تاویل کا کام باقی رہتا تھا، اِس کے لئے مولا علیؑ کو مقرر کیا گیا، ایک بات اور دُوسری بات کہ تنزیل اور تاویل میں کیا فرق ہے یہ جاننا چاہئے، اِس سوال کے ساتھ اِس نکتے کا تعلّق ہے، تنزیل اور تاویل میں یہ فرق ہے کہ تنزیل میں زیادہ سے زیادہ شریعت آتی ہے اور تاویل میں زیادہ سے زیادہ حقیقت آتی ہے۔ اگر رسولِ اکرمؐ تئیس (۲۳) سال کی مدّت میں شریعت اور حقیقت کو باہم ملاتے تو اِس تضاد سے کچھ کام نہیں بنتا کہ شریعت، حقیقت کی نفی کرتی اور حقیقت شریعت کی نفی کرتی کیونکہ دونوں کے درمیان تھوڑا سا تضاد ہوتا ہے، لہٰذا یہ بات ناممکن تھی کہ تئیس (۲۳) سال کی مدّت میں شریعت کو بھی جاری کریں اور ساتھ ساتھ حقیقت کو بھی جاری کریں۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: لفظِ فرقان کی وضاحت، سوال و جواب

کیسٹ نمبر: Q-5B تاریخ: ۲؍ جولائی ؍ ۱۹۸۲، کراچی

Click here for Audio

یہ بات ناممکن تھی کہ تیئس (۲۳) سال کی مدّت میں شریعت کو بھی جاری کریں اور ساتھ ہی ساتھ حقیقت کو بھی جاری کریں۔ اُس کو (Separate) رکھنا ہے، الگ (Time) پر اُس کو استعمال کرنا تھا، کیونکہ لوگوں کے لئے یہ دو (۲) قسم کا درس ممکن نہیں تھا، اُن کو پہلے شریعت کا درس دینا تھا۔ لہٰذا رسولؐ جو دو (۲) باتیں جانتے تھے اُن میں سے شریعت کو ظاہر کیا اور جو دُوسری بات تھی وہ اپنے جانشین کے لئے چھوڑی، اور پھر مولا علیؑ نے بھی اپنی زندگی میں اِس کو پورا کرنا نہیں تھا، چونکہ علیؑ سے مُراد سب اَئمہ ہیں، اگر قرآن میں علیؑ کا نام ہے یا کوئی آیت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علیؑ کی شخصیّت کے لئے ہے وہ، وہ علیؑ کے نور کے لئے ہے، اور علیؑ کا نور جو ہے وہ قیامت تک قائم ہے، تو تب ہر امام سے اُس آیت کا تعلّق ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر رسولؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ علیؑ میرے بعد تاویل پر جنگ کریں گے، اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ علیؑ کی شخصیّت کے زمانے میں تاویل کا کام ختم ہو جائے گا۔ اِس سے یہ ظاہر ہوا کہ علیؑ سے مُراد سب امام ہیں، زمانے کا امام علیؑ ہے، ہر زمانے میں تاویل کا کام ہوتا رہے گا، تو بہر حال سوال اصل میں یہ تھا کہ رسولِ اکرمؐ آیا تنزیل و تاویل دونوں جانتے تھے۔ ہاں! دونوں جانتے تھے، کیونکہ قرآن میں ہے: وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (۳:۷) یہ قرآن کا لفظ ہے، آپ جانتے ہیں ماشاءاللہ اتنی عربی کو کہ عربی کے اندر (Singular) اور (Plural) کس طرح بنتا ہے، عربی کے اندر (Singular) الگ ہے اور (Dual) یعنی تثنیہ الگ ہے، اُس کے بعد (Plural) آتا ہے، دو (۲) سے اُوپر (Plural) آتا ہے۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ میں ایک شخص کا ذکر نہیں ہے، دو (۲) کا نہیں ہے، دو (۲) سے اُوپر ہے، یہ معلوم نہیں کہ تین (۳) ہیں یا چار (۴) ہیں یا پانچ (۵) ہیں یا زیادہ ہیں لیکن جمع ہیں، گرامر کے لحاظ سے یہ معلوم نہیں ہے لیکن عقیدہ اور ایمان کے لحاظ سے [یہ] معلوم ہے کہ سب اَئمہ اُس میں ہیں، وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ میں پیغمبر ہیں، علیؑ ہیں اور حسنؑ حسینؑ اور سب امام اِس میں مذکور ہیں کہ وہی ''راسخون فی العلم''، جو علم میں پختہ کار ہیں، جو قرآنی علم میں پختہ کار ہیں سے مُراد جو قرآن کی تاویل کو جانتے ہیں تو اِس میں سب سے پہلے پیغمبر کا ذکر ہے، لہٰذا پیغمبر جانتے تھے۔ قاضی نعمان کی (Source Books) میں اور دیگر اسماعیلی (Source Books) میں اِس کا ذکر ہے کہ تاویل سب سے پہلے آنحضرتؐ جانتے تھے اور سب امام تاویل جانتے ہیں، تو یہ اِس سوال کا جواب ہے کہ تاویل کو

(Separate) رکھا جاتا ہے اور تنزیل کو (Separate) رکھا جاتا ہے اور یہ سب چیزیں ملا کر اسلام کے اندر (Gradual Guidance) بن جاتی ہے، یعنی تدریجی ہدایت۔ یہ جاننے کی چیز ہے کہ اسلام کے اندر تدریجی ہدایت ہے یعنی (Gradually) ہدایت ملتی ہے، اِس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ قرآن ایک بنی بنائی مکمّل کتاب کی حیثیت میں نازل نہیں ہوا، خدا اگر چاہتا تو اپنی قدرت سے [قرآن کو] ایک (Complete book) بنا کے فرشتے کے ذریعے سے آنحضرتؐ کے گھر میں، آنحضرتؐ کے سامنے رکھوائی جاتی، ایسا نہیں ہوا بلکہ (Portion by Portion) قرآن نازل ہوا، اِس میں کیا حکمت تھی؟ اور یہ تئیس (۲۳) سال کی مدّت میں نازل ہوا یعنی قرآن نزول کے حساب سے تئیس (۲۳) سال پر پھیلا ہوا ہے، اور اِس کی تاویل پورے زمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔ تنزیل تو تئیس (۲۳) سال پر پھیلی ہوئی ہے اور تاویل جو ہے قیامت تک پھیلی ہوئی ہے، اِس حساب سے اور اِس اعتبار سے کہا گیا کہ جو ہدایت ہے اسلام کی ہدایت وہ (Gradual) ہے، تدریجی ہے۔ چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے اور آپ اپنے بچّوں کو تدریجی تعلیم دیتے ہیں، دُنیا کے اندر کوئی ہنر ہے، کوئی تعلیم ہے [وہ] تدریجی ہے ایک دن میں نہیں ہے، کوئی بھی اہم ہنر یا کوئی بھی اہم تعلیم ہے وہ پھیلی ہوئی ہوتی ہے، آہستہ آہستہ، آہستہ، آہستہ کیونکہ (Nature) جو ہے وہ یعنی یہ ہے کہ (Nature) کو سمجھنے کے لئے ایک درخت کو لیجئے کہ وہ سب سے پہلے ایک بیج ہے، اور بیج سے آگے بھی اُس کے مرحلے ہیں۔ خیر بیج سے لے لیں، تو بیج کو بوئیں تو کتنے مراحل طے ہوتے ہیں، اور ایک چھوٹا پودا ہے، پھر ایک درمیانی پودا ہے، بڑا پودا ہے اور درخت ہے لیکن اِس اثنا میں کتنے مراحل طے ہوتے ہیں یا ایک بچّے کو لیں کہ فطرت کیا ہے کہ ایک بچّہ پہلے کیا ہے؟ ایک قطرہ ہے اور ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، پھر چھوٹا سا بچّہ ہے، کتنے مہینوں کے بعد ایک (Complete) بچّہ ہے، پھر دودھ پیتا بچّہ ہے وغیرہ وغیرہ، اور پھر ایک درمیانی عمر کا انسان اور پھر ایک بوڑھا انسان، یہ (Nature) ہے، تو دین کو (Nature) کہا گیا ہے، جب (Nature) یہ ہے اور دین (Natural) ہے تو پھر (Guidance) کیسی ہونی چاہئے؟ (Guidance) بالکل (Natural) ہونی چاہئے، تو دیکھا میں آپ کو ظاہر میں کچھ چیزیں بتاؤں۔

جب قرآن نازل ہوا تو آج جو قرآن ہے وہ کب ایسا تھا کہ آہستہ، آہستہ، آہستہ، آہستہ، قرآن کی تحریر کو دیکھیں، اخباروں میں اُس زمانے کی تحریر [کے] آپ کو نمونے بتاتے ہیں، یہ تحریر جو آج ہے یہ اُس زمانے میں نہیں تھی، (Writing) یہ جو زیر و زبر، پیش و حرکات جو ہیں، علامتیں جو ہیں، جو ٹھہرنے کی علامتیں ہیں نہیں تھیں، جو آج اتنی تفسیریں ہیں نہیں تھیں، جو فقہ کے اتنے سکول ہیں وہ نہیں تھے، جو قرآن کی تفسیر کرنے والے اتنے مفسّر بعد میں ہوئے اُس وقت نہیں تھے، جو اتنے ترجمے آج ہیں وہ نہیں تھے، تو (Gradually) قرآن کی یہ ترقّی ہوئی اِس کو ترقّی کہنا چاہئے۔ لہٰذا لوگوں نے جو اپنی طرف سے جو کچھ کیا اِس مثال کے مطابق خدا کے نزدیک بھی (Originally) ہدایت (Gradual) ہے، تو

مطلب اس کا یہ ہوا کہ تئیس (۲۳) سال میں قرآن کی تنزیل پھیلی ہوئی ہے اور اِس کے بعد سارے زمانوں پر تاویل پھیلی ہوئی ہے اور تاویلات مختلف ہیں، بہت زیادہ ہیں، مختلف زمانوں کے لئے مختلف قرآن کی تاویلات ہیں۔ آج کے لئے کچھ اور تاویل ہے، کہ انسان نے چاند پر جھنڈا گاڑا اور اُس کو فتح کیا اور چاند سے متعلّق جتنے بھی سوالات اُبھریں گے اور اُن سوالات کے لئے جیسے بھی جوابات مہیّا کئے جائیں گے وہ تاویل کی روشنی میں ہوں گے، وہ بالکل (Modern) ہوں گے اور اِس زمانے کے مطابق ہوں گے اور وہ ایسے ہوں گے کہ زمانۂ نبوت میں نہیں تھے، بعد کے زمانے میں کسی [بھی] وقت میں نہیں تھے، وہ اَب کے ہوں گے، اسی طرح اور بھی مسائل پیدا ہو جائیں تو تاویل میں سے جواب دیا جائے گا اُن مسائل کے لئے لیکن وہ جوابات بالکل اِس زمانے کے ہوں گے، اِس سے ظاہر ہے کہ تاویل جو ہے ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ کبھی حدودِ دین کی تاویل تھی، آج ظاہر میں حدودِ دین کی تاویل تو نہیں ہے، لیکن رُوحانیت میں البتہ حدودِ دین کی تاویل ہے، بہرحال انہوں نے جو تاویل وتنزیل کے بارے میں سوال کیا تھا تو اُس کا یہ جواب ہے۔

اِنہوں نے ایک (Important) سوال کیا ہے، اور اِن کے نزدیک تورات کی (Complete) کتاب آئی تھی لیکن یہ ظاہری بات ہے، کہ تورات مکمّل کتاب کی صورت میں موسیٰؑ کو دی گئی ہے اور اگر وحی کے اُصول کو سامنے رکھیں اور وحی کو سمجھیں، اور وحی کے موضوع پر گفتگو کریں بحث کریں تو وحی ایک رُوحانی چیز ہوتی ہے اور وحی کا تعلّق دل سے ہوتا ہے، جس طرح کہ قرآن کے اندر بہت ساری آیتیں ایسی ہیں جو کہ وحی کے موضوع سے متعلّق ہیں اور اُن آیتوں کے اندر یہ بیان ہے کہ کس طرح قرآن آنحضرتؐ کے قلبِ مُبارک پر نازل ہوا وہ آیات (۲۶:۱۹۲۔ ۱۹۴) آپ کو بتائیں گی۔ اِس لحاظ سے ایسا لگتا ہے کہ توارت کے کچھ بھید ایسے ہیں جن کو لوگ نہیں سمجھتے تھے، بہت ممکن ہے کہ (Original) وحی رُوحانی ہو اور اُس کو لکھ لکھ کے کتاب کی صورت بنائی گئی ہو، اور کچھ لوگوں نے سمجھا ہو کہ اسی شکل میں خدا کے حضور سے [کتاب] آئی ایک بات، اور دُوسرے مرحلے کی بات اِس جواب کے سلسلے میں یہ کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ ایک (Complete Book) کی حیثیت میں ملی تھی لیکن اِس پر عمل اور سمجھانے کا جو طریقہ اور پھر اُس کی تاویل، اِس کے لئے پھر وہی بات کہ وقت چاہئے، کیونکہ ہم اپنی جزوی عقل سے بھی ذرا سوچتے ہیں تو اِس کا کوئی مطلب نہیں بنتا ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ تورات (Complete Book) کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے اور موسیٰؑ کے سامنے آئی تھی، تو اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایک دن میں یا ایک مہینے میں یا ایک سال میں ساری تورات عمل میں لائی جائے یہ بات ناممکن تھی، پھر وہی بات ہوگئی کہ اِس کی عملی جو ہدایت تھی وہ (Gradual) اور تدریجی ہدایت بن گئی، اور موسیٰ علیہ السّلام نے جس طرح اپنے پیچھے جانشین کو چھوڑا اور موسیٰؑ کی شریعت کے لئے جو ایک لمبا دَور درکار تھا اُس کو بھی سامنے رکھیں تو اُس میں بھی وہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہدایت جو ہے وہ (Gradual) ہے تدریجی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمؑ کے لئے ایک دَور ہے، اور نوحؑ کے لئے ایک دَور

ہے اسی طرح موسیٰؑ کے لئے ایک دَور ہے، عیسیٰؑ کے لئے ایک دَور ہے، اور آنحضرتؐ کے لئے ایک دَور ہے تو اِن میں سے ہر عظیم پیغمبر کو جو دَور دیا گیا ہے، تو وہ دَور اِس لئے ہے کہ اُس کو جو شریعت دی گئی تھی یا جو کتاب دی گئی تھی اُس کتاب کی ظاہری ہدایت اور باطنی ہدایت یعنی تنزیل اور تاویل کو ملا کر اُس کے دَور پر پھیلا دیا جائے اور (On the Whole) لوگوں سے اُس مدّت میں یا اُس دَور میں اُس کتاب پر عمل کرایا جائے، اِس دَور کو انگلش میں (Cycle) کہا جاتا ہے، یہ بات بہت ہی مشہور ہے کہ یہ آدمؑ کا (Cycle) ہے اور نوحؑ کا ہے، ابراھیمؑ کا ہے، اور موسیٰؑ کا ہے، اور عیسیٰؑ کا ہے اور آنحضرتؐ کا ہے، تو بات تورات کے بارے میں تھی۔ ممکن ہے کہ کسی صورت میں کتاب کی شکل میں دی گئی ہو، لیکن جو عمل مقصود تھا وہ بتدریج عمل کرانا تھا جیسا کہ میں نے مثال دی نا! کہ دُنیا میں کسی بھی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی تعلیم یا کوئی علم ایک ہی دن میں حاصل کرے، اُس کے لئے وقت چاہئے، ایک شخص کے لئے جو تھوڑا سا وقت چاہئے تو پورے دَور میں جتنے لوگ ہیں اُن کے لئے پورا دَور چاہئے۔ فرد اور ملّت یا قوم، ایک جیسے ہیں یعنی فرد کو ایک لمبی مدّت چاہئے تو قوم کو اِس سے زیادہ وقت چاہئے چونکہ قوم کے لوگ جو ہیں نا [وہ] مختلف اوقات میں دُنیا میں آتے ہیں، مثلاً اسلام کے اندر رسولؐ کے زمانے میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے اور جو آج پیدا ہو رہے ہیں اِن کے درمیان میں (Difference) ہے زمانے کے لحاظ سے (Difference) ہے، جو آج مسلمان ہیں اِن کو وہ تعلیم نہیں چاہئے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں مسلمان تھے اُن کی تعلیم اِن کو نہیں چاہئے، اِن کو ایسی (Logic) چاہئے کہ زمانے نے جو سوالات پیدا کئے ہیں اُن کے لئے اِس (Logic) میں جواب مہیّا ہو، اِس سے بھی ظاہر ہے کہ اسلام کی جو ہدایت ہے وہ (Gradual) ہے۔ تواریخ کے طور پر ہم ایک نظر رکھیں گے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کیا بات تھی یہ تو تواریخ ہوگئی، تواریخ کو تو دیکھنا ہوتا ہے لیکن ہمارے لئے جو خاص ہے، ہمارے وقت کے لئے وہ کوئی اور چیز چاہیے۔ ہم نے سوچا ہے کہ قرآن کو سات (۷) حصّوں میں تقسیم ہم نہیں کریں گے یہ پہلے سے سات (۷) حصّوں میں تقسیم ہے۔

قرآن کا (Arrangement) دو (۲) طرح سے ہے ایک (Natural) ہے، ایک لوگوں کی طرف سے ہے، جو (Natural) ہے وہ یہ کہ اُس کے سورے ہیں جو (Natural) ہیں، یہ کہ اُس کی آیتیں ہیں اور باقی جو تیس پارے بنائے ہیں تو یہ (۳۰) دن میں پڑھنے کے لئے ہیں اور منزلیں جو بنی ہیں سات (۷)، یہ سات (۷) دن میں ختم کرنے کے لئے ہیں، جو ماہر لوگوں نے بنایا ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ قرآن پر ہم کچھ کام کریں لیکن یہ کام آپ کی مدد ہو تو ہو سکے گا، تنہا کسی درویش سے کچھ کام نہیں بنے گا، اِس میں سب سے پہلے مولا کی یاری چاہئے اور اُس کے لئے آپ سب کی دُعا چاہئے۔ اِس کے علاوہ پھر آپ کا تعاون چاہئے، شوق چاہئے، ذوق چاہئے، کوشش چاہئے۔ ہم اِس پر یہاں کچھ کام کریں گے، اِس پر کام کریں گے تو پھر یہ جماعت کے لئے کام ہوگا، اصل مقصد جماعت کا کام ہے، اِس کے لئے ہم کیوں ایسا نہ کریں کہ قرآن

کے جس طرح سات (۷) مراحل ہیں اِس کے مطابق ہم سات (۷) گروپ بنائیں، ہر گروپ کو قرآن کی ایک منزل دیں وہ اِس کے سوالات کریں، وہ اِس کی تفسیر کو، ترجمے کو دیکھیں، وہ اِس کو سمجھیں، وہ اِس سے متعلّق اگر کچھ کتابوں میں جو آیات ہیں لکھی ہوئی اُن کتابوں کو پڑھیں اور میرے ساتھ خط وکتابت کریں اور مجھ سے سوالات کریں یا میں اپنے طور سے اِن کو اِس منزل سے متعلّق کچھ چیزیں دے دوں تو وہ اِس منزل سے متعلّق ذمہ دار بنیں کہ جو تاویلات ہیں یا جو بھید ہیں اِن کو محفوظ کریں۔ اسی طرح دُوسرا گروپ، تیسرا گروپ یہاں تک کہ سات (۷) گروپ، تو ہم قرآن پر جس طرح سے کام کرنا چاہئے اِس طرح سے اگر نہیں کرسکیں لیکن پھر بھی ایک طرح سے کام کرسکتے ہیں۔ پھر سوچیں گے اِس میں اور کیا کیا کرنا چاہئے لیکن فوری طور پر ہم نے سوچا ہے کہ ہم سات (۷) گروپ بنائیں، تو یہ سات (۷) گروپ قرآن کی سات (۷) منزلوں کو پڑھیں، ظاہری طور پر پڑھیں، ترجمے کو دیکھیں، سوالات کریں اور تعاون حاصل کریں، اور اگر کچھ کتابوں میں متعلّقہ منزل سے متعلّق اچھی باتیں ہیں تو کتابوں کو بھی سامنے رکھیں، تو یہ ایک تجویز ہے اور یہ پکّی تجویز ہے۔

انہوں نے پوچھا کہ کسی کتاب میں شاید یہ ذکر ہے کہ جب کوئی انسان اِس دُنیا سے گزر جاتا ہے تو اُس کی رُوح کسی دُوسرے زندہ انسان میں منتقل ہو جاتی ہے اور وہاں سے جب اُس کی قیامت برپا ہو جاتی ہے تو اُس سے سوالات پوچھے جاتے ہیں، شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر، تو انہوں نے اِس (Portion) میں سے صرف سوالات کی نوعیّت پر سوال کیا ہے کہ وہ کیسے سوالات ہوتے ہیں۔ جس طرح عام شریعت میں یہ بات ہے کہ نکیر اور منکر کے نام سے دو (۲) فرشتے قبر میں آئیں گے، اور وہ پوچھیں گے کہ تمہارا پروردگار کون ہے؟ تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا پیغمبر کون ہے؟ تمہارا دین کونسا ہے؟ تمہارا قبلہ کیا ہے؟ وغیرہ، تو شریعت میں یہ باتیں ہیں، لیکن اگر وہ سوالات دُنیا کے اندر متعیّن ہوتے تو اُس خاص (Portion) کو سب لوگ یاد کرتے اور پھر اُس کو وہاں جواب دے کے کامیابی حاصل کرتے، دُنیا کے اندر جب یہ اُصول نہیں ہے کہ کوئی سکول، کالج، یونیورسٹی (Exam) میں کس قسم کے سوالات کرے گی تو یہ کوئی نہیں جانتا ہے، اگر یہ بات (Out) ہوگئی تو پھر امتحان فضول ہوگیا، پھر محنت کرنے والا اور محنت نہ کرنے والے کے درمیان کیا فرق ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہ سوالات عام نہیں ہیں، لیکن جس طرح کسی یونیورسٹی، کالج کے لئے مضمون کی نوعیت کے مطابق تیاری کی جاتی ہے اور سوالات اُسی مضمون کے متعلّق ہوتے ہیں (Particulars) یعنی سوال معلوم نہیں ہوتا ہے، مضمون معلوم ہوتا ہے، (Subject) معلوم ہوتا ہے جو پہلے سے پڑھایا جاتا ہے، چنانچہ مضمون یہ ہے کہ خدا شناسی، سچّے دین اور حقیقت وغیرہ یہ مضمون ہے، لیکن اِس کے باوجود چونکہ ہمیں کچھ نہ کچھ اِس میں اصل بات کی نشاندہی کرنی ہے اِس لئے کہیں گے کہ دُنیا کے اندر خدا کی نظر میں جو چیز خاص ہے، خدا کا جو مقصد ہے، جو دینِ خاص ہے، جو حقیقت ہے، جو خدا شناسی ہے، امام شناسی کے رنگ میں جو خدا شناسی ہے وہی سوالات ہوں گے، ایسا نہیں کہ عام طور سے پوچھا جائے گا کہ تمہارا اللہ، تمہارا خدا کون ہے؟

جواب دیا جائے کہ اللہ، بس کافی ہے اور تمہارا رسول کون ہے؟ تو میرا رسول آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ۔تمہارا قبلہ کیا ہے؟ تو میرا قبلہ کعبہ ہے، یہ بات ہو تو پھر خدا کے وہ پُرحکمت امتحانات ختم ہو گئے ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حقیقت کے بارے میں سوالات ہوں گے، اور ایک مومن کو جو صحیح مومن ہے، جو حقیقت شناس ہے [اُس کو] وہاں پر خود بخود جوابات مہیّا ہوں گے یا یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے کہا ہے کہ لاشعوری طور پر، تو لاشعوری طور پر اُس کا حساب کتاب ختم ہو جائے گا۔ اب ٹھہر کر میں ذرا دوبارہ اِس کی وضاحت کرتا ہوں جاننا چاہئے کہ قیامت کے حساب و کتاب کے لحاظ سے لوگوں کے دو (۲) گروپ ہیں، ایک چھوٹا سا گروپ ہے، ایک بہت بڑا گروپ ہے، چھوٹا سا گروپ وہ ہے جن سے حساب کتاب نہیں لیا جائے گا نہ کوئی سوال پوچھا جائے لاشعوری کا مطلب یہ ہوا، اِن کے لاشعوری میں یہ سب کچھ ختم ہو چکا ہوگا اور دُوسرا جو بہت بڑا گروپ ہے اُن سے سوالات بھی ہوں گے اور ہر چیز ہوگی وہ پھنس جائیں گے ۔

آپ پوچھیں کہ ایک چھوٹا سا گروپ ہے کون سا ہے یا کس وجہ سے اُس سے سوالات نہیں کئے جائیں گے ۔ آپ قاضی نعمان کی سب سے اہم کتاب دعائم الاسلام کو لیں، اُس میں یہ ذکر آیا ہے کہ کچھ لوگوں سے خدا حساب کتاب نہیں لے گا کیونکہ اِن کا حساب کتاب دُنیا میں ختم ہو چکا ہوگا۔ اِن کا حساب کتاب دُنیا میں ختم ہو چکا ہوگا بس اِن کو بہشت میں داخل کرنا ہے اور کچھ نہیں، تو اُن میں سے ایک وہ بھی ہیں جو "جاراللہ" ہیں، جاراللہ کا مطلب خدا کے ہمسائے، خدا کے پڑوسی ہی ہیں [اذکان یوم القیامۃ حشر اللہ الخلائق نادی منادلیقم أھل الفضل...ویقلون مافضلکم ھذاالذی تدخلون بہ الجنۃ قبل الحساب؟......فیقال لھم: ادخلوا الجنۃ فانتم جیران اللہ فی دار السلام، خلاصۂ حدیث: تین قسم کے لوگ قیامت کے حساب کتاب کے بغیر بہشت میں داخل کر دیئے جائیں گے، وہ یہ ہیں: اہلِ فضل، اہلِ صبر اور جیران اللہ (خدا کے ہمسائے)، دعائم الاسلام، حصّۂ دوم، کتابُ العطایا، ۳۔ ذکر تباذُل وتواصُل حکمت نمبر: ۱۷۳، ۲۵۹، کتاب: ہزار حکمت] ۔ اب خدا کے پڑوسی دُنیا کے اندر ایسا نہیں ہے کہ کسی خاص شہر میں یا کسی خاص محل میں، خدا کا (Palace) ہو محل ہو اور اُس کے قرب و جوار میں کچھ گھر ایسے ہوں جو کہ اِس ظاہری نزدیکی کے اعتبار سے وہ گھر اور گھر والے جو ہیں خدا کے پڑوسی کہلائیں، ایسی کوئی بات نہیں، یہ تاویل کی بات ہے، معرفت میں جو خدا کے نزدیک ہیں وہی خدا کے پڑوسی ہیں، ہمیں یقین سے کہنا ہے بلکہ حقیقتاً کہنا ہے کہ وہ اسماعیلی ہیں ۔ اسماعیلیوں سے حساب کتاب نہیں لیا جائے گا، اُن سے سوالات بھی نہیں ہوں گے، اُن سے حساب کتاب جو کچھ بھی ہے وہ دُنیا میں ہے ۔ اسی لئے امامؑ نے فرمایا کہ پُلِ صراط دُنیا کی زندگی ہے [فرمایا: تم جانتے ہی ہو کہ پُلِ صراط کہاں ہے یہ زندگی ہی پُلِ صراط ہے جو اسی دنیا میں ہے، اِس دُنیا جیسی مشکل کوئی اور جگہ نہیں ہے، کچھ مندرا۔ ۲۲۔۱۱۔ ۱۹۰۳] جب پُلِ صراط کے متعلّق امام نے یہ (Clear) فرمادیا کہ انسان کی زندگی پُلِ صراط ہے تو پھر دُوسری متعلّقہ چیزیں بھی اسی زندگی کے اندر آتی ہیں، نکیر اور منکر بھی اسی زندگی میں آتے ہیں، قبر بھی اسی زندگی میں آتی

ہے، بہت ممکن ہے کہ ہر مومن میں سے کوئی ایک ذرّہ کہیں گیا ہو، اور اُس کی قبر وہ کسی اور کی شخصیّت ہو، کسی اور کی شخصیّت میں کسی مومن کا ذرّہ پنہان ہو، دفنایا گیا ہو اور مومن مرجائے تو یکا یک بہشت کے درمیان میں بیدار ہو جائے اور پھر مومن سوال کرے گا کہ یا مولا! شریعت میں اسلام میں اتنی ساری چیزوں کا ذکر تھا، پُلِ صراط، نکیر، منکر، آفتابِ محشر یہ! وہ!، وہ کہاں ہیں؟ تو وہاں بہشت کی پُر امن فضا میں فلم کے طور پر ہر چیز [کو] آرام سے دکھایا جائے گا اور زندگی جو پیچھے گزری ہے اُس زندگی میں سے نکھار نکھار کے بتایا جائے گا کہ دیکھو تمہاری زندگی کے فلان، فلان، فلان، فلان، فلان مرحلے میں یہ چیزیں، اِس نوعیت سے، چونکہ اُن چیزوں کو تو دیکھنا ہے، چونکہ علم کے طور پر عملی طور پر دیکھنا ہے، علم کے لئے دیکھنا ہے اور خدا کو اِن تمام معنوں میں قادر کہا جاتا ہے، قدرت والا ایسا ہی کرتا ہے، تو خدا کی قدرتیں عجیب وغریب ہیں۔ ہم سنتے کچھ اور ہیں اور دیکھتے کچھ اور ہیں یا جب دیکھیں گے تو وہ چیزیں کچھ اور ہوں گی۔ یہ اسماعیلی مذہب کی فضیلت ہے اور خدا کے پڑوسیوں کی یہ تاویل ہے۔ لہٰذا آپ اِس میں سے تھوڑا سا خلاصہ اُن کو لکھیں اور دوسرا کوئی سوال۔

اِن کا سوال ہے کہ اسماعیلی مذہب کے اندر نمبر سات (۷) کی بہت بڑی اہمیّت ہے اس لئے ہر ساتواں امام جو ہوتا ہے اس کی بہت بڑی اہمیت ہوتی ہے، اُس کے زمانے میں کوئی نہ کوئی انقلاب برپا ہوتا ہے، قیامت برپا ہوتی ہے، تو اب جو موجودہ وقت میں امامِ عالی مقام ہیں وہ سات (۷) دفعہ سات (۷) ہیں تو آیا اِس کے زمانے میں کوئی انقلاب رُونما ہونے کا امکان ہے اور وہ (Particularly) پوچھتے ہیں کہ آیا اِس میں اسماعیلی مذہب میں کوئی انقلاب آئے گا۔ جواب ہے، کہ اسماعیلی مذہب میں انقلاب آئے یا نہ آئے اِس کی ضرورت نہیں ہے چونکہ امامؑ کی وجہ سے جس انقلاب کے آنے کی توقع ہوتی ہے وہ اِس پوری کائنات سے متعلّق ہے اور سیارۂ زمین سے متعلّق ہے، کیونکہ امامؑ کی ساری طاقتیں انقلاب کے لحاظ سے یا تبدیلی کے لحاظ سے اسماعیلیت تک محدود نہیں ہیں کیونکہ وہ اِس کائنات کے سورج ہیں اور اُس کی کرنیں جو ہیں مختلف صورتوں میں اور مختلف رنگوں میں اِس پوری دُنیا پر ضوفشانی کرتی ہیں۔ لہٰذا انقلاب ظاہر میں بھی [اور] انقلاب باطن میں بھی آسکتا ہے، لیکن یاد رہے اگر ہم مانیں کہ ساتواں امام یا سات (۷) دفعہ جو سات (۷) ہے اِس دَور کا امام بہت بڑی تبدیلیوں کا مالک ہے، تو اِس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ تبدیلیاں چند سالوں تک محدود ہو جائیں، بلکہ ایک پورے دَور پر انقلاب پھیلا ہوا ہوتا ہے، تاہم یہ بات صحیح ہے اور ضروری ہے کہ رُوحانی طور پر ظاہری طور پر اِس امام کے دَور میں بہت سی سائنسی اور فنّی، سیاسی تبدیلیاں آچکی ہیں اور آجائیں گی۔ چونکہ امامؑ کائناتی طاقت کا مرکز ہے، جس طرح مادّی لحاظ سے سورج اِس کائنات کے مرکز میں واقع ہے اور نظامِ شمسی کے اندر جو چیز ہے وہ براہِ راست سورج سے متاثر ہے، اسی طرح باطنی طور پر دونوں جہاں کا جو طاقتور سورج ہے، [یعنی] نور کا وہ کا امام ہے، اور امام سے دونوں جہان متاثر ہو جاتے ہیں خدا کا نظام ہی ایسا ہے۔ لہٰذا اِس دَور میں سورج کے اندر ایک طوفان ہے، جس طرح سائنسدان یہ مانتے

ہیں کہ سورج کے اندر یعنی روشنی کے (Floods) آتے ہیں، دھماکے ہوتے ہیں اور سورج کے اندر جو مادّہ ہے وہ اُبلتا ہے، وہاں شاید بے پناہ آواز بھی ہے، (Bursting) بھی ہے، طوفان بھی ہے اور لہریں بھی اُبھرتی ہیں اور بہت اُس میں سے طوفان آتا ہے۔ یہاں تک کہ اُسکے اُس نورانی طوفان کے زیرِ اثر دُنیا کے اندر کوئی طوفان یا کوئی سخت بارش یا کوئی ایسی تبدیلی یا کوئی ایسی چیز رُونما ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ یعنی سائنسدان یہ محسوس کرتے ہیں بڑی بڑی دُوربینوں کی مدد سے کہ سورج کی سطح پر کالے کالے داغ نظر آتے ہیں، حقیقت میں یہ کالے کالے داغ نہیں ہیں لیکن سورج کی گہرائی سے یعنی جو دھماکے ہوتے ہیں اُس کے اندر جو مادّہ ہے اُس کی تحلیل ہوتی ہے جو ذرّات ہیں وہ (Light) میں تبدیل ہو جاتے ہیں [وہ] اُس کا (Flood) ہیں، (Waves) ہیں، لہریں ہیں، موجیں ہیں۔ چونکہ سورج کی سطح پر کچھ اور رنگ ہے اُس کی گہرائی میں کچھ اور رنگ ہے، اور جو زوردار لہریں اُبھرتی ہیں اور جن کا رنگ یا تو سرخ ہوتا ہے یا ہرا ہوتا ہے، تو یہاں وہ کالے کالے داغ جیسے لگتے ہیں، تو یہ ثبوت کے لئے ہے کہ اُس کے اندر ہر وقت طوفان ہے، اِسی طرح اُس نور کے اندر بھی ایک طوفان ہے اور جس کا اثر دونوں جہان پر یعنی عالم رُوحانی اور عالم جسمانی پر پڑتا رہتا ہے۔ چونکہ عالم جسمانی مادّی طور پر تو سورج کے نیچے ہے، لیکن عالم جسمانی کی ایک رُوح ہے اُس رُوح کے ساتھ بھی اِس عالم کا رابطہ ہے، تو رُوح کی نسبت سے یہ دُنیا رُوحانی طور پر بھی (Effect) [یعنی] اثر لیتی ہے، تو اسی طرح اِس دُنیا کے اندر انقلابات تبدیلیاں رُونما ہو چکی ہیں. بہت کچھ اور اَب بھی. بہت ساری چیزیں وُقوع پذیر ہونے والی ہیں، یہ اُن کے سوال کا جواب ہے۔

بے شک اللہ کی تاویل امام ہیں یعنی اللہ کی تاویل امام ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جہاں قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جس میں اللہ بادلوں کے ساتھ، فرشتوں کے ساتھ دُنیا میں آئیں گے (۲:۲۱۰) تو یہ بات امامؑ سے متعلّق ہے، کسی امام کے اسی طرح دُنیا میں آنے سے متعلّق بات ہے تو پھر اِس (Sense) میں امام، اللہ کی تاویل ہوئے اور جو (Concept) ہے شرعی طور پر یا دُوسری طرح سے اللہ کا [جو Concept] ہے اُس میں یہ امکان نہیں ہے کہ وہ کبھی دُنیا میں آئے اور اللہ سے متعلّق جو بات ہے وہ امامؑ سے پوری ہو جائے گی۔ اِس طرح امام، اللہ کی تاویل ہو گئے قرآن میں، اور کبھی اللہ کی تاویل پیغمبر بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی تاویل عقلِ کُل بھی ہوتا ہے اور نفسِ کُل بھی اللہ کی تاویل ہوتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر امامت کا جو درجہ ہے وہی اللہ کی تاویل ہے، اور پھر اِس کے علاوہ جو بات ہے وہ شاید کوئی راز کی بات ہو سکتی ہے تو اُس پر شاید (Discuss) زیادہ نہیں کرنا چاہئے، اتنا ہی کافی ہے۔

خدا کے سو (۱۰۰) ناموں میں سے سب سے بڑا نام وہ ہے جس کو امامؑ (Recognize) کر کے کسی مُرید کو بتائے کہ تم یہ نام پڑھو تو اُس شخص کے لئے وہی نام عظیم ہے، اسمِ اعظم ہے جو امام دیتا ہے، اور اگر دُوسرے مومن کے پاس دُوسرا نام ہے تو اُس کے لئے وہ نام سب سے بڑا ہے جس کو امامؑ نے اُس کے لئے مقرّر کیا ہے۔ ویسے تو امام کے دو (۲)

قسم کے نام ہوتے ہیں، خدا کے دو (۲) قسم کے نام ہوتے ہیں کچھ بولنے والے نام ہوتے ہیں اور کچھ خاموش نام ہوتے ہیں، خاموش ناموں کے مقابلے میں بولنے والے اللہ کے نام بزرگ ہیں۔ اِس سے ائمّہ مُراد ہیں، ہر زمانے کا امام خدا کا زندہ اور بولنے والا اسمِ اعظم ہے، یعنی حقیقت میں امامؑ ہی اسمِ اعظم ہیں۔ اَب یہ امام جس خدا کے خاموش نام کو لے کر کسی مومن کو دے گا تو وہ خدا کا خاموش نام امام کی نمائندگی کرے گا، امام کو (Represent) کرے گا، اِس لئے اُس شخص کے پاس وہ نام، اُس مومن کے پاس وہ نام، امام کی جگہ پر ہوگا، امام کی نمائندگی کرے گا، اور خدا کا اسمِ اعظم قرار پائے گا، جس کو امام نے مقرّر کیا ہے۔ چونکہ امام کو شخصیّت کے ساتھ کوئی مومن نہیں اپنا سکتا ہے، امام کو ایک اسم کے اندر، [یعنی] امام جو اسمِ اعظم ہے اُس کو کوئی مومن جسم کے ساتھ نہیں اپنا سکتا ہے، اپنے دل میں جو مومن امام کو رکھے گا اسمِ اعظم کے طور پر وہ ایک اسم کی شکل میں رکھے گا، اور اُس کے لئے طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ خدا کے ناموں میں سے جونسا نام، امام دے مومن کو، وہ نام امام کی جگہ پر اسمِ اعظم قرار پائے گا، اور وہی یعنی اسمِ اعظم ہے اور اِس سوال کا جواب مکمّل ہے۔

اصل میں واصل ہونا کُلّی طور پر دو (۲) مقام پر ہے، ایک مرنے کے بعد، ایک زندگی میں۔ جس چیز کی معرفت ہے، شناخت ہے، اُس شناخت کے اندر اصل میں واصل ہونے کا جو مضمون ہے یہ بھی آتا ہے، معرفت میں شناخت میں ہر چیز آتی ہے۔ لہٰذا یہ بہت اہم ہے کہ معرفت زندگی کے دَوران حاصل ہو، مرنے کے بعد معرفت میں اضافہ ہوسکتا ہے، لیکن معرفت کے حُصول کا اصل مقام زندگی ہے، زندگی میں معرفت حاصل ہوتی ہے اور ساتھ [ہی] ساتھ اصل میں واصل ہونے کا تجربہ بھی زندگی میں ہوتا ہے، اِس کو ہم اِس طرح سے کہیں گے کہ جزوی طور پر اصل میں واصل ہونا دُنیا میں ہے، کُلّی طور پر مرنے کے بعد ہے، تو جزوی طور پر پتا لگتا ہے کہ اصل میں واصل ہونا کس طرح سے ہے، اِس کا تجربہ دُنیا میں ہونا چاہئے۔

اسمِ اعظم کا ذکر، یعنی اسمِ اعظم کا پڑھنا، اور جبرائیل کی تنزیل کا مطلب ہے کہ حکمت کے بغیر باتیں کرنا یہ جبرائیل کا کام ہے، تفہیم کا مطلب ہے کہ میکائیل سمجھاتا ہے اور موسیقی کا مطلب ہے کہ اسرافیل صور بجاتا ہے اور عزرائیل کی تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ مومن کا سفر سب سے آسان اُس وقت ہوسکتا ہے کہ عزرائیل سے اُس کی دوستی ہو اور عزرائیل اُس کی رُوح کو (Close) کرے پیشانی میں اور اُس کے لئے وہ ایک تسبیح پڑھتا ہے، عزرائیل اپنے چنگ سے رُوح کو کھینچتا نہیں ہے کہ اُس کو سر میں اور پیشانی میں (Close) کرے، اِس کے لئے عزرائیل کے پاس ایک تسبیح ہے، اسپیشل تسبیح وہ پڑھتا ہے یعنی ایک اسمِ اعظم ہے، عزرائیل کا اپنا، جب عزرائیل وہ اسمِ اعظم پڑھتا ہے تو اُس میں اتنا اثر ہے چونکہ وہ عزرائیل ہے نا! تو اُس سے رُوح یا تو ڈرتی ہے یا اُس پر یا رُوح پر اُس کا کنٹرول ہے۔ بہرحال عزرائیل کی اِس تسبیح کے ساتھ ساتھ رُوح جو ہے بدن کو چھوڑ کے سر میں اور خاص (Particular) جگہ میں رُوح مرکوز ہوجاتی ہے، (Concentrate) ہوجاتی ہے، جس (Concentration) کے لئے ہم مرتے ہیں وہ (Concentration) ہم

نہیں کر سکتے ہیں اور جزوی طور پر کر سکتے ہیں، لیکن جب عزرائیل کا (Experience) ہوتا ہے تو اُس وقت عزرائیل کی مدد سے رُوح جو ہے (Concentrate) ہو جاتی ہے اور پیشانی میں مرکوز ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے نزدیک عزرائیل کا صرف یہ کام ہے کہ وہ بس موت آوے تو انتظار ہے اُس کا کہ موت آوے، تو رُوح کو (Pick up) کرے، یہ بات نہیں ہے، عزرائیل کا اور بھی بہت کام ہے اور کم سے کم روزانہ عزرائیل کا کام یا (Duty) جو ہے کہ مومن کو سُلائے اور اسرافیل اُس کو جگائے۔ یہ چار فرشتے لگے ہوئے ہیں خدمت کرتے ہیں اور مومن کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ اِس وقت جبرائیل، میکائیل اسرافیل اور عزرائیل اُس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور اسرافیل کا کام یہ ہے کہ مومن کو جگائے اور عزرائیل کا کام یہ ہے کہ وہ مومن کو سُلائے، یہ نیند عزرائیل سے ہے، یہ بیداری جو ہے اسرافیل سے ہے، یہ بولنا جو ہے وہ اسرافیل سے ہے۔ اِس طرح اِن فرشتوں کے درمیان کام تقسیم ہے۔

امامؑ کی فرمانبرداری سے، امامؑ کی فرمانبرداری سے کہ یعنی یہ اُس وقت جب مومن کو رُوحانی بادشاہی کا تجربہ ہوگا اور جب وہ بڑے کام میں کامیاب ہو جائے گا یہ ساری چیزیں اُس وقت سامنے آئیں گی۔ فرمانبرداری اور نافرمانی اگر کوئی اسماعیلی، اسماعیلی ہونے کے باوجود نافرمان بن جاتا ہے، تو اُس کے لئے یہ ہے اور جو کامیاب مومن ہو تو اُس کے لئے یہ بات نہیں ہے اور جہاں پیر، بزرگ شریعت کی باتیں سامنے رکھتے ہیں یہ صحیح ہے، تو اِس کے بغیر یعنی نصیحت کرنے، ڈرانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، اور یہ جو میں نے کہا اِس فرمان میں بھی یہ بات آتی ہے کہ مولا نے فرمایا کہ بہشت کے تجربہ کے لئے دُوسرے مذاہب میں مرنا شرط ہے لیکن اسماعیلی مذہب ایسا ہے کہ اُس میں جیتے جی بہشت ہے [بمبئی۔ ۲۷۔۱۔۱۹۴۶]۔ اگر مان لیا جائے کہ جیتے جی بہشت ہے اور بہت ساری چیزیں اِس میں پیچھے رہ گئیں، اگر کسی کو جیتے جی بہشت مل جاتی ہے تو پھر بہشت میں داخل ہونے کے بعد واپس لَوٹ کے وہ یعنی حشر کے میدان کے تجربات اور قبر کی چیزیں دیکھنا بہت عجیب ہے۔

جب ہم مونور یالزم کو مانتے ہیں تو اُس کے لئے باور کرنا چاہئے کہ مولا نے آپ سب کی رُوحوں کو بہت بلند درجہ دیا ہے۔ آپ کو باور کرنا ہوگا کہ آپ کی رُوحیں جو ہیں وہ فرشتے ہیں اور فرشتے جو ہیں وہ طاقتیں ہوتی ہیں مختلف کاموں کی طاقتوں کا نام فرشتے ہیں، تو آپ کی رُوح جو فرشتہ ہے اُس کا تعلّق کس کام سے ہونا چاہئے؟ اُس کام سے ہونا چاہئے جس کام سے آپ کی شخصیّت کا تعلّق ہے، آپ کے جسم کا تعلّق ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ خانۂ حکمت سے وابستہ ہیں، تو ظاہر میں جس طرح آپ علمی لشکر ہیں، تو اِس طرح باطن میں بھی آپ علمی کام سے متعلّق ہیں۔ لہٰذا میری گزارش ہے اور یہ حقیقت پر مبنی ہے کہ آپ اپنے دل کے اندر ایک خواہش کو بیدار کریں، ایک خواہش کو پیدا کریں۔ ایک دُعا کو جاری رکھیں وہ یہ کہ آپ یہ دُعا کریں اور عملاً چاہیں اور ہر مجلس میں یہ چاہیں، کہ ہم آپ سب مل کر رُوحانی طور پر، جسمانی طور پر قرآن پر کچھ کام کر سکیں، اِس کے

لئے دُعا کرنے کی ضرورت ہے اور آپ یہ تصوّر رکھیں کہ آپ کی رُوحیں جو ہیں وہ فرشتے ہیں اور فرشتوں کی شکل میں آپ ہم سب مل کے کام کریں یا یوں کہنا چاہئے کہ آپ ہمارے لئے فرشتے بن جائیں اور اِس قرآن کی حکمت یا کہ تاویل کے کام میں آپ رُوحانی طور پر بھی ہماری مدد کریں اور یہ اُس وقت ممکن ہے جب آپ دُعا کریں، عبادت کریں، گریہ وزاری کے بعد ایک دم سے اِس فرض کو یاد کریں اور مولا سے دُعا گزاریں کہ یا خداوند! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری رُوحیں آپ کی رحمت سے رُوحانی طور پر اِس علمِ رُوحانی سے وابستہ ہو جائیں، اور ہمارے اُستادِ عزیز کے کام میں ہماری رُوحیں مدد کر سکیں، ایسی نیّت کریں گے اور ایسی دُعا کریں گے تو یہ کام ہو جائے گا۔ یہ الفاظ دل میں کہنے کے لئے ہیں اور ظاہری طور پر آپ سیدھی سادھی دُعا کرنا، جس طرح کہ دُعا کرنی چاہئے اور آپ دُعا کریں گے تو یہ کام ہو جائے گا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: نجمہ بیگ نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: خانۂ حکمت امامِ عالی مقامؑ کی ایک عملی خوشخبری، سورۂ مُلک کی چند حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-6 تاریخ: ۲۲ مئی ۱۹۸۰ء کراچی

Click here for Audio

میں ایک اچھے کام کی آپ کو خوشخبری سناتا ہوں اور امامؑ کے سچّے مُریدوں کے لئے ہر وقت خوشخبری ہی خوشخبری ہے، اور خانۂ حکمت امامِ عالی مقامؑ کی ایک عملی خوشخبری ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ یہ بندۂ درویش آپ کا اُستاد کبھی مبالغے سے کام نہیں لیتا ہے، جو بھی بات کہتا ہے البتہ صحیح کہتا ہے اور خصوصاً علم کی تعریف کے سلسلے میں، کس کے علم کی تعریف کے سلسلے میں؟ امامِ برحقؑ کے علم کی تعریف و توصیف کے سلسلے میں، ہم جتنے بھی عمدہ سے عمدہ الفاظ استعمال کریں وہ کم ہیں۔ چنانچہ آپ کو یقین ہے کہ خانۂ حکمت کا جو موضوع ہے وہ کیا موضوع ہے؟ یہ آپ کو جاننا چاہئے کیونکہ آپ جس کام سے دلچسپی رکھتے ہیں اُس کام کی نوعیت کو سمجھنا یہ تو بہت ہی ضروری ہے۔ دُنیا کا کوئی کاروباری [شخص] اپنی تجارت اور اپنے کاروبار کی نوعیت کو ضرور سمجھ لیتا ہے اُس کی اہمیّت و افادیت کو ضرور سمجھ لیتا ہے اِس کے بغیر کیسے مزہ آوے، چنانچہ یہ آپ کو جاننا ہے کہ آپ کا (General Subject) کیا ہوتا ہے۔ خانۂ حکمت کے اندر جس انداز سے علم سکھایا جاتا ہے یا جس طور سے تعلیم دی جاتی ہے اُس کا قائدہ قانون کیا ہے اور اُس کے اندر کون سے ذیلی موضوعات بنتے ہیں؟ میں تو یہ کہوں گا کہ خانۂ حکمت کی جو تعلیمات ہیں اُن میں سے جو ایک بنیادی تعلیم ہے وہ قرآنی حکمت کی تعلیم ہے۔ آپ یقین کرتے ہوں گے قرآنی حکمت کی تعلیم ہے اور حکمت ہی تاویل ہے تو یہ تاویل کی تعلیم ہے، قرآن کے بھیدوں کی تعلیم ہے، اور یہی رُوحانی تعلیم بھی ہے کیونکہ رُوحانی تعلیم قرآن کے مغز سے، قرآن کی حکمت سے الگ نہیں ہوسکتی ہے۔ ہاں! صرف اگر کسی موضوع کو رُوحانی تعلیم کا ٹائٹل دینا ہے تو اُس میں ایک شرط یہ ہوگی کہ وہ تعلیم دینے والا رُوحانیت کو چُھو سکتا ہے یا اُس کا اُس کو تجربہ ہے یا نہیں یہ دیکھنا ہوگا، تو اگر اُس شخص کو رُوحانیت کا تجربہ ہے (Experience) ہے تو اِس معنی میں اُس موضوع کو اُس علم کو رُوحانی علم کہا جائے گا۔

آیئے ایک اور اچھے موضوع کی طرف کہ آیا وہ موضوع بھی ہمارے اِس موضوع میں سمویا ہوا ہے یا نہیں۔ آپ نے سنا ہے، علمِ لدُنّی! وہ علم ہے جو خدا کے حضور سے ملتا ہے جو خاص ہے، تو وہ علمِ لدُنّی رُوحانی علم سے الگ نہیں ہے اُسی کا ایک دُوسرا نام ہے، قرآنی تاویل ہو یا علمِ لدُنّی ہو اور یا حکمت ہو یا قرآن کا باطن ہو، تو ایک ہی چیز ہے۔ ابھی میں ایک

دوست کے ساتھ اِس پر گفتگو کر رہا تھا کہ آپ کے پاس ایک ایسا علم ہے یا کہنا چاہئے ایک ایسی چیز ہے کہ قرآن کے اندر خداوندِ عالم جس شان سے اپنے علم کی تعریف کرتا ہے، کبھی اپنی رحمت کی تعریف کرتا ہے، کبھی اپنی نعمتوں کی تعریف کرتا ہے، کبھی وہ فرماتا ہے کہ اُس نے مومنین پر احسان کیا، تو خدا کی طرف سے جو بھی احسانات ہیں جتنی دینی اور رُوحانی نعمتیں ہیں، تو یہ تمام چیزیں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں اور وہ کیا مرکز ہے؟ اِس مرکز کو خداشناسی کہیں یا معرفت کہیں، حقیقی علم کہیں، علمُ الیقین کہیں، کچھ بھی کہیں تو تمام (Attributes) یا کہ تمام خوبیاں جو ہیں وہ آپس میں مل جاتی ہیں۔

دُنیا کے اندر دیکھیں! مادّی طور پر جسمانی طور پر دیکھیں، دو متضاد چیزیں آپس میں بحقیقت نہیں ملتی ہیں، تو اگر ملائیں تو وہ (Compound) خراب ہو جاتا ہے، اِس کے برعکس اچھی چیزیں آپس میں مل سکتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کے اندر اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کے جو طرح طرح سے نام آئے ہیں وہ سب نام ایک ہی اُونچی چیز کے ہیں وہ معرفت ہے، اور اُسی معرفت کے بہت سے نام ہیں اور اسی معرفت کے بہت سے ذیلی اور ضمنی موضوعات بنتے ہیں، تو آپ کے سامنے وہی چیز ہے جو اُس چیز کو الگ الگ ناموں سے مختلف ناموں سے دیکھا جائے تو بہت بڑی چیز ہے۔ جس طرح اسلام کے اندر سب سے بنیادی چیز شریعت ہے جو بہت ہی وسیع ہے اور شریعت کو طریقت (Cover) کرتی ہے، گھیرے میں ڈالتی ہے، گھیر لیتی ہے یا اپنے اندر (Essence) اور جوہر کے طور پر سمو لیتی ہے اور پھر حقیقت، طریقت کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اور معرفت تینوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے، اس لئے کہ وہ حقیقت کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ دیکھا! کہ اِس کائنات کا یا دین کا کیا نظام ہے، یہی نظام ہے کہ ایک چیز میں، ایک بڑی چیز میں بہت ساری چیزیں سما جاتی ہیں۔ اسی طرح معرفت کے اندر بہت ساری چیزیں ہیں۔

اَب اِس کے بعد میں یہ کہوں گا کہ جس موضوع کے متعلّق آپ کو میں نے خوشخبری دی تھی وہ قرآن کا ایک سورہ ہے، اُس سورے کا نام سورۂ مُلک (٦٧) ہے۔ اُس سورے کی تیس آیتیں ہیں، تو اُن تیس آیتوں میں سے ہر ایک آیت پر دو دو، تین تین، ایک ایک سوالات بننے والے ہیں، میں نے یہ پروگرام بنایا ہے کہ ہم اُس سورے پر (Discuss) کریں گے۔ پہلے میں آپ کو اِس سورے پر دعوتِ فکر دوں گا، آپ اُس سورے کو صرف ترجمے کے لحاظ سے دیکھیں، اُردو ترجمہ، چاہے انگریزی ترجمہ، اور چاہے گجراتی ترجمہ، اُس کے اندر جتنے ہوسکیں سوالات پیدا کریں، میں نے سوچا ہے سوالات پیدا کرنے کے لئے لیکن آپ بھی سوچیں۔ ایک پرچے کے اندر ہم اُس کے سوالات بنائیں گے دُوسرے پرچے میں جوابات لکھیں گے، اَب یہ معلوم نہیں کتنے جوابات بنتے ہیں اور کتنا بڑا مقالہ بن جاتا ہے، اُس کے اندر بہت سے حقائق ہیں، بہت سی حقیقتیں اُس میں جمع ہیں۔ آپ کو میں ایک اور بات بتاؤں جو بہت اہم نکتہ ہے، آپ سب سے پہلے شریعت میں جا کے دیکھیں، کسی ایسی (Source Book) کو سامنے رکھیں، کہ اُس کے اندر قرآن کی مختلف سورتوں اور آیتوں کے بارے میں لکھا ہوا ہوتا ہے،

کہ فلان آیت فلان موقع پر پڑھنے کے لئے ہے اور فلان سورہ فلان موقع پر پڑھنے کے لئے ہے۔ اَب اہلِ ظاہر اِس بات کو نہیں جانتے ہیں کہ کیوں ایک سورہ یا ایک آیت [کو] حیات و ممات کی مختلف رُسومات میں پڑھنا چاہئے۔ وہ تو صرف اِس طرح سے لیتے ہیں کہ اِس کو پڑھیں اور لوگ سُنیں پڑھنے والا اچھی طرح سے پڑھے، اچھی تلاوت کے ساتھ اچھی قرأت کے ساتھ پڑھیں تو ثواب مل جائے، لیکن اُس کے اندر جو راز ہے اُس کو نہیں سمجھتے ہیں۔ میں ایک اُصول کی بات آپ کو یہ بتاؤں اُس کے اندر کوئی راز ہوتا ہے جب ہی تو اُس آیت کو یا اُس سورے کو پڑھنے کے لئے فرمایا گیا ہے، پیغمبرؐ نے فرمایا ہے یا امامؑ نے فرمایا ہے یا خداوند نے فرمایا ہے۔ اُس کے اندر کوئی معنوی طور پر، معنی کے لحاظ سے معرفت کے لحاظ سے، شناخت کے لحاظ سے، علم کے لحاظ سے کچھ بڑی باتیں ہوتی ہیں جب ہی تو اُس کو پڑھنے کے لئے کہا گیا ہے۔

کبھی ہم نے سورۂ رحمان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا، کہ سورۂ رحمان کی تلاوت و قرأت کی فضیلت کیوں بیان کی گئی ہے، اِس لئے کہ اُس کے اندر جو بھید ہیں وہ بہت عظیم ہیں۔ آپ عزیزوں میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے سورۂ رحمان کا تاویلی کورس کیا ہوگا اور کچھ نئے عزیزان بھی ہو سکتے ہیں، سورۂ رحمان پر جو کچھ کورس ہوا تھا اُس کے کیسٹ موجود ہیں۔ آپ کبھی ٹائم نکال کر اُن کو سُن لینا، تو میں کہہ رہا ہوں کہ کسی بھی سورے کی اہمیّت اِس لئے ہوتی ہے کہ اُس کے اندر کچھ بھید ہوتا ہے یا کچھ بھید ہوتے ہیں، جیسے آیت الکرسی کے بارے میں میں نے کبھی کہا تھا، آیت الکرسی کو پڑھنے کے لئے تاکید کی گئی ہے اِس لئے کہ اُس کے اندر کوئی چیز ہے اور مقصود کیا ہے؟ مقصودِ خدا یہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے لوگ سوچیں گے اور اُس بھید کی طرف شاید جا سکیں، اب یہ خدا کا ایک پروگرام ہے اُس نے برملا سب کو یہ نہیں بتانا ہے کہ اِس فلان سورے کے اندر یہ بھید ہے اور فلان آیت کے اندر یہ بھید ہے تو پھر اُس کا جو پروگرام ہے وہ درہم اور برہم ہو جائے گا۔ خدا نے صرف توجّہ دلائی ہے اور کسی اشارے سے یہ فرمانا ہے کہ دیکھو یہ آیت پڑھو، اِس میں ثواب ہے اور وہ یہ نہیں فرماتا ہے کہ ثواب کے کیا معنی ہیں اور کس بنیاد پر کسی ایک مخصوص آیت کے یا سورے کے پڑھنے میں کیوں زیادہ ثواب ہے حالانکہ قرآن سب یکسان ہے اور سب خدا کا کلام ہے، سب خدا کا کلام ہے اور قرآن کے اندر ایسی آیات بھی ہیں کہ اُس میں ابلیس کا قصّہ ہے، کہیں ایسی آیات بھی ہیں کہ اُن کے اندر کافروں کے انکار کا ذکر ہے۔ ہر چند کہ یہ بھی کلام کا حصّہ ہے، لیکن کبھی ایسا نہیں فرمایا جاتا ہے کہ یہ (Portion) جو ہے اِس کو پڑھو، رٹو، جو ابلیس سے متعلّق ہے تاکہ تم کو بہت زیادہ ثواب ملے، تو قرآن کے اندر آیات [میں] اور آیات میں فرق ہے، سورتوں میں اور سورتوں میں فرق ہے، اِس لئے مولا علیؑ نے فرمایا کہ: ولنا کرائم القرآن اور جو قرآن کی عظیم ترین آیات ہیں وہ ہماری شان میں ہیں، یہ مولا نے فرمایا یعنی قرآن کے اندر جو عظیم ترین آیات ہیں وہ امامؑ کی شان میں ہیں۔ اِس سے ایک تصوّر مل گیا، اِس سے ایک (Concept) مل گیا کہ قرآن کے اندر عظیم ترین آیات ہیں، اُن عظیم ترین آیات میں دیگر آیات جو ہیں وہ سموئی ہوئی ہیں

وہ گویا کہ روشنی کے مینار ہیں۔ جس طرح کسی مثالی شہر میں اُونچی اُونچی بُرجیاں ہوتی ہیں تو کسی کو دن کے وقت یا رات کی روشنی کے وقت یا چاندنی کے دوران شہر کا نظارہ دیکھنا ہے تو چاہئے کہ اُن اُونچی اُونچی بُرجیوں پر چڑھے اور دیکھے، تو قرآن کے اندر (Towers) ہیں اور کوئی اُن (Towers) پر چڑھتا ہے تو قرآن کے اندر جھانک سکتا ہے، دیکھ سکتا ہے اور پھر اُس کے لئے گویا کہ اُس نے قرآن کو اُن ''کرائم'' یعنی عربی میں ''کریم'' معزز کو کہا جاتا ہے، بڑے کو کہا جاتا ہے اور اسی کی جمع ہے ''کرائم القرآن'' یہ ایک خاص اصطلاح ہے۔ [یعنی] ''قرآن کی عظیم ترین آیتیں'' تو قرآن کی عظیم ترین آیتوں کو جو جانتا ہے وہ بہت سارے بھیدوں کو (Cover) کرسکتا ہے۔

بہر حال مختلف اہمیّت والی آیتوں کی بات تھی اور اہم سورتوں کی بات تھی، تو سورۂ مُلک اِن ہی میں سے ہے اور شریعت کے طور پر سورۂ مُلک حیات وممات کی بہت سی رُسومات میں پڑھی جاتی ہے۔ اچھا! تو سورۂ مُلک پر آپ نے غور وفکر کرنی ہے اور اُس میں سے مختلف سوالات پیدا کرنے ہیں۔ کتنی اچھی بات ہے کہ آپ کا اُستاد یہ تاکید کرتا ہے کہ قرآن سے سوالات کریں، کسی دُوسرے مکتب میں جا کر دیکھیں گے تو اِس کی مثال نہیں ملے گی، کہ (Students) کو کھُلی اجازت ہو کہ وہ قرآن پر سوالات کریں، حالانکہ قرآنِ مقدّس سوالات سے پہلے ہی مشکل ہے۔ آپ کو تعجّب ہوگا جو میں نے قرآن کے متعلّق لفظِ مشکل کو استعمال کیا اور ہاں! یہ ایک اصطلاح ہے، بہت سے اسکالر اِس کو اِس طرح سے مانتے ہیں، مشکلاتِ قرآن یعنی (Difficulties of the Holy Quran)، اُس میں بہت سی مشکلات ہیں، تو یہ حروفِ مقطعات مشکلات نہیں تو کیا ہیں، ا۔ل۔م ایسے حروف اور آیاتِ متشابہات مشکلات نہیں تو اور کیا ہیں اور اسلام کے اندر جتنے فرقے ہیں سب ہی تو قرآن کو تسلیم کرتے ہیں، اِس کے باوجود وہ آپس میں جو اختلافات کرتے ہیں قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں، تو یہ اختلافات مشکلات نہیں تو اور کیا ہیں۔ اچھا! یہ امامؑ ہی کی رحمت ہے کسی کی مہربانی نہیں اور ہمارے مذہب کے اندر وہی مہربانی کرنے والا ہے اور اُس کے سوا کوئی نہیں ہے، ہم سب اُس کے غلام ہیں، چاکر اور خادم ہیں اور خود کچھ بھی نہیں ہیں، تو سورۂ مُلک پر سوالات کرنے ہیں۔ اُس کی سب سے پہلی جو آیت ہے اُس میں سے میں مثال پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ارشاد ہے کہ: تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ (۶۷:۱) یہ (First) آیت ہے، بڑی برکت والا ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ظاہراً آیت اتنی سی ہے لیکن اِس کے اندر جو سوالات ہیں وہ بڑے عظیم ہیں اور بہت عجیب ہیں، وہ اِس لئے کہ سب سے پہلے ہمیں برکت کے بارے میں سوچنا ہوگا، سوال کرنا ہوگا کہ برکت کون سا لفظ ہے اور برکت کے کیا معنی ہیں؟ کیا اِس برکت کے معنی کو سمجھنے کے لئے کوئی لُغت کافی ہے یا ہم قرآن سے اِس سلسلے میں کچھ سہارا لے سکتے ہیں یا کس طرح ہم برکت کے معنی کو سمجھ لیں گے۔ اِس لئے کہ لفظِ برکت اسماعیلی مذہب میں بہت اہمیّت رکھتا ہے کیونکہ یہ لفظ فرمانِ مقدّس میں بار بار آتا ہے اور امامِ برحقؑ کے ارشادات میں جگہ جگہ یہ لفظ

استعمال ہوا ہے، مولا نے فرمایا ہے کہ اِس کام میں برکت ہے یا ایسے کرنے میں برکت ہے اور برکت ایک دن میں نہیں آسکتی ہے وغیرہ وغیرہ، تو ہمیں اِس لفظِ برکت کو یہاں فلسفے کے طور پر حکمت کے طور پر سمجھنے سے فرمان کے اندر بھی ہمیں گہرائی تک جانے میں مدد ملے گی، تو برکت کا اصل مطلب آپ کو لُغات میں خاطر خواہ نہیں ملے گا، قرآن کے سہارے سے ہم اِس کو حل کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک آیت کے اندر خداوندِ عالم نے برکت کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اُس کا مفہوم یہ ہے، خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ اُس نے پہاڑ کو پیدا کیا اور کتنے ہزار برس تک اُس پہاڑ کے اندر برکتیں پیدا کیں (۴۱:۱۰)۔

اَب ہم سمجھ گئے کہ برکت کی مثال کیا ہے اور ہم تشریح کریں گے کہ پہاڑ کے اندر کتنی قسم کی برکتیں ہیں، اور کس طرح سے ہیں وغیرہ، تو ہم اِس کی وضاحت اِس طرح سے کریں گے کہ پہاڑ کے اندر جو برکتیں ہیں وہ تین (Categories) میں ہیں، وہ تین (Categories) میں ہیں، معدنیات جو جمادات ہیں، بے جان چیزیں ہیں، (Minerals) وغیرہ جو لاتعداد ہیں کسی بھی دُنیا کے پہاڑ کے اندر کتنی معدنیات ہیں اُن کو آپ شمار نہیں کر سکتے ہیں، جواہرات ہیں اور مختلف قسم کے (Precious Stones) ہیں، (Semi Precious Stones) ہیں اور دیگر عام معدنیات ہیں، دھات ہیں، لوہا ہے، چاندی ہے اور دیگر معدنیات ہیں جو دوائیوں میں استعمال ہوتی ہیں نمک ہے، جو کھار ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہت ساری چیزیں ہیں اور اِس کے اُوپر کی جو (Category) ہے اُس میں نباتات ہیں، جس میں طرح طرح کی جڑی بوٹیاں ہیں، جن سے دوائیاں بنتی ہیں اور پھر گھاس پات ہیں، درخت ہیں اور باغ میں پھول ہیں اور جنگلی یا اصلی قسم کے پھل ہیں وغیرہ وغیرہ اور اُس میں آبادی ہو تو اور بہت ساری چیزیں [مثلاً] فصل ہیں، پھر میوے ہیں تو برکت کی دُوسری (Category) حروف میں۔ اِس کے اُوپر جانور ہیں، تو حلال جانور ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے اور اُن سے طرح طرح کے فائدے حاصل ہوتے ہیں پھر حرام جانور ہیں وہ بھی فضول نہیں ہیں، خدا نے اِس کائنات کے اندر کوئی شئ فضول پیدا نہیں کی، ہم دیکھتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شئ فضول ہے، یہ ہماری عقل کی نارسائی ہے، تو ہزار برس پہلے لوگوں نے جن جن چیزوں کو فضول قرار دیا تھا اَب اُن میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اَب فضول نہیں ہیں اور جس قدر انسان کی عقل، سائنس آگے بڑھتی چلی جائے گی اُس قدر لوگ اِن چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے جائیں گے اور کائنات کے بھیدوں کو جس قدر زیادہ سے زیادہ سمجھ لیا جائے گا اُس قدر اِس کائنات کے اجزاء سے اور اِس دُنیا کی چیزوں سے فائدہ اُٹھایا جائے گا۔

اسی طرح نہ تو کوئی جڑی بوٹی فضول ہے اور نہ کوئی جانور فضول ہے، تمام جانور خواہ حلال ہیں یا حرام ہیں وہ حکمت سے خالی نہیں ہیں اور اُن میں ایک کام یہ بھی ہے کہ بعض جانور بعض جانوروں کی غذا بن جاتی ہیں۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے اور یا یہ ہے کہ بعض جانور جو ہیں وہ اُن جراثیم کو لیتے ہیں جن سے بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ، تو میں کس بات کی وضاحت کرتا ہوں میں برکت، لفظِ برکت کی وضاحت کرتا ہوں تو دیکھا آپ نے خدا نے صرف ایک بات کہی تھی کہ اُس نے

پہاڑ بنائے اور اُن میں برکت پیدا کی، تو اِس برکت کے سلسلے میں ایک اہم چیز یہ رہ گئی تھی کہ اُس میں سے چشمے، پانی ہیں جو معدنیات اور جمادات کی (Category) میں آتا ہے، پانی اور برف، بارش اور اِس طرح کی ساری چیزیں، تو برکت یہ ہے، وہ بہت وسیع لفظ ہے۔ لہٰذا تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (۶۷:۱)۔ بڑی برکت والا ہے، جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، دیکھا آپ نے! اَب قرآن کے متعلّق فرمایا گیا ہے کہ كِتَابٌ مُبَارَكٌ (۳۸:۲۹، ۶:۱۵۵)۔ ایک مبارک کتاب، ایسی کتاب جس میں برکت ہے۔ اَب یہاں اِس برکت کے اندر کیا ہوگا، اِس میں ہدایت کے معنی ہوں گے، حکمت کے معنی ہوں گے، معرفت کے معنی ہوں گے، بھید ہوں گے، تو اِس لفظِ برکت کو سامنے رکھا جائے، تو قرآن کی ہر آیت کے اندر بہت زیادہ معنی، بہت زیادہ حکمت اور بہت زیادہ معنوی وسعت کی طرف یہ ایک اشارہ ہے، تو جو سمجھنے والا ہے قرآن کے اندر بہت معنی ملیں گے، کیونکہ خدا نے اِس کو کہا کہ اِس میں بہت برکت ہے اور برکت بہت ساری چیزوں کی طرف ایک اشارہ ہے، بہت ساری چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ برکت کسی ایک خاص چیز کا نام نہیں ہے، اگر برکت کسی ایک خاص چیز کا نام ہوتا تو یہ (Limited) بات ہوتی، یہ لفظ محدود ہوتا، محدود بن جاتا یعنی برکت فراوانی کا نام ہے، کثرت کا نام ہے اور چیزوں کے، کسی بھی چیز کے یا چیزوں کے بہت زیادہ ہونے کا نام برکت ہے، یہ لفظِ برکت اِس قسم کا ہے، تو خدا نے جو فرمایا کہ: تَبَارَكَ الَّذِيْ (۶۷:۱)، بڑی بابرکت ہے، بڑی برکت والا ہے یعنی خدا کی برکتیں تو بہت ہی اُونچی ہیں۔

اَب خدا کے متعلّق جو لفظِ برکت کو استعمال کیا گیا تو اِس کے معنی اور زیادہ وسیع ہو گئے، جب ہم نے لفظِ برکت کو پہاڑ کے لئے استعمال کیا، تو پہاڑ کی حیثیت کے مطابق اور پہاڑ کی (Position) کے مطابق، پہاڑ کی حالت کے مطابق برکت کے بہت وسیع معنی بن گئے تھے۔ جب ہم اِس لفظِ برکت کو خدا کے سامنے لائیں گے تو یہ اتنا بڑا ہو جائے گا کہ [یہ] اِس کی آخری حد ہوگی اور یہ لفظِ برکت اِس مقام سے دُوسرے مقام پر منتقل کیا جائے تو بہت زیادہ بڑا نہیں ہو سکتا ہے یعنی یہ اِس کی آخری حد ہے یعنی لفظِ برکت [کی] جو گنجائش ہے جو ہونا چاہیئے وہ یہاں ہوگا۔ کیوں؟ اِس لئے کہ یہاں برکت کے معنی خدا کے (Attributes) کے ہوں گے [یعنی] خدا کی صفات۔ اِس لفظِ برکت میں خدا کے سو (۱۰۰) نام آئیں گے، اِس لفظِ برکت میں خدا کی بادشاہی بھی آئے گی، اِس لفظِ برکت میں خدا جو کچھ دیتا ہے جو کچھ اُس کی رحمت ہے، جو کچھ اُس کا علم ہے سب اِس میں آ گیا۔ دیکھا! قرآن کی عادت کو کہ کس طرح معنی بدلتے ہیں اور فلسفے کی حکمت کی کیا شان ہے اور امامؑ کی مہربانیوں کی کیا شان ہے اور اسماعیلی مذہب کی کیا تعریف ہے۔ اچھا! تو میں نے لفظِ برکت کی تھوڑی سی تشریح کی۔

اَب دُوسرا سوال اسی آیت کے اندر ہے کہ خدا جو فرماتا ہے کہ: بِيَدِهِ الْمُلْكُ (۶۷:۱)۔ کیا خدا کا شریعت کے مقام پر جا کر سوال کریں کہ خدا کا کوئی ہاتھ ہے؟ خدا کے ہاتھ سے اختیار مُراد ہے، خدا کے ہاتھ سے اختیار مُراد ہے جو اُس نے فرمایا کہ بڑی برکت والا ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ اَب یہاں ایک ساتھ دو (۲) سوال پیدا ہوئے، بادشاہی

سے کیا مُراد ہے؟ کیا دُنیا کی بادشاہی یا رُوحانی بادشاہی یا خدا کی اپنی بادشاہی کون سی بادشاہی ہے؟ یا اِس بادشاہی میں ساری بادشاہتیں آجاتی ہیں، اِس میں کوئی چھوٹی بادشاہی ہے یا سب بڑی بادشاہی کی بات ہے یا اِس لفظِ بادشاہی میں ساری بادشاہیاں یا بادشاہتیں (Include) ہیں، کیا بات ہے؟ یہ سوال ہے۔ دُوسرا سوال، خدا کے ہاتھ سے کیا مُراد ہے؟ خدا کا کوئی ہاتھ ہے جس طرح انسان کا ہاتھ ہے یا اِس سے خدا کا اختیار مُراد ہے یا یہ کہ خدا کا ہاتھ پیغمبر ہیں یا امامؑ ہیں، میں شریعت کی سطح پر بات کرتا ہوں، لہٰذا شریعت کی سطح پر خدا کا کوئی ہاتھ نہیں ہے، جبکہ قرآن نے آنحضرتؐ کو خدا کا ہاتھ قرار دیا، آیۂ بیعت کے مطابق رسولؐ اپنے وقت میں خدا کے ہاتھ تھے اور رسولؐ کے بعد امامِ برحق خدا کے ہاتھ ہیں (۴۸:۱۰)۔ کتنی شاندار آیت ہے اور کس قدر اہم پوئنٹ پر آگئے ہم، خدا فرماتا ہے کہ بڑی برکت والا ہے خدا جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ پیغمبرؐ خدا کے ہاتھ ہیں تو خدا کی بادشاہی پیغمبر کے اختیار میں آگئی یا کہ پیغمبر کے سپرد ہوگئی، پیغمبر کی تحویل میں آگئی۔ اگر مان لیا جائے کہ علیؑ یعنی امام خدا کا ہاتھ ہے جو یہ بات مشہور بھی ہے، تو اُس وقت ساری بادشاہی امام کے ہاتھ میں آگئی گویا خدا نے یہ سارا اختیار دے دیا، چونکہ ہم شریعت کے (Level) پر بات کرتے ہیں۔

اَب میں دوبارہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے، کہ اِس بادشاہی سے دُنیا کی بادشاہی مُراد ہے، دُنیا کی بادشاہی کی کوئی بات نہیں ہے، خدا یہ کیسے کہہ سکتا ہے، کس طرح احسان جتلا سکتا ہے دُنیا کی بادشاہی کی بات کرتے کرتے اور اپنی تعریف [کرتے ہوئے] یہ کہ خدا بڑی برکت والا ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ اَب یہاں جو برکت کی بات ہو رہی ہے وہ بادشاہی سے متعلّق ہے اور اگر ہم اِس کو تعریف سمجھیں تو یہ تعریف بھی اِس لئے ہے کہ خدا کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، تو بادشاہی کی وجہ سے جو خدا کی تعریف ہوتی ہے، تو یہ بادشاہی خدا کی کوئی چھوٹی چیز نہیں ہوسکتی ہے۔ خدا کی سب سے بڑی اور سب سے اُونچی بادشاہی کی بات ہے، خدا کی اپنی بادشاہی کی بات ہے، اچھا پھر یہ تو یہاں پر ہم اِس لفظ کو ذرا (Change) کرتے ہیں، اِس کے (Equivalent) میں اِس کے ایک مترادف میں۔ میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کی خدائی اور خدا کی بادشاہی اِس میں کیا فرق ہے؟ خدا کی بادشاہی بھی تو دُنیا کی بادشاہی کی طرح نہیں ہے [وہ] خدا کے اوصاف کے مطابق ہے، یعنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں اور میرا یہ کہنا صحیح ہے کہ خدا کی بادشاہی اور خدا کی خدائی ایک ہی بات ہے۔ آپ خدا کی خداوندی کہیں، خدا کی خدائی کہیں، خدا کی بادشاہی کہیں، خدا کے اوصاف کہیں کیونکہ ایک ہی معنی کے لئے کئی الفاظ ہوتے ہیں، تو خدا کی بادشاہی اور خدا کی خدائی، تو اِس (Sense) میں اگر مان لیا جائے کہ خدا کی خداوندی اور خدا کی بادشاہی (Same) ہیں، تو پھر اِس کے ساتھ ساتھ امامؑ کو خدا کا ہاتھ مان لیا جائے تو پھر چونکہ خدا کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، تو خدا کی خدائی یا خدا کی بادشاہی امامؑ کے ہاتھ میں آگئی، ایسا ہی ہے، تو دیکھا آپ نے اور آیت کے آخری (Portion) میں بتایا کہ: وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۷:۱)۔ کسی کو اِس میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے،

خدا ایسا کرسکتا ہے کہ اُس کا ایک ہاتھ ہو اور اُس ہاتھ میں سب کچھ لے لے، اور دُوسری طرف سے ہاتھ میں کسی چیز کے ہونے کا یہ اشارہ ہے کہ اُس میں دینے کے معنی ہوتے ہیں، دُوسروں کو دینے کے معنی ہوتے ہیں۔ جس طرح آپ اپنے کسی رشتہ دار سے، دوست سے کہتے ہیں جب کہ وہ کسی چیز کو طلب کرتا ہے، کہتے ہیں کہ وہ چیز میرے ہاتھ میں نہیں ہے، آپ کسی ادارے میں ہیں تو کوئی سفارش چاہتا ہے [آپ کہتے ہیں کہ] یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، میرے ہاتھ میں نہیں ہے، نہیں تو میں دے دیتا، تو کسی چیز کے ہاتھ میں ہونے کا اشارہ دینے کے ہوتے ہیں، دینے کے، اور جو آیت کے آخر میں وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۷:۱) اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اِس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا ہے اور یہ بات نہیں ہوسکتی ہے، یہ سوال نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے، کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اِس قسم کے سوالات اور جواب، اور اِس کے ساتھ میں یہ چاہوں گا کہ آپ اپنے اندر ایک طرح سے دُعا بھی کریں کہ یہ کام (Complete) ہوجائے اور یہ بہت بڑی چیز ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ایک ایسی مہارت پیدا کریں اور اِس طرح سے علم میں کامل ہوجائیں کہ آپ کو بھروسہ آنے لگے، آپ اپنے آپ پر اعتماد کرنے لگیں، سوچنے لگیں کہ دیکھو ہمارے پاس ایک امانت چیز آگئی ہے، یہ قوم کی امانت ہے یہ امامؑ کی چیز ہے، امام کسی کو کوئی چیز دیتا ہے خصوصاً علم تو یہ ذاتی، صرف ذات تک محدود نہیں ہوتی ہے یہ چیز، یہ دینے کے لئے ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ یہ (Feel) کریں گے کہ آپ کے پاس علم ہے جماعت کو اور مولا کی عزیز جماعت کو دینا چاہئے اور اِس اعتماد کو پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے، مطالعے کی ضرورت ہے۔ آپ نے یہ جو گروپ قائم کیا ہے جس طرح آپ یہاں پڑھتے ہیں اور بہت ہی اچھی بات ہے شاندار بات ہے اور چونکہ یہی ایک پیاس ہے قوم میں، جماعت میں اور یہی ایک بھوک ہے، اور اِس کے سوا کوئی چیز نہیں اور آپ جب محسوس کرتے ہیں کہ ایک خصوصی عنایت ہے آپ کو کہ آپ کے پاس ایسی باتیں ہیں کہ اُن کو قوم تک پہنچانا چاہئے، تو پہنچانا چاہئے، بہت ضروری ہے۔ کوئی ایک پوئنٹ ہوتا ہے، بہت ہی گرانقدر ہوتا ہے اور بہت ہی اُونچی بات ہوتی ہے اِس کے لئے سمجھنے کی ضرورت ہے، یہ معمولی باتیں نہیں ہیں اِس کو اسرارِ قرآن کہتے ہیں، قرآن کے بھید ہیں، قرآن کے (Secrets) ہیں۔

خداوندِ عالم نے یہ فرمایا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں ہیں کلیدیں، کنجیاں، آسمان کی کنجیاں اور زمین کی کنجیاں، کنجی کا مطلب کلید، چابی، (Key)، (۳۹:۶۳، ۴۲:۱۲)۔ ہم نے ظاہری نگاہ سے کہیں نہیں دیکھا کہ کوئی ایسا گھر ہو یا کوئی ایسا بینک ہو، کوئی ایسا خزانہ ہو کہ جس پر خدا کی طرف سے تالا لگا ہو اور لوگ سمجھیں، ہم سمجھیں کہ اِس کی کلید خدا کے حضور میں ہے، ایسی کوئی چیز ظاہر میں نہیں ہے، اگر ظاہر میں ایسی مادّی طور پر کوئی چیز نہیں ہے تو خدا کیوں فرماتا ہے کہ آسمان اور زمین کی کلیدیں اُس کے پاس ہیں اور کلید کا سوال اُس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی ایسا گھر ہو، کوئی خزانہ ہو، کوئی بینک ہو، کوئی کم سے کم

کوئی (Box) ہو، تب تالا ہوتا ہے، تب (Key) ہوتی ہے، تو جاننا چاہئے کہ یہ علم کی باتیں ہیں حکمت کی باتیں ہیں، تو خدا کے اگر کچھ خزانے ہیں تو وہ قرآن میں ہو سکتے ہیں، درختوں میں تو نہیں ہیں، پتّھروں میں تو نہیں ہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ درختوں میں بھی ہوں، پتّھروں میں بھی ہوں، کوئی اگر پتّھر کے بھید کو پڑھتا ہے تو وہ بھی ایک خزانہ ہے، درخت کے بھیدوں کو پڑھتا ہے تو وہ بھی ایک خزانہ ہے، لیکن بطریقِ خاص (Specially) خدا کے جو خزانے ہیں وہ قرآن میں ہیں، اُس کے اندر کلیدیں ہیں، کتنی قیمتی ہوگی وہ چیز جس پر خدا نے تالا لگایا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (۴۷: ۲۴)۔ قرآن کے نہ سمجھنے کی دو (۲) وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ لوگوں نے غور نہیں کیا، ایک یہ کہ اُن کے دلوں پر قرآن کے تالے لگے ہوئے ہیں، تو کس نے قرآن کے تالے لوگوں کے دلوں پر [لگائے]، عجیب بات ہے خود قرآن پر نہیں لوگوں کے دلوں پر۔ قرآن کے اندر گرانقدر چیزیں، بہت ہی قیمتی جواہرات اور بہت ہی عالی قدر چیزیں نہیں ہوتیں تو خدا اُن لوگوں کے دلوں پر تالے نہیں لگاتا، اور اسی کے ساتھ میں اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں کیونکہ آج ہم نہ صرف آپ سے ملنے کے لئے اور آپ کے گروپ کو دیکھنے کے لئے آئے ہیں، اور تاکید ہے کہ آپ (Please) زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں اور میں آپ کو حوصلہ دیتا ہوں کہ آپ نے یہ جو گروپ قائم کیا ہے بہت اچھا کام ہے، اچھی بات ہے۔ اِس میں بہت فائدہ ہے، اِس سے فائدہ ملے گا لیکن خانۂ حکمت کے ساتھ آپ رابطہ رکھیں (Please) وہ ہی آپ کا مرکز ہے اور اُس میں جو کلاس ہوتی ہے اُس کو قائم رکھنا اور یہاں علم کی باتیں سنیں، کیسٹ سنیں وغیرہ، اسی کے ساتھ شکرگزاری کے ساتھ اور خوشی کے ساتھ میں اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔

شکریہ، یا علی مدد۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ زلزال (۹۹) اور سورۂ عادیات (۱۰۰) کی تاویل

کیسٹ نمبر: Q-07 تاریخ: ۱۔ نومبر ۔ ۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

آپ کو سورۂ جمعہ کے بارے میں، سورۂ جمعہ کے پہلے رُکوع کے سلسلے میں کچھ حقائق بیان کئے گئے تھے ۔ آج سورۂ زلزال کے بارے میں کچھ باتیں بتلائی جاتی ہیں، یہ سورۂ زلزال ۹۹ نمبر کا سورہ ہے اور اِس سورے کو بیان کرنے سے پہلے مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ تاویل کا کوئی خاکہ بتاؤں آپ کو تاکہ اُس کی روشنی میں ہم اِس سورے کی تاویل بیان کر سکیں، درمیان میں آپ قرآن کو دیکھیں یا نہ دیکھیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، تو سب سے پہلے تاویل کے سلسلے میں یہ سمجھنا ہے کہ تاویل کا ایک جامع اُصول ہُوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ رُوحانیت کے کچھ ایسے معجزات ہوتے ہیں جو کہ بہت ہی پُرحکمت ہیں اُن معجزات میں یہ گنجائش ہے کہ وہ پیغمبرِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے رُوحانی واقعات کو (Cover) کریں یا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ رُوحانی معجزات کچھ ایسے ہیں کہ اُن کے اندر وہی باتیں ہیں جو آنحضرتؐ پر گزری تھیں، نزولِ وحی کے سلسلے میں جو باتیں حضورؐ پر گزری تھیں وہی باتیں اُن رُوحانی واقعات میں موجود ہیں ۔ اب اگر ایک اسماعیلی رُوحانی ریاضت کے سلسلے میں اُن واقعات کو پاتا ہے اُن تک رَسا ہوجاتا ہے تو بے شک وہ قرآن کی تاویل کو بیان کرسکتا ہے، اُن ہی واقعات کی روشنی میں، اور چونکہ تاویل دو (۲) قسم کی ہوا کرتی ہے، ایک کو کتابی تاویل کہنی چاہیئے اور دُوسری تاویل عملی ہے ۔ کتابی تاویل سے وہ تاویل مُراد ہے جو ظاہری طور پر کتابی شکل میں ہم تک پہنچی ہیں اور عملی تاویل وہ ہے جو ایک حقیقی مومن ذاتی طور پر اور رُوحانی مشاہدات کی صورت میں حاصل کرتا ہے، اِس سے معلوم ہوا کہ تاویل کا اعلٰی مقام رُوحانی تجربہ ہے ۔ چنانچہ، اِس وضاحت کے بعد میں سورۂ زلزال کی تاویل سمجھانے کے لئے ایک خاکہ پیش کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جب مومن رُوحانیت کی منزلوں سے گزرتا چلا جاتا ہے تو اُس پر تاویل کے، رُوحانیت کے یا کہ انبیاء و اولیاء کے واقعات گزرتے ہیں ۔ اسی اثنا میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں پر مومن کو رُوحانی طور پر ہلایا جاتا ہے اور بہت کچھ ہلایا جاتا ہے، اُس ہلانے کو قرآن کی زبان میں زلزال یعنی بھونچال کہا جاتا ہے ۔ اِس ہلانے میں بڑی حکمت ہے یہ شاید اُس کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے ہے یا یہ کہ اُس کو گناہوں سے پاک کردینے کے لئے ہے یا یہ کہ اُس پر ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ رُوحانیت میں کیسے کیسے معجزات ہیں ۔

بہرحال قرآن کے اندر چند مقامات پر اِس زلزلے کا ذکر آیا ہے اور ایک مقام پر اِرشاد ہوا ہے کہ: اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَأۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَأۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ (۲:۲۱۴)۔ کیا اے مومنین! تم یہ گمان کرتے ہو کہ بلا تکلّف جنّت میں داخل ہو جاؤ حالانکہ وہ مشقتیں، وہ احوال ابھی تم پر نہیں گزرے ہیں جو تم سے پہلے والوں پر گزرے تھے کہ اُن پر مشقتیں آئیں اور انہوں نے تکالیف اُٹھائیں اور اُن کو سختی کے ساتھ ہلایا گیا، یہاں تک کہ پیغمبر نے اور اُس کے ساتھ جو مومنین تھے انہوں نے پُکار اکہا کہ خدا کی تائید و نصرت کب آتی ہے، انہیں بتایا گیا کہ اب قریب ہے اِس ہلانے کے بعد کہ خدا کی یاری و نصرت آوے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ رُوحانیت کی جو جنّت ہے اُس کے دروازے سے داخل ہونے سے قبل مومنین کو رُوحانی طور پر سختی سے ہلایا جاتا ہے۔ خدا کرے کہ آپ رُوحانی طور پر ترقّی کریں اور بڑے کام میں، عبادت میں، ذکر میں آگے بڑھیں اور ایک دن وہ آئے جس میں کہ یہ سرگزشت آپ پر گزرے، اور یہ معجزات دیکھنے میں آئیں کہ آپ کو ہلایا جائے، تو پھر اُس کے بعد بڑی خوشخبری ہے، کہ یہ رُوحانیت کی جنّت میں داخل ہونے کے قریب کی علامت ہے اور اسی نسبت سے رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو بخار ہے وہ بہت ہی متبرّک چیز ہے [اِنَّ اَلْحُمَّى طَهُوْرٌ مِنْ رَبٍّ غَفُوْرٍ، دعائم الاسلام، جلد اوّل: کتاب الجنائز] کیونکہ بخار کی نسبت اِس رُوحانی چیز سے ہے کہ یہ اُس کا ایک نمونہ ہے اور اُس کی ایک مثال ہے۔ اب اتنا کچھ کہنے کے بعد میں اِس سورے کی طرف رُجوع کرتا ہوں اور اُمید ہے کہ اِس بیان کی روشنی میں اب آپ آسانی سے سورے کے مطلب کو اور اُس کی حکمت کو یا کہ تاویل کو سمجھ پائیں گے۔ ہم سورے کو اِس طرح سے پڑھیں گے کہ پہلے اِس کا ظاہری ترجمہ کریں گے جس طرح کہ عوام کرتے ہیں اور اُس کے بعد اِس کی تاویل بیان کریں گے۔

سورۂ زلزال:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا (۱)۔ جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جاوے گی۔ وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا (۲) اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔ وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا (۳) اور انسان اُس حالت کو دیکھ کر کہے گا کہ اِس زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا (۴) اُس روز اپنی سب خبریں بیان کرنے لگے گی یعنی زمین۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا (۵) یہ اِس وجہ سے کہ آپ کے ربّ کا اُس کو یہی حکم ہو گا، وحی ہو گی۔ يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا، اُس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر واپس ہوں گے۔ لِّيُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ (۶) تا کہ اپنے اعمال کو دیکھ لیں۔ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ (۷) سو جو شخص دُنیا میں ذرّہ بھر نیکی کرے وہ اُس کو دیکھ لے گا۔ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (۸) اور جو شخص ذرّہ برابر بدی کرے گا وہ اُس کو دیکھ لے گا، یہ اِس سورۃ کا ظاہری

ترجمہ ہے۔اب ہم اس کی تاویل بیان کرتے ہیں۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱)۔جب مومن کی زمینِ رُوحانیت ہل جائے گی، جب مومن کی شخصیّت، اُس کی ہستی ہلائی جائے گی، ہل جائے گی۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲) اور اُس شخصیّت کے اندر جو لاعلمی، جہالت، غفلت اور گناہ کا بوجھ ہے وہ باہر نکال پھینکے گی، یعنی انسان کے اندر غفلت اور جہالت کا بھاری پن ہے، گرانی ہے، ثقل ہے، بوجھ ہے، اور یہ اُس وقت تک ہے جب تک کہ یہ زلزلہ نہیں آتا اور یہ زلزلہ اِس لئے ہے کہ مومن کو گناہوں کے بوجھ سے ہلکا کر دے، اُس کے اندر جو موت جیسی کیفیّت ہے، جو نیند جیسی حالت ہے اُس کو دُور کر دی جائے، تو اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی دُرست ہے ورنہ بھونچال کے آنے سے زمین سے کوئی چیز خارج نہیں ہوتی ہے اور اگر زمین سے کوئی چیز خارج ہوتی ہے تو پھر وہ زمین کی سطح پر رہتی ہے۔مثلاً فرض کریں کہ زلزلے کی وجہ سے کوئی آتش فشاں پھٹ جاتا ہے یا زمین کا کوئی لاوا خارج ہو جاتا ہے تو پھر وہ خارج ہو کر کہاں جاتا ہے؟ وہ چیز کچھ آسمان پر تو نہیں چلی جاتی پھر وہ بوجھ زمین کے اُوپر پڑتا ہے۔پتّھر ہے یا اور کوئی مادّہ ہے کچھ بھی ہے لطیف ہے یا کثیف ہے تو زمین کسی طرح سے بھی ہلکی نہیں ہو سکتی ہے، زمین کا کوئی بوجھ کہیں نہیں اُٹھایا جاتا۔اِس سے معلوم ہوا کہ یہ زمینِ رُوحانیّت کی بات ہے مومن کی شخصیّت کی بات ہے۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا (۳) مومن جس پر رُوحانیّت کے معجزات گزر رہے ہیں اُس کو تعجّب ہوگا اور کہے گا کہ کیا ہوا ہے کیونکہ اُس پر جو واقعات گزریں گے وہ بڑے عجیب وغریب ہوں گے، وہ واقعات ایسے ہوں گے کہ کبھی اُس نے دیکھے نہیں تھے۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (۴) اُس دن یہ زمینِ رُوحانیّت اپنی حالتوں سے باخبر ہوگی اُس پر اُس کے باطنی احوال کا علم ہوگا، باطنی احوال کا کشف ہوگا۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۵) اِس کی وجہ یہ ہوگی کہ مومن کی شخصیّت پر اللہ تعالیٰ کی وحی ہوگی، یہی دُرست ہے جو ہم مانیں کہ اللہ کی وحی مومن کو ہوگی اور یہ بات صحیح نہیں ہے جو ہم مانیں کہ اللہ جمادات کو، زمین کو، مٹّی کو، پتّھر کو وحی کرے گا، تو وحی کی مناسبت سے بھی یہی تاویل اور یہی حقیقت صحیح ہے، یہ واقعہ مومن پر گزرے گا نہ کہ زمین پر اور یہ بھونچال رُوحانی قسم کا ہوگا نہ کہ مادّی قسم کا۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (۶)۔یہاں پر ایک خاص نکتہ بیان کرنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ ہمارے عزیزوں میں سے بعض اِس حقیقت کو جانتے ہیں جو ہم نے اُن کو بار بار بتادی ہے کہ جب کسی مومن پر رُوحانی قسم کی قیامت گزرتی ہے تو اُس وقت ذرّات کی شکل میں دُنیا بھر کے لوگ اُس کے پاس آتے ہیں۔وہ دُنیا بھر کے

لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے قیامت کا تجربہ کرتا ہے، وہ وہی واقعات اور حالات دیکھتا ہے جن کا قرآن میں ذکر ہے یعنی قیامت سے متعلّق جو کچھ قرآن میں کہا گیا ہے وہ اُس کا مشاہدہ کرتا ہے وہ دیکھتا ہے، اِس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ اُس روز لوگ اپنے اعمال کو دیکھنے کے لئے بھاگتے ہوں گے، اُس مقام پر جمع ہوں گے جہاں پر کہ قیامت گزرتی ہے، ذرّات کی شکل میں دُنیا بھر کے لوگوں میں سے ایک ایک ذرّہ رُوح کا، ایک ایک ذرّہ اُس مقام پر نمائندگی کرے گا اور دُنیا والوں کو سب کو پتا نہیں چلے گا لیکن اُن کی رُوح کے ایک ذرّے کو اُس مقام پر حاضر ہونا پڑے گا اور دُوسرا نکتہ میں یہاں یہ بتاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں جو کچھ فرماتا ہے وہ دو (۲) طرح سے ہے، کچھ باتیں ایسی ہیں جو کہ لوگوں کے سامنے ہیں، کچھ باتیں ایسی ہیں کہ اُن سے لوگ بے خبر ہیں اُن کو پتا نہیں، کیونکہ قرآن دو (۲) زبانوں سے ہے ایک زبانِ حال سے ہے، ایک زبانِ قال سے۔ زبانِ قال کا مطلب ہے کہ واقعاً کوئی بات کہی گئی ہے، زبانِ حال کے معنی ہیں کہ وہ بات اِس زبان سے نہیں ہے جس سے اب ہم بول رہے ہیں بلکہ وہ حالت کی ترجمانی ہے۔ مثلاً پتّھر بھی خدا سے کچھ کہتا ہے لیکن زبانِ قال سے نہیں کہتا ہے، زبانِ حال سے کہتا ہے، یعنی اُس کی جو حالت و کیفیّت ہے وہ خدا کے سامنے ایک گفتگو ہے۔ خداوندِ عالم پتّھر کی اُس کیفیّت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ پتّھر یہ کہتا ہے وہ سچ ہے، خدا ہر چیز کی کیفیّت کو اُس کے باطنی احوال کو جانتا ہے۔

جب جانتا ہے تو حق اور انصاف سے وہ ایک ترجمانی بھی کرسکتا ہے، یہ بہت اہم بات ہے جو میں نے آپ کو بتادی۔ آگے چل کر آپ جب اسماعیلی فلسفے کو پڑھیں گے، تاویل کو پڑھیں گے اور حکمت کا مطالعہ کریں گے تو اُس میں یہ بات آپ کے لئے کام آئے گی جو میں نے کہا کہ خدا بے جان چیزوں کی کیفیّت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ درخت نے یہ کہا اور پتّھر نے یہ کہا، اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ قیامت آوے تو سب لوگوں کو پتا چلے۔ جب آپ بغور قرآن کا مطالعہ کریں گے تو قیامت کے متعلّق آپ کو یہ خلاصہ ملے گا کہ قیامت لوگوں پر لاشعوری کیفیّت میں گزرنے والی ہے، قیامت شعوری طور پر نہ معلوم [یہ] ایک یا چند افراد پر گزرتی ہے اور اُن چند افراد پر جب قیامت گزرتی ہے تو لوگ عالمِ ذرّ میں ہوتے ہیں۔ عالمِ ذرّ، ذرّات کی دُنیا، عالمِ ذرّ میں ہر شخص کی رُوح سے ایک چھوٹا سا ذرّہ نمائندگی کرتا ہے۔ اب اِس صورت میں قیامت کے بارے میں دو (۲) خلاصے ہوئے یا یوں کہنا چاہئے کہ قیامت ایک اعتبار سے لوگوں کے سامنے ہوتی ہے اور دُوسرے اعتبار سے قیامت لوگوں کی نظر سے ہمیشہ اور ہر وقت غائب رہتی ہے۔ اِن دو (۲) اعتبارات کی وضاحت ہو چکی ہے یعنی جس اعتبار سے قیامت لوگوں کے سامنے ہوتی ہے، وہ اعتبار یہ ہے کہ ہر شخص کی رُوح میں سے ایک ذرّہ مقامِ قیامت پر حاضر رہتا ہے اور وہی ذرّہ قیامت کا مشاہدہ کرتا ہے اور جس اعتبار سے قیامت لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہے وہ یہ ہے کہ عام انسان شعوری طور پر قیامت تک رَسا نہیں ہوتے ہیں کہ قیامت کو دیکھیں تو اِس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دو (۲) پہلو ہیں اور

آپ کو بس یہی باتیں ملیں گی قرآن کے اندر کہیں تو فرمایا جائے گا کہ وہ لوگ قیامت میں یہ کہیں گے، اور پھر بعض دفعہ کہا گیا ہے کہ قیامت لوگوں پر اندھے پنے میں گزرے گی، اِس لئے کہا گیا کہ اُس روز لوگ اعمال کو دیکھنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے رہیں گے، تو یہ اُن ذرّات سے متعلّق بات ہے اِس کا اطلاق رُوح کے ذرّات پر ہوتا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۸) جو ذرّہ برابر نیکی کرے گا وہ وہاں اُس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرّہ برابر بدی کرے گا وہ اُس کو دیکھ لے گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ میں سے کوئی مومن رُوحانی ترقّی کرے گا عبادت بندگی میں اور علم میں آگے بڑھے گا اور خود کو اِس قابل بنائے گا کہ وہ رُوحانی طور پر قیامت کو دیکھے اور عملی تاویل کو پائیں تو اُس وقت اُس کے سب اعمال ذرّات کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ ذرّات کی شکل میں، عالمِ ذرّ میں، یہ عالم ذرّ ایک خاص اصطلاح ہے جو ابھی تک آپ نے سُنی نہیں تھی، ذرّات کی دُنیا، جب مردِ مومن پر قیامت برپا ہو جاتی ہے تو اُس پر رُوحوں کی بارش برستی ہے، یعنی وہ رُوحوں کی دُنیا میں ہوتا ہے اور رُوحیں ذرّات کی شکل میں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ رُوحیں ہیں دُنیا والوں کی اور پھر دُوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو اتنی ساری رُوحیں اُس کے اعمال کے ذرّات ہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اعمال نامہ جو ہے جب بھی قیامت برپا ہوگی اور جس کی قیامت برپا ہونی چاہئے اُس کی، تو اُس وقت اعمال نامہ جو دیا جائے گا وہ بکھری ہوئی حالت میں دیا جائے گا (۱۷: ۱۳۔ ۱۴) ایک منظّم کتاب کے طور پر نہیں، اعمال نامہ جو ہوگا ذرّات پر مشتمل ہوگا۔ وہی ذرّات اُس کے اعمال نامے کی حیثیّت سے ہیں، اِس معنی میں کہا گیا کہ جس کسی نے ذرّہ بھر نیکی کی ہو تو نیکی کا ایک ذرّہ دیکھے گا اور جس کسی نے ذرّہ بھر بدی کی ہو تو بدی کا وہ ذرّہ دیکھے گا۔ عجیب بات ہے کہ عالمِ ذرّ میں جو ذرّات ہیں وہ اِس قدر جامع ہیں کہ تمام تاویلات کو وہی ذرّات (Cover) کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ذرّات یعنی رُوحوں کے ذرّات آدمؑ کے ملائکہ بھی ہیں جنہوں نے آدمؑ کو سجدہ کیا اور وہ نوحؑ کا طوفان بھی ہیں، وہی ذرّات ابراھیمؑ کا گلشن بھی ہیں اور موسیٰؑ کے سارے معجزات بھی، غرض یہ کہ اُن ذرّات کے اندر اتنی گنجائش ہے کہ قرآن کی ساری تاویلات اُن ہی ذرّات سے متعلّق ہو جاتی ہیں۔ آپ کو تعجّب ہوگا وقت سارا اسی میں صَرف ہوگا کہ میں صرف ذرّات کی تاویل قرآن میں کہاں کہاں ہیں اُس کی مثالیں پیش کروں تو آپ تعجّب کریں گے، قرآن میں کہا گیا ہے کہ: اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸: ۱) ۔ اے رسول! ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے، تو اِس کوثر سے مُراد، مردِ کثیر الذّرّیہ بھی ہے اور اِس کی تاویل لاتعداد رُوحیں بھی ہیں۔ کبھی تو اِن رُوحوں کو اُڑتے ہوئے پہاڑ کے ریزے بھی کہا گیا ہے، کبھی اُن کو رُوحوں کا لشکر قرار دیا گیا ہے، کبھی اِن کو طوفان، کبھی بارش اور کبھی ملائکہ، کبھی ارواح وغیرہ، اِن ذرّات کی بہت سی مثالیں ہیں۔ چنانچہ جاننے والا جب قرآن کو کھول کر دیکھتا ہے، آیت کو سورے کو پڑھتا ہے تو اُس کو پتا چلتا ہے کہ وہاں اُن ذرّات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ عادیات (۱۰۰):

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ وَالۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا (۱) فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا (۲) فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا (۳) فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا (۴) فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا (۵) اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ (۶) وَاِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیۡدٌ (۷) وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ (۸) اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ (۹) وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ (۱۰) اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ (۱۱)۔

اللہ قسم کھاتا ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں اور تعجّب کی بات ہے کہ اللہ حیوان یعنی جانور کی قسم کھاتا ہے، حالانکہ خود ہی فرماتا ہے کہ تم سورج، چاند کی تعظیم نہیں کرنا یہ مادّی چیزیں ہیں مخلوق ہیں، یہ ایک طرح کا شرک ہے (۴۱:۳۷) لیکن خود ہی ہانپتے ہوئے، دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم کھاتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے، یہ آپ کو توجّہ دلانے کے لئے میں نے کی، اور اگر میں نے یہ بات کی تو اہلِ ظاہر کے مطابق بات کی، ہمارے نزدیک اِس کی ایک بہت اچھی اور بہترین تاویل ہے۔ اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ اِس سے ایسے گھوڑے مُراد ہیں جو راہِ اسلام میں کافروں سے جہاد کرنے کے سلسلے میں دوڑائے جاتے ہیں کیونکہ ایسے گھوڑوں کا ایک تقدّس ہوتا ہے اور اللہ تقدّس کے بغیر عظمت اور بزرگی کے بغیر کسی چیز کی قسم نہیں کھاتا ہے۔ پھر بھی یہ بات صحیح نہیں ہے۔

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ برند

چون بیاید ہنوز خرباشد

عیسیٰؑ کے گدھے کو اگر مکّہ لے جایا جائے اور جب بھی اُس کو واپس کیا جائے گا تو وہ گدھا ہی رہے گا۔ کچھ اُس کو حاجی نہیں کہا جائے گا نہ اُس میں کوئی فضیلت ہوگی، اسی طرح اگر جہاد کے گھوڑے ہیں تو پھر بھی گھوڑے ہیں، تقدّس ہے تو غازیوں میں ہے اور جہاد میں ہے، حیوان کا کوئی تقدّس نہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ آیت جو صحیح طور سے معنی نہیں دیتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اُس کے پس منظر میں حکمت ہے تاویل ہے۔ کسی آیت کے محکم اور متشابہ ہونے کی علامت بھی یہی ہے کہ دانشمند جب اُس کے معنی بیان کرتا ہے تو وہ دُرست معنی نہیں دیتی ہے، تو اُس وقت جاننا چاہئے کہ آیت جو ہے محکم نہیں ہے بلکہ متشابہ ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اُس میں متشابہ کا پہلو زیادہ ہے، ویسے تو ہر آیت کے دو (۲) پہلو ہوا کرتے ہیں ایک محکم کا، ایک متشابہ کا لیکن کبھی کبھی متشابہ کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، تو بہر حال اِس آیت کے اندر متشابہ کا پہلو نمایاں ہے۔ لہٰذا اِس کا تقاضا ہے کہ ہم تاویل کریں اور وہ یہ کہ ہانپتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑے زمانۂ ماضی کے لحاظ سے داعی ہیں اور زمانۂ حال کے لحاظ سے یہ ذکرِ خفی ہے۔ ایک کامیاب مومن اسم اور ذکر کے گھوڑے کو دوڑاتا ہے تو یہ مشابہ ہے جیسا کہ وہ کسی غازی کی طرح دشمن پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہاں اِس جنگ میں دشمن نفس اور اُس کے خیالات ہیں جو شیطان کا نمائندہ ہے، جو کافر

سے اور کفّار کے لشکر سے کم نہیں بلکہ اُس سے بڑھ کر ہے۔ جہادِ ظاہر کے مقابلے میں جہادِ باطن اِس لئے اکبر ہے یعنی بڑا ہے کہ یہ مشکل بھی ہے اور اِس جنگ کے جیتنے میں فائدہ بھی ہے، کہ یہ نسبتاً مشکل بھی ہے اور اِس کے جیتنے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی ہے۔

بہر حال، وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا (۱) سے مُراد وہ تیز ذکر جو ہانپتے ہوئے گھوڑے کے مشابہ ہے۔ یہاں دانشمند کو قرآن اشارہ کرتا ہے کہ ذکر کی رفتار اُس دوڑتے ہوئے گھوڑے کی طرح ہونی چاہئے جو کسی جہاد کے لئے دوڑایا جاتا ہے۔

فَالْمُوْرِيَاتِ قَدْحًا (۲) اور پھر پتّھر پر ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں۔ ظاہر میں دیکھا جائے تو یہ آیت معنی نہیں دیتی ہے اِس لئے کہ ضروری نہیں کہ ہر مقام پر پتّھر موجود ہوں اور گھوڑے کو دوڑاتے وقت ٹاپ سے آگ کی چنگاریاں پیدا ہو جائیں، کیونکہ بہت سے ملک میدانی ہیں جہاں جہاد کے لئے اگر گھوڑے دوڑائیں جائیں تو کوئی پتّھر نہیں ہے، کوئی گھوڑے کے ٹاپ سے یا نعل سے کوئی چنگاری نہیں نکلتی، لیکن اِس کے برعکس رُوحانی جہاد میں جب سختی کے ساتھ تیزی کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو نفس امّارہ کی تحلیل ہو جاتی ہے نفس امّارہ گھِس جاتا ہے اور اُس سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ جس کے دل کی آنکھ کھلی ہو وہ دیکھتا ہے کہ بعض دفعہ اِس سخت ذکر کے نتیجے میں وہ اپنے اندر، اپنے رُوحانی مشاہدے میں آگ کی چنگاریاں سی دیکھتا ہے۔

فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا (۳)۔ جو صبح کے وقت تاخت و تاراج کرتے ہیں یعنی غازی لوگ، مجاہدینِ اسلام صبح کے وقت دشمنوں پر حملہ آور ہو کر اُن کو شکستِ فاش دے کر اُن سے مالِ غنیمت لیا کرتے ہیں، لیکن دیکھا جائے تو عجیب سی بات بنتی ہے کہ اِس آیت کو دُرست اور صحیح ثابت کرنے کے لئے ہر وقت ضروری ہے کہ مجاہدین صبح ہی مالِ غنیمت اُٹھایا کریں لیکن یہ بات ممکن نہیں ہے، کہ ہر بار فتح ہو ہر بار صبح کے وقت مالِ غنیمت ہاتھ آئے یہ بات صحیح نہیں ہوتی، ہاں! تاویل میں یہ بات صحیح ہوتی ہے کہ اُٹھنے کا وقت چار اور پانچ ہے اور وہاں ذکر و عبادت کا گھوڑا جب دوڑایا جاتا ہے اور کامیابی سے نفس کے خلاف جنگ جیت لی جاتی ہے تو بے شک صبح کے وقت رُوحانی قسم کا مالِ غنیمت ہاتھ آتا ہے، دشمن یعنی نفس اور بُرے خیالات لُٹ جاتے ہیں، شیطان لُٹ جاتا ہے اور بہت کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آتا ہے۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۴)۔ اُس وقت غبار اڑاتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ غبار اُڑے جنگ میں لیکن رُوحانی جنگ میں غبار کا اُڑنا یہ ہے کہ جب صحیح طور سے گھوڑا دوڑایا گیا اور صحیح طور سے چنگاریاں جھاڑی گئیں اور رُوحانی طور پر مالِ غنیمت لیا گیا تو بے شک اُس وقت غفلت اور رہا سہا گناہ کا جو گرد و غبار ہے وہ اُڑ جاتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۵) پھر اُس وقت دشمنوں کی جماعت میں جا گھستے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسے میں رُوحانی مجاہدین اپنے نفس اور شیطان کے خلاف کامیاب ہو جاتے ہیں، کہ اُن میں گھس جاتے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۶) انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے، یعنی یہ ساری رُوحانی دولت اور یہ تمام نعمتیں ممکن ہیں، لیکن اِس کے باوجود انسان ناشکر گزار ہے، کہ اِس کو حاصل نہیں کرتا کہ اِس کی طرف، اِس سعادت کی طرف، اِس دولت کی طرف توجّہ نہیں دیتا۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (۷)۔ وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی اِس صورتِ حال کا خود ہی مشاہدہ کرتا ہے کہ وہ کتنا بڑا ناشکر گزار ہے، وہ جانتا ہے، جانتے ہوئے بھی ناشکری کرتا ہے، وہ کہتا ہے اقرار کرتا ہے کہ میں ناشکر گزار ہوں، پھر بھی ناشکری کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ نہیں سمجھتا ہے، وہ جانتا ہے وہ سب کچھ سمجھتا بھی ہے لیکن پھر بھی ناشکرا ہی رہتا ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۸) اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مال کی محبّت میں بڑا مضبوط ہے، مطلب یہ ہے کہ اُس کی قوّتِ ارادی میں جو کمی واقع ہوتی ہے جو وہ ہر بار عبادت و بندگی میں اور رُوحانی ترقّی میں ناکام رہتا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا سے لَو نہیں لگا سکتا ہے، اُس کی جو محبّت ہے وہ مالِ دُنیا میں صَرف ہو جاتی ہے۔ محبّت محدود ہے وہ ایک صلاحیت ہے وہ ایک طاقت ہے اگر اُس صلاحیت کو مالِ دُنیا کے لئے لگائی گئی اور دُنیاوی چیزوں میں صَرف کی گئی، تو پھر وہ خدا سے محبّت نہیں کر سکتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ اُس کا شکر گزار نہیں بن سکتا ہے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ (۹) کیا وہ نہیں جانتا ہے کہ ایک وقت آنے والا ہے جس میں کہ قبروں میں سے مُردوں کو نکالا جائے گا۔ یعنی اِن شخصیتوں کی قبروں میں سے، مٹّی کی قبروں میں سے نہیں کیونکہ قبر تاویل میں شخصیّت ہے، جس طرح کہ میں نے ابھی ابھی بات بتائی تھی، کہ جب قیامت کسی مومن پر برپا ہوتی ہے تو ہر شخصیّت سے ایک ذرّہ اِس معنی میں جس معنی میں کہا جاتا ہے کہ قبر سے رُوح اُٹھتی ہے اُس مقام پر حاضر ہوتا ہے، ذرّہ جہاں پر کہ قیامت ہے، یہ ہوا قبروں سے رُوحوں کا نکل جانا۔

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰) اور سینوں میں جو کچھ ہے وہ آشکار ہو جائے گا۔ جس پر قیامت گزرتی ہے اُس کے باطن کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ رُوحانی ترقّی کے وقت ظاہر ہو جاتا ہے۔ اُس کے سینے میں، اُس کے دل میں جو کچھ ہے۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ (۱۱) اِس کا سبب یہ ہے کہ اللہ اُس روز اُن کو اُن کے بھیدوں سے اُن کے احوال سے آگاہ کر دیتا ہے، تو اسی کے ساتھ آج کی مجلس یا کہ کلاس خاتمے پر پہنچتی ہے اور اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال ہو تو پوچھا جائے، سوال کے لئے چند منٹ رکھتے ہیں۔

سوال: سورۂ عادیات میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو ناشکری کرتے ہیں، اور پھر کہا جاتا ہے کہ کیا وہ نہیں جانتے کہ اُن کو قبروں سے نکالا جائے گا، مُردے قبروں سے نکالے جائینگے تو سریہ تو اُن لوگوں کا ذکر ہے جن پر بذاتِ خود قیامت گزرے گی، جو ناشکرے لوگ ہیں سر اُن کا ذکر تو نہیں ہے؟

جواب: اِس ناشکری میں اگر چہ لگتا یوں ہے جیسے یہ کافروں کا تذکرہ ہے، لیکن اِس میں چونکہ اللہ کی شکر گزاری بڑی باریک شئ ہے، اِس لئے ناشکری کا اطلاق اُن پر ہوتا ہے جن کو نعمت و دولت عطا کی گئی ہے، اور خصوصاً رُوحانی نعمتوں کا اِس میں ذکر ہے اور اِس میں ضروری نہیں ہے کہ ہم مانیں کہ یہاں کافروں کا ذکر ہے، بلکہ مومنوں ہی کا ذکر ہے کہ امکانیت اُن کے لئے ہے نعمت اُن سے قریب ہے، احسان و اکرام اُن پر کیا گیا ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ شکر گزار اُنہیں ہونا چاہئے نہ کہ دُوسروں کو۔ اِس لئے اِس میں بھی توجّہ دلائی گئی ہے کہ یہ ساری نعمتیں ممکن ہیں۔

زلزال کے بارے میں آپ نے سوال کیا اور کہا کہ صوفیوں میں یا عام لوگوں میں بھی اِس کے نمونے پائے جاتے ہیں یہ بہت معمولی چیز ہے۔ یہاں جس زلزال کا یا جس زلزلے کا ذکر ہے وہ بہت ہی معجزانہ ہے اور بہت ہی اعلیٰ درجے کا ہے۔ گو کہ ہم میں سے ہر ایک عبادت میں ذکر میں محفل میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ خود کو ہلائیں اور ایک بناوٹی قسم کا زلزال اپنے اُوپر طاری کریں، اُسی حقیقی چیز کے شوق میں ہم ایک نقلی چیز بھی کرتے ہیں، تو اسی طرح جو اصل چیز ہے اُس کی مثالیں دُنیا میں ہونی چاہئیں تا کہ لوگوں کو توجّہ ہو، تا کہ لوگوں کو احساس ہو اور اصل چیز کی طرف قدم اُٹھائیں۔

اجتماعی قیامت مادّی طور پر اگر گزرے تو پھر بھی لوگوں کو رُوحانی طور پر پتا نہیں چلے گا وہ اِس کو ایک حادثہ سمجھیں گے۔ مثلاً کوئی ملک یا کوئی شہر ہلاک ہو جاتا ہے یا کسی قسم کا زبردست حادثہ پیش آتا ہے تو اُس کے پس منظر میں بھی ایک قیامت ضرور ہے، لیکن اُن پر تو ایک مادّی قسم کا حادثہ گزرتا ہے اور رُوحانی طور پر اُس کو نہیں پا سکتے ہیں ناممکن نہیں ہے کہ ایک دن سیّارۂ زمین ختم ہو جائے۔ کیونکہ قرآن میں اِرشاد فرمایا ہے کہ: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸)۔ ذاتِ خدا کے سوا جو بھی چیز ہے اُس کو فنا در پیش ہے وہ فانی ہونے والی ہے، فنا ہونے والی ہے۔ اسی طرح ایک وقت تھا جس میں کہ سیّارۂ زمین نہیں تھا اور پھر ایک وقت آئے گا جس میں کہ یہ زمین ہلاک ہو جائے گی لیکن نامعلوم اُس وقت تک لوگ دُوسرے سیّارے میں منتقل ہوں گے یا کس سیّارے پر ہوں گے لیکن یقین ہے، کہ اُس وقت لوگ اِس سیّارے پر نہیں ہوں گے، اُن کو اُٹھایا جائے گا۔ وقت سے پہلے اُن کو اُٹھایا جائے گا، جس طرح کہ اب چاند پر کوئی بستی نہیں ہے اسی طرح اِس سیّارے پر سے بھی بستی ختم کر دی جائے گی۔ خیر بہر حال یعنی مجموعی طور پر کوئی تکلیف، کوئی مصیبت آسکتی ہے لیکن لوگوں کو بحیثیتِ مجموعی وہ ایک آفت، وہ ایک ظاہری تکلیف لگے گی، اگر اُس کے پس منظر میں مجموعی قیامت ہے تو اُن کو محسوس نہیں ہوگا۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ ناس (۱۱۴) کی تاویل (نقشے کے حوالے سے)

کیسٹ نمبر: Q-08 تاریخ: ۷ رنومبر ۱۹۷۸ء، کراچی

یا علی مدد! آپ کے بھروسے سے اور اعتماد سے مجھے بہت ہی خوشی کا احساس ہو رہا ہے، چونکہ آپ نے بہت ہی بھروسے سے توجّہ دی ہے، اور یہاں آئے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ آج مجھے یقین ہے کہ ایک نئی چیز آپ کے سامنے پیش کروں گا اور وہ چیز صحیح معنوں میں نئی ہوگی، اور اُس کو ایک انکشاف کہہ سکتے ہیں۔ اِس لئے کہ آج تک میں نہیں سمجھتا ہوں کہ قرآن کی حقیقتوں کو، قرآن کی تاویلات کو نقشوں کی مدد سے سمجھانے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مجھے پتا نہیں ہے اور خصوصاً قرآن کے آخیر میں جو سورہ ہے جس کا نام سورۂ ناس ہے، جس پر کہ قرآن ختم ہو جاتا ہے، اُس کے متعلّق میں نے ایک نقشہ تیار کیا ہے، اُس نقشے کی مدد سے ہم قرآن کی بہت سی حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں اور اِس لئے کہ انسان کے جو ظاہری اور باطنی حواس ہیں اُن میں سے جس قدر بھی زیادہ حواس کو کام میں لاتے ہوئے سمجھ لیا جائے اُتنا فائدہ ہے۔

جب ہم کسی کے لیکچر کو سنتے ہیں تو اُس میں صرف اور صرف کان سے کام لینا ہوتا ہے، جب ہم اُسی کے ساتھ ساتھ کسی نقشے کو بھی سامنے رکھتے ہیں تو سننے کی قوّت کے علاوہ دیکھنے کی قوّت سے بھی ہم کو مدد ملتی ہے، اِس لئے آج کل یہ کوشش کی جارہی ہے کہ سمعی اور بصری دونوں قوّتوں سے کام لے کر تعلیم حاصل کی جائے، تو چنانچہ میں نے ایک نقشہ بنایا ہے اصل نقشہ وہ یہ ہے، شاید آپ کو دُور پڑتا ہوگا، ہم اِس کے بارے میں تفصیل سے سمجھائیں گے، نقشہ یہ ہے اور اِس کا (Rough) سا نقشہ بلیک بورڈ پر بنا ہوا ہے۔ اِس نقشے کی وضاحت کرنے سے قبل ہم اس سورے کو لیں گے، اس کو پڑھیں گے کہ اُس سورے کا مطلب اور ترجمہ کیا ہے اور اُس کے بعد ہم یہ کوشش کریں گے کہ نقشے کے سہارے سے بہت سی بنیادی باتیں سمجھادی جائیں اور وہ سورہ یہ ہے:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۔ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱) مَلِكِ النَّاسِ (۲) اِلٰهِ النَّاسِ (۳) مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ (۴) الَّذِىۡ يُوَسۡوِسُ فِىۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ (۵) مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱۴: ۱-۶)۔ سورے کی صرف چھ آیتیں ہیں اور اُس کا عام اور سادہ ترجمہ یہ ہے، ”قُلۡ“ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ کہیئے اے رسول، ”اَعُوۡذُ“ میں پناہ لیتا ہوں، ”بِرَبِّ النَّاسِ“ لوگوں کے پروردگار کے حضور میں پناہ لیتا ہوں۔ ”مَلِكِ النَّاسِ“ جو لوگوں کا بادشاہ ہے۔ ”اِلٰهِ النَّاسِ“

جولوگوں کا معبود ہے ۔ ''مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ'' خنّاس کے وسوسے کے شر سے ۔ ''اَلَّذِیۡ'' جو ''یُوَسۡوِسُ'' وسوسہ ڈالتا ہے ''فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ'' لوگوں کے دلوں میں ۔ ''مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ'' اور وہ خنّاس انسانوں میں سے بھی ہے اور جنّات میں سے بھی ۔ ایک بار پھر اِس کا ترجمہ میں آپ کو بتاتا ہوں ۔ اللہ فرماتا ہے آنحضرتؐ سے کہ: اے رسول ! کہئے کہ میں لوگوں کے پروردگار کے حضور میں پناہ لیتا ہوں ، جو لوگوں کا بادشاہ ہے، لوگوں کا معبود ہے، خنّاس کے وسوسے کے شرّ سے جو کہ وسوسہ ڈالتا ہے لوگوں کے دلوں میں اور وہ خنّاس جنّات میں سے بھی ہے اور لوگوں میں سے بھی ہے ۔

اِس کا مختصر ترجمہ یہ ہے، سب سے پہلے تھوڑی سی ''قُلۡ'' کی تشریح کریں گے وہ یہ کہ اِس ''قُلۡ'' سے مُراد تعلیم ہے یعنی خدا آنحضرتؐ سے جو کچھ کہلانا چاہتا ہے اُس میں تمام زمانے کے لوگوں کے لئے ہدایت اور تعلیم مقصود ہے، اِس لئے ہم اِس کی تشریح یوں کریں گے کہ اے رسولؐ آپ اپنے وقت میں ذاتی طور پر اور مستقبل میں اپنے جانشین کے وسیلے سے لوگوں کو تعلیم دیجئے، اُن سے کہئے اِس ''قُلۡ'' کے یہ معنی ہیں ۔ پھر میں کہتا ہوں کہ خداوندِ عالم آنحضرتؐ سے جو کچھ کہلانا چاہتا ہے اُس میں ہدایت اور تعلیم مُراد ہے یعنی یہ ایسا نہیں ہے کہ صرف خدا آنحضرتؐ سے کہلائے کہ رسول کہئے اور بس کریں، ایسا نہیں بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِس کہلانے سے اللہ کا مقصد لوگوں کی ہدایت ہے، اَب [دورِ] نبوّت میں بھی اور مستقبل میں بھی ۔ لہٰذا اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ اے رسول آپ اپنے وقت میں ذاتی طور پر کہئے، بتلائیے اور مستقبل میں اپنے جانشینوں کے وسیلے سے کہئے ۔ جہاں کہیں قرآن میں ''قُلۡ'' کا اِرشاد ہوا ہے اور آنحضرتؐ سے کچھ کہلانے کے لئے فرمایا گیا ہے تو اُس مقام پر اِس کا مطلب یوں ہے ۔

دُوسری اہم بات جو ضروری ہے وہ یہ کہ ''اَعُوۡذُ'' کا مطلب کچھ قول نہیں ہے بلکہ ''اَعُوۡذُ'' کا مطلب ہے پناہ لینا عملی طور پر، اور یوں کہنا اِس لئے ضروری ہوا ہے کہ بعض لوگ اِس سے کوئی قول مُراد لیتے ہیں وہ یوں سمجھتے ہیں کہ جب انسان کہتا ہے کہ خدایا! میں تیرے حضور میں پناہ لینا چاہتا ہوں یا مجھے پناہ دیجئے تو اِس سے لوگوں کو پناہ مل سکتی ہے یہ بات نہیں ہے، بلکہ پناہ لینا یہ ہے کہ کوئی انسان کسی ایسی جگہ میں خود کو محفوظ کرے جہاں پر کہ شیطان کا خطرہ نہ ہو ۔ جس طرح کہ دھوپ سے پناہ لینے کے یہ معنی ہیں کہ کسی سائے میں چلا جائے، اور بارش سے پناہ لینا یہ ہے کہ چھپّڑ کے نیچے آئیں، گھر میں خود کو محفوظ کریں اور دشمن سے پناہ لینا یوں ہے کہ کسی مضبوط اور مستحکم قلعے میں داخل ہو جایا جائے ۔ اسی طرح شیطان سے خدا کے حضور میں پناہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کے پھندے سے خود کو بچا کر، شیطان کے وسوسے سے خود کو بچا کر، راہِ راست سے آگے بڑھ کر خدا کے حضور میں یعنی خدا کے رسولؐ اور رسولؐ کے جانشین کے وہاں خود کو محفوظ کر لیا جائے ۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے پناہ لینے سے متعلّق، اور اِس کے بارے میں ایک بنیادی سوال وہاں اُٹھتا ہے جہاں پر کہ لوگوں کی عادت ہے کہ جو کہتے ہیں کہ أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ وہ یہ کہتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ اِس قول کے کہنے سے اُن کو پناہ ملتی ہے

حالانکہ یہ بات نہیں ہے اور تعوُذ کا کہنا یعنی أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیمِ کا کہنا قرآن کے ایک اِرشاد کے تحت ہے اور وہ اِرشاد یہ ہے کہ: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ (۹۸:۱۶)۔ جب تُو قرآن پڑھ چکا ہوگا تو اُس وقت خود کو خدا کے حضور میں، شیطان سے محفوظ کر لینا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ علم وحکمت کے سمجھنے کے بعد یا کہ قرآن کی حقیقتوں کو، قرآن کی حکمتوں کو حاصل کر لینے کے بعد تُو شیطان سے خود کو پروردگار کے حضور میں محفوظ کر سکے گا اِس سے پہلے نہیں، اور یہ بات لوگوں کی عادت کے خلاف واقع ہوئی۔ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے پڑھنے سے قبل تعوُذ یعنی أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیمِ، کہا جائے حالانکہ قرآن کے اِس اِرشاد میں فرمایا گیا ہے کہ جب تُو قرآن کی حقیقت وحکمت کو حاصل کر چکا ہوگا تو اُس وقت شیطان کے شرّ سے خود کو اپنے پروردگار کے حضور میں محفوظ کر سکے گا، تو اِس تشریح سے مُراد یہ ہے کہ خدا کے حضور میں پناہ لینا ایک عمل ہے قول نہیں۔ قرآن کے اِرشادات میں سے کچھ میں تو قول کے لئے حکم ہے اور کچھ میں عمل کے لئے، یعنی ایک مومن کو دین کے سلسلے میں کچھ باتیں تو کہنی چاہئیں اور کچھ کام کرنے چاہئیں۔ چنانچہ یہاں جس پناہ کے لئے کہا گیا ہے وہ پناہ محض ایک قول سے حاصل نہیں ہوسکتی ہے وہ تو ایک عمل ہے۔ جس طرح عام طور سے ہم کہتے ہیں کہ فلان فلان لوگ، فلان قوم، فلان ملک کے باشندے پناہ گیر ہو گئے، یعنی انہوں نے اپنے ملک کو چھوڑا اور خود کو بچانے کے لئے کسی دُوسرے ملک میں چلے گئے، اِس مطلب کو پناہ گیر کہتے ہیں اُس میں جگہ چھوڑنی پڑتی ہے اور چلنا پڑتا ہے اور اپنے لئے ایک محفوظ جگہ کی تلاش کرنی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِن الفاظ میں، میں نے پناہ کی تشریح کی، تو اَب میں نقشے کی مدد سے اِس مقصد کی باتیں بتلانے کی کوشش کرتا ہوں۔

اِس سورہ میں سے موٹی موٹی باتیں لی گئی ہیں، چنانچہ جیسا کہ آپ نے اِس سورے کو پڑھا بھی ہوگا اور جیسا کہ آپ نے یہاں پر بھی سُن لیا کہ اللہ آنحضرتؐ سے خطاب فرماتا ہے اور جہاں کوئی ہدایت اِس طرح سے ہو کہ خصوصی طور پر آنحضرتؐ سے کچھ اِرشاد ہو رہا ہے تو وہاں اُونچی (Level) یعنی اُونچی سطح کی باتیں ہوتی ہیں اور بڑی حکمت کی باتیں ہوتی ہیں کیونکہ لوگ، عام لوگ تو یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ جو بات کہی جا رہی ہے یہ آنحضرتؐ سے متعلّق ہے حالانکہ خدا اپنے رسولؐ سے کہتے ہوئے مومنین کو سمجھانا چاہتا ہے، تو اِس موقع کی باتیں جو ہوتی ہیں وہ بہت اُونچی ہوتی ہیں اُس میں بہت زیادہ حکمت ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ کا یہ فرمانا کہ اے رسول! آپ کہیے کہ میں شیطان اور اُس خنّاس کے شرّ سے جو لوگوں کے سینوں میں یعنی دلوں میں وسوسہ ڈالا کرتا ہے، خود کو پروردگار کے حضور میں محفوظ کر لیتا ہوں جو لوگوں کا پروردگار ہے، جو لوگوں کا بادشاہ ہے، جو لوگوں کا معبود ہے، تو یہاں پناہ کے سلسلے میں اللہ کے تین نام لئے گئے ہیں، لیکن یہ نام ایسے ہیں جو لوگوں سے بہت ہی قریب ہیں۔

اللہ کے کچھ نام تو لوگوں سے بہت ہی اُونچے ہوتے ہیں جیسے سبحان ہے، جیسے لفظِ اللہ ہے، [جیسے] قدّوس ہے یا

قادر ہے، یہ بہت بلندی کے نام ہیں لیکن جہاں اسمِ پروردگار آتا ہے تو لوگوں کی پرورش کی نسبت سے یہ لوگوں سے قریب ہے، کیونکہ ربّ کی رُبوبیت کا ثبوت یعنی پروردگار کی پرورش کا ثبوت لوگوں کے بغیر نہیں ہے اور خدا کی بادشاہی بھی لوگوں پر ہے اور خدا معبود ہے تو لوگوں کے سبب سے ہے، [اور] پرستش ہو تو وہ معبود کہلاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پناہ جس کے حضور میں لینی ہے وہ قریب ہے، خود کو محفوظ کر لینے کے لئے جس طرف کو جانا ہے، جہاں جانا ہے وہ ممکن رستہ ہے وہ دو (۲) طرح سے ہے ایک تو اللہ کے جو نام ہیں وہ عام ہیں اور اللہ کی یہ صفات لوگوں سے قریب ہے اور دُوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ اگر پروردگار ہے، جو علم سے، ہدایت سے لوگوں کی رُوحانی پرورش کرتا ہے، عقلی پرورش کرتا ہے تو اُس کے لئے رسولؐ ہے اور رسولؐ کی طرف سے امامؑ ہے اور یہ ایسا نام ہے کہ اِس کا اطلاق ہمیشہ ہوتا ہے یعنی پرورش ہر وقت ہوتی ہے، پرورش کی ہر وقت ضرورت ہے، جب تک لوگ ہیں تب تک خدا کی طرف سے پرورش ہے، عقلی پرورش، رُوحانی پرورش، جسمانی پرورش یہ تین قسم کی پرورشیں ہیں۔ اِس کو تربیت کہئے عربی میں یا کہ فارسی میں پرورش کہئے تو یہ ہمیشہ دُنیا میں موجود ہیں، تو اِس سے اللہ یہ تصوّر دینا چاہتا ہے کہ لوگ سمجھیں خدا کے وسیلوں کو یعنی رسولؐ کی مرتبت کو اور امامؑ کی حیثیت کو سمجھیں کیونکہ اللہ کی رُوحانی اور عقلی پرورش رسولؐ اور امامؑ کے بغیر ناممکن ہے۔

اِس کی مثال ہم جسمانی پرورش سے لے سکتے ہیں۔ جسم کی پرورش کے لئے جو چیزیں بنتی ہیں دُنیا میں، جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ کچھ آسمان سے تو نہیں آتی اور آسمان سے کوئی چیز آتی ہے تو وہ فیض ہے، لیکن انسان کے بہت ہی قریب جسمانی پرورش کی چیزیں مہیّا ہو جاتی ہیں مثلاً غذائیں، فصلیں، میوے اور دیگر چیزیں دُنیا ہی میں مہیّا ہوتی ہیں، اِشارہ ہے اللہ کے پروردگار ہونے کے باوجود اُس کے وسائل ہیں۔ مختصر یہ کہ جس طرح جسم کی پرورش کے لئے اللہ کی طرف سے دُنیا میں وسیلے ہیں، زمین ہے، آسمان ہے، سورج ہے، بارش ہے اور موسم ہے، اِن چیزوں کے وسیلے سے جسمانی پرورش کی غذائیں مہیّا ہو جاتی ہیں اور خدا ہی پروردگار کہلاتا ہے، لیکن یہ چیزیں اُس کے پیدا کئے ہوئے وسیلوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح رُوحانی اور عقلی پرورش بھی خدا کے مقرّر کردہ وسائل سے مہیّا ہوتی ہے لیکن خدا ہی پروردگار کہلاتا ہے، کیونکہ یہ وسائل اسی نے پیدا کئے، جس طرح کہ خدا نے سورج کو، آسمان کو، بارش کو، زمین کو اور ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اِن تمام چیزوں کے نتیجے میں غذائیں، جسمانی غذائیں تیار ہوتی ہیں لیکن پروردگار ہونے کی جو صفت ہے وہ خدا کے لئے ہے، کچھ سورج کو پروردگار نہیں کہا جاتا ہے، کچھ زمین، پانی، موسم اور دیگر چیزیں پروردگار نہیں ہیں، خدا ہی پروردگار ہے کہ اسی نے یہ تمام وسیلے پیدا کئے ہیں۔ اسی طرح عقلی غذا بھی دُنیا ہی میں، اور لوگوں کے سامنے پیدا ہوتی ہے اور رُوحانی غذا بھی۔ مختصر یہ کہ جس طرح آسمان اور زمین مل کر انسان کی جسمانی غذا مہیّا کرتے ہیں اسی طرح ناطق اور اساس یا کہ پیغمبرؐ اور امامؑ مل کر رُوحانی اور عقلی غذا مہیّا کرتے ہیں کہ پیغمبر آسمان ہیں اور امام زمین، تنزیل آسمان ہے

تاویل زمین، تو میں نے تھوڑی سی پروردگار کی تشریح کی۔ اسی طرح بادشاہ، لوگوں کا بادشاہ، خدا بے شک بادشاہ ہے لیکن آپ قرآن میں جائیں تو خدا کی بادشاہی آلِ ابراھیم کے وسیلے سے قائم ہے۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۴:۵۴)۔ ہم نے بے شک آلِ ابراھیم کو کتاب دی اور حکمت دی اور اُن کو عظیم سلطنت دی۔ جس بادشاہی کی وجہ سے خدا بادشاہ کہلاتا ہے وہ بادشاہی پیغمبرؐ اور امامؑ میں ہے، وہ خدا کی بادشاہی ہے۔ جب ربّ کی رُبوبیت اور اُس کی بادشاہی کی صفت پیغمبر اور امامؑ کے وسیلے سے ہے تو یقیناً اُس کے معبود ہونے کی جو صفت ہے وہ بھی پیغمبرؐ اور امامؑ کی وسیلے سے ہے یعنی عبادت وہی منظور ہے جو پیغمبرؐ اور امامؑ کے وسیلے سے ہو۔

اِس کے بعد میں مفصّل طور سے آپ کو بتاؤں کہ یہ خطِ وحدانی ہے جو اِس کو (Cover) کرتا ہے، یہ ایک خطِ وحدانی ہے جو کہ خدا کا تصوّر پیش کرتا ہے، یہ ایک خطِ وحدانی ہے جو پیغمبرؐ کا تصوّر دیتا ہے اور یہ ایک خطِ وحدانی ہے جو امامؑ کا تصوّر پیش کرتا ہے تو امامؑ رسولؐ کا نمائندہ ہے اور رسولؐ خدا کا خلیفہ ہے، لہٰذا یہ ترتیب اسی طرح سے ہے۔ پس اگر کسی کو پناہ لینی ہے تو اُس کا صرف ایک ہی رستہ ہے جو صراطِ مستقیم ہے، صراطِ مستقیم پر گامزن ہوتے ہوئے امامؑ کی قربت و نزدیکی حاصل کی گئی تو اُس کو پناہ مل گئی کس سے؟ شیطان سے کیونکہ وہ لوگوں کے سینے میں وسوسہ ڈالا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی جگہ پر رہے اور ہزار بار ''اَعُوْذُ'' پڑھے تو اُس کو پناہ نہیں ملے گی، اُس کے گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہے اور شیطان اُس کے سینے میں وسوسہ ڈال سکتا ہے۔ لہٰذا وہ بہت تیزی کے ساتھ اِس رستے پر چل کر امامؑ کے قریب جائے تو تب اُس کو پناہ ملے گی۔ دیکھئے کہ پناہ یہاں مل سکتی ہے، یہاں مل سکتی ہے، یہاں مل سکتی ہے راہِ راست پر چلتے ہوئے۔

[شیطان] یہاں تک کہ صراطِ مستقیم سے بھی کسی کو بھٹکا سکتا ہے اِس لئے کوئی قرار نہیں ہے کوئی ضمانت نہیں ہے یہاں کہیں پناہ ملنے کی جب تک کہ امامؑ سے قریب نہ ہو جایا جائے، جب تک کہ رسولؐ کے مرتبے تک نہ پہنچا جائے، جب تک کہ فنافی اللہ نہ ہو جایا جائے اور دیکھا آپ نے کہ یہ ایک دائرہ ہے جس کے نصف میں تاریکی ہے اور نصف میں روشنی ہے۔ یہ فطری اور ازلی توازن ہے کہ خدا نے خیر و شر کو ظلمت اور تاریکی کو اسی (Balance) کے مطابق پیدا کیا، لیکن ہو سکتا ہے کہ کبھی دُنیا میں زیادہ تاریکی ہو اور کبھی ہو سکتا ہے روشنی زیادہ ہو یہ بات وقتی ہے، لیکن ازلی اور خدا کے عدل و انصاف کی کیفیّت کو دیکھا جائے تو نصف پر تاریکی ہے اور نصف پر روشنی، خیر و شر کا توازن کچھ اِس طرح سے ہے۔ اِس طرف شیطان ہے، شیطان کا دوسرا نام مضّل ہے، گمراہ کر دینے والا اور ایک اُس کا نام خنّاس ہے، یہ مدِ مقابل ہے ہادیٔ برحق کا، کیونکہ ہادیٔ برحق کا نام ہادی ہے، رہنما ہے کہ وہ راہِ راست پر لوگوں کی ہدایت کرتا ہے اور شیطان اِس کے برعکس لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے کیونکہ وہ مضّل ہے کہ وہ تاریکی کی طرف ہے اور ہادی روشنی کی طرف ہے، یہاں سے کوئی شخص اُس طرف جا سکتا ہے اور وہاں سے بھی اِس طرف کوئی آ سکتا ہے یہ ممکن ہے۔

وسوسہ کا مطلب کیا ہے؟ گمراہی کی باتیں، ضلالت کی باتیں، وہ غلط باتیں جن کا نام لوگوں کے نزدیک علم ہے وہ اِن وسوسوں کو علم کہہ سکتے ہیں، اُن کے نزدیک یہ سب علم ہے، لیکن خدا کے نزدیک وہ وسوسہ ہے۔ جو بھی بات باعثِ گمراہی ہو وہ وسوسہ ہے، ہادیٔ برحق کی ہدایت کے سوا جو کچھ بھی ہے اُس سب کو خدا وسوسہ قرار دیتا ہے اور اِس سورہ میں شیطان کی دو (۲) حیثیتوں کا ذکر ہے کہ وہ انسانوں میں بھی ہے اور جنّات میں بھی ہے، جنّات سے مُراد روحیں، جنّات سے مُراد باطن کا پہلو، انسان کا مطلب ظاہری پہلو۔ اگر سچ کہا جائے تو انسان کے دو (۲) پہلو ہیں ایک باطنی پہلو ہے ایک ظاہری پہلو ہے، تو انسان اپنے ظاہری پہلو سے انسان ہے اور باطنی پہلو سے یا تو فرشتہ ہے یا کوئی جنّ ہے اور شیطان جو دو (۲) حیثیتوں میں ہے وہ انسانوں میں بھی ہے اور جنّات میں بھی ہے تو اِس شیطان کو جاننا چاہئے، اِس کے جاننے میں بڑا فائدہ ہے اور خدا کا مقصد بھی یہی ہے۔ اِس لئے اشارہ فرماتا ہے کہ: مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۶:۱۱۴) خدا کا اگر یہ مقصد نہ ہوتا کہ مومنین شیطان کو پہچانیں تو اللہ اُس حد کی طرف اِشارہ نہ فرماتا جس حد میں کہ شیطان ہے، اور اُس کا جاننا یوں ہے کہ جو بھی امامؑ کا دشمن ہے، جو بھی دین کے سلسلے میں ہدایت کے بارے میں امامؑ کی ضد ہے، امامؑ کے برعکس ہے وہ شیطان ہے۔ آپ بزرگانِ دین کی کتابوں کو پڑھیں وہ آپ کو یہی بتائیں گی، کتابِ وجہ دین کو آپ پڑھیں وہاں پر آپ کو شیطان کی شناخت ہوگی اور اُس میں بھی اِس قسم کی باتیں آپ کو ملیں گی، تو دیکھا آپ نے کہ امامؑ کے برابر میں یعنی یہ خط ہے اِس کو بھی خطِ وحدانی کہنا چاہئے۔ یہ وحدانی اِس لئے ہے کہ اِس نے (Cover) کیا ہے تاریکی، اور تاریکی کو اپنے ساتھ ایک کرنا چاہتا ہے اور ایک کر رہا ہے اور یہ خطِ وحدانی اِس معنی میں ہے کہ اِس نے نور کو (Cover) کیا ہے اور نور کو اپناتا ہے اور نور اسی سے ہے، جس طرح ظلمت و تاریکی اسی سے ہے، تو ظلمت سے مُراد گمراہی، نادانی، جہالت، غفلت اور نور سے مُراد علم، حکمت، ذکر، معرفت [ہے]۔

مطلب اِس کا یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے جو قرآن کے آخیر میں پناہ لینے کے لئے فرمایا ہے، اِشارہ کیا ہے گو کہ وہ خطاب رسولؐ سے ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ مومنین سمجھ پائیں کہ کس طرح شیطان سے ہٹ کر خدا کے حضور میں کسی کو پناہ مل سکتی ہے، اِس کے لئے عملاً یہ سمجھ لیا جائے کہ اُس کے لئے چلنے کی ضرورت ہے کہ اِس صراطِ مستقیم سے چلا جا سکتا ہے اور کوئی رستہ نہیں ہے اور امامؑ کی ہدایت کی روشنی میں اور جب امامؑ سے نزدیکی ہوگی تو شیطان سے پناہ ملے گی اور دُوسری بات شیطان کی شناخت کے سلسلے میں کیونکہ دُنیا کے اندر اگر زہر ہے یا کوئی بُری چیز ہے تو اُس کی شناخت سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اُس سے محفوظ رہ سکتا ہے اور اگر چیز کی شناخت نہیں ہوتی ہے تو اُس میں نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ پیر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو زہر کی شناخت ہونی چاہئے اور اُس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ زہر سے خود کو بچا سکتا ہے۔ جس طرح دُنیا میں دشمن کی بھی شناخت ہونی چاہئے تاکہ دشمن کے فریب میں نہ آئے، اسی طرح شیطان کی شناخت بہت ضروری ہے اور یہ بھی

جاننا ضروری ہے کہ شیطان سے کس طرح خود کو بچایا جاسکتا ہے، تو اِس کے سلسلے میں شیطان کے کام کو جاننا چاہئے، ایک تو یہ کہ وہ وسوسہ ڈالتا ہے اور وسوسے کی تشریح یہ ہے کہ جو بھی ہدایت کے بغیر باتیں ہیں وہ وسوسہ ہیں۔ عام لوگوں نے اِس کو [یعنی] وسوسے کو پریشان خیالات سمجھا ہے یہ اِس کے محدود معنی ہیں وسیع معنی نہیں ہیں، وسیع معنی اِس کے یہ ہیں کہ کوئی بھی بات ہو جو غلط ہے وہ وسوسہ ہے۔ یہاں دیکھا آپ نے، یہاں جو نقشہ بنایا گیا ہے اُس کے اندر جو نشان ہیں وہ کسی منزل کی طرف نہیں ہیں، تو وسوسہ اور غلط باتیں ایسی ہیں۔ ایک شخص غلط باتوں پر عمل کرتا ہے تو اُس وقت وہ کسی (Direction) کو نہیں جاتا ہے تو کچھ اِس طرف جاتا ہے کچھ اِس طرف آتا ہے پھر یہاں چلتا ہے پھر اِدھر چلتا ہے جیسا کہ کوئی دیوانہ گردش کرتا ہے کہ اُس کے لئے کوئی منزل نہیں ہے اور کوئی رستہ نہیں ہے، اِس طرح دکھایا گیا ہے، تو یہ سب وسوسے ہیں۔

ہاں! میں کہہ رہا تھا کہ شیطان کی ایک شناخت یہ ہے کہ وہ رجیم ہے اور رجیم کا مطلب پتّھر پھینکنے والا یا کہ پتھراؤ کرنے والا کیونکہ رجم عربی میں پتھراؤ کرنے کو کہتے ہیں اور اُس کی مثال یہ ہے کہ امامؑ کا کوئی دشمن ایک مومن کی طرف ایک مسئلہ ڈالتا ہے وہ پتّھر ہے، اَب اگر اِس کے پاس ڈھال ہے، زرّہ ہے، [وہ] مضبوط ہے، ورزش ہے تو اُس پتّھر سے اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا ہے اور کمزور ہے، ضعیف ہے، ہتھیار نہیں ہے، محفوظ نہیں ہے تو اُس ایک پتّھر سے یہ ہلاک ہوسکتا ہے اور اِس کا ہلاک ہونا یوں ہے کہ ایک دشمن نے جو حقیقت میں شیطان تھا اور شیطان کے لشکر میں سے تھا، ایک ایسی بات کہی دین کے بارے میں، ایمان کے سلسلے میں، امامؑ کی بابت کہ وہ بات، وہ مسئلہ پتّھر کی طرح آیا اور اِس کے سر پر پڑا تو یہ رُوح الایمان سے ہلاک ہوا۔ اگر اُس کے پاس علم ہے تو سمجھ لیں کہ ڈھال ہے، اگر اِس کے پاس امامؑ کی شناخت ہے اور شیطان کی شناخت ہے تو سمجھ لیں کہ یہ (Trained) ہے اور اِس پر اُس کے پتھراؤ سے کچھ بھی نہیں ہوتا ہے، تو یہ محفوظ ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ کچھ منٹ پہلے میں نے کہا تھا کہ کوئی مومن اُس وقت شیطان کی زد سے، شیطان کی مار سے بچ سکتا ہے جب کہ وہ قرآن کو پڑھ چکا ہو، تو قرآن سے مُراد امامؑ کی حقیقت، امامؑ کی معرفت، رُوحانیت [ہے]۔ جب دین میں کوئی مومن کامل ہوتا ہے اور علمُ الیقین حاصل کرتا ہے تو گویا [وہ] قرآن پڑھ چکا ہوتا ہے تو اُس وقت وہ صحیح معنوں میں خود کو شیطان سے محفوظ کرسکتا ہے، اِس لئے کہا گیا ہے کہ پہلے قرآن پڑھو پھر اُس کے بعد خود کو شیطان سے محفوظ رکھو۔ اِس کے برعکس کہ اہلِ ظاہر قرآن پڑھنے سے پہلے ''اَعُوْذُ'' پڑھتے ہیں وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ اِس ''اَعُوْذُ'' کے پڑھنے کے ساتھ شیطان سے کوئی محفوظ ہوسکتا ہے، حالانکہ شیطان اتنا مضبوط ہے، اتنا مضبوط ہے، اتنا (Powerful) ہے کہ آپ کے یا کسی کے أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کے کہنے سے اُس کو کیا ہوتا ہے! اُس کے پاس بہت پاور ہے۔ پاور غلط باتوں کا ہے، گمراہی کا ہے، ظاہری علم کا ہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے خدا نے کہا ہے کہ وہ شیطان اگرچہ لوگوں کے نزدیک بہت (Powerful) ہے لیکن

حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اُس کا جال مکڑی کے جال سے زیادہ مضبوط نہیں ہے، چھڑی کو ہلائیں تو مکڑی کا جالا پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کے پاس علمُ الیقین ہے، معرفت ہے، حقیقت ہے، امامؑ کے بھید آپ جانتے ہیں تو شیطان کیا کرسکتا ہے یعنی ایک اہلِ ظاہر ہے، ایک شیطان صفت انسان ہے جو آپ کو یا کسی مومن کو امامؑ کی راہ سے گمراہ کردینے کے لئے مسئلہ ڈالتا ہے، اگر آپ مضبوط ہیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا ہے اگر کوئی کمزور ہے تو اُسی کے ساتھ ہلاک ہوجاتا ہے، دونوں مثالیں سامنے ہیں۔ شیطان کے پتھراؤ سے بہت سے لوگ ہلاک ہوچکے ہیں، وہ جسمانی موت میں نہیں مرے وہ رُوح الایمان سے مرے، کیونکہ شیطان کے پتھراؤ سے کوئی شخص جسمانی طور پر ہلاک نہیں ہوتا ہے وہ جہاں ہلاک ہوتا ہے رُوح الایمان سے ہلاک ہوجاتا ہے، وہ ایمانی رُوح سے مرجاتا ہے، تو دونوں باتیں ممکن ہیں اور دونوں مثالیں سامنے ہیں۔

آپ غور سے دیکھیں تو اِس زمانے میں بھی ایسے افراد کو پائیں گے جو پہلے جماعت میں تھے، کسی شیطان نے پتھراؤ کیا مسئلے برسائے یا روزانہ تھوڑی تھوڑی تعلیم دی، تو اِس تعلیم نے پتّھر کا کام کیا، رُوح الایمان سے یہ مرا، اور وہ شیطانیت کی رُوح سے زندہ ہوا، اُن کے نزدیک جو ادنیٰ رُوح ہے اُس میں زندہ ہوگیا جو اِس طرف جو ایمان کی رُوح تھی اِس میں سے وہ مرگیا۔ دونوں باتیں برابر ہیں اور اِس کے برعکس وہ مثال بھی آپ کے سامنے ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جن کو شیاطین سے واسطہ پڑتا ہے لیکن چونکہ وہ امامؑ کے حضور میں محفوظ ہیں انہوں نے اِس پر عمل کیا ہے جو خدا نے فرمایا کہ خود کو خدا کے حضور میں محفوظ کرو تو انہوں نے اِس کے بموجب خود کو محفوظ کرلیا ہے، وہ محفوظ ہیں۔ شیطان ہزار بار پتھراؤ کرے مسئلے برسائے دین کے خلاف، ایمان کے خلاف کیا ہوتا ہے، ایک حقیقی مومن پر کچھ بھی اِس کا اثر نہیں ہوتا ہے، تو اِس کے لئے خداوندِ عالم نے جب شیطان پیدا کیا ہے تو اِس کے مقابلے میں شیطان سے بچنے کا وسیلہ بھی پیدا کیا ہے، دونوں قوّتیں آمنے سامنے ہیں اور ہمیشہ ہیں۔

جس طرح شیطان کو قیامت تک مہلت دی گئی ہے (۷: ۱۴۔ ۱۵)، اسی طرح ہادیٔ برحق کو بھی موقع دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کرے اور اگر خدا کا فیصلہ یک طرفہ ہوتا وہ صرف بُرائی اور تاریکی کا وسیلہ مقرّر کرتا اور روشنی کا ذریعہ مہیّا نہیں کرتا تو خدا کی طرف سے نعوذ باللہ لوگوں پر ظلم ہوا ہوتا، یہ بات نہیں ہے، خدا کی ایک صفت عدل ہے کہ اُس نے دُنیا میں دونوں وسیلے برابر پیدا کئے ہیں، تو اِس لئے کل قیامت کے دن کوئی یہ عُذر اور معذرت پیش نہیں کرسکتا ہے کہ اُس کے زمانے میں کوئی وسیلہ نہیں تھا جب کہ خداوندِ عالم نے دُنیا کے اندر جسمانی پرورش کی کوئی چیز کبھی بھی کم نہیں کردی ہے، تو رُوحانی اور عقلی پرورش کی کوئی چیز کس طرح وہ کم کرتا ہے، تو خداوندِ عالم نے جس طرح دُنیا کی آبادی کے لئے سورج کو مقرّر کیا ہے، آسمان بنایا ہے اور دیگر چیزیں ہیں جو کہ گھاس پات، جن میں کہ جانوروں کی پرورش ہے کو مہیّا کرتے ہیں، یہ آسمان،

یہ سورج یہ بارش وغیرہ اور حالانکہ حیوان کا کام کتنا معمولی ہے تو خداوندِ عالم نے جب انسان کو پیدا کیا ہے اور اُس کو عقل جیسی ایک شریف چیز عطا کی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ کبھی عقلی غذا کا جو وسیلہ ہے اُس کو اُٹھایا جائے اور دُوسری بات یہ بھی ناممکن ہے کہ خدا بذاتِ خود فاعل ہو، ہر کام خود کرے، خود نہیں کرتا ہے کہ کبھی بھی رسولؐ کے بغیر دین نہیں ہے اور جس طرح رسولؐ کے بغیر دین نہیں ہے تو رسولؐ کا جانشین ہمیشہ موجود ہونا چاہیئے۔

بہرحال میرے خیال میں اِس میں نہ صرف سورۂ ناس کے سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے بلکہ اِس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے اور آپ جس قدر بھی اِس میں غور و فکر کریں گے اُس قدر اِس کے سمجھنے کی مہارت آپ میں پیدا ہو جائے گی۔ اُمید ہے کہ آگے چل کر ہم اِس کی کاپیاں بنائیں گے اور اِس کے علاوہ بھی ہمارے پاس بہت سے نقشے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہم پانچ پانچ نقشوں کی ایک کتاب بنائیں اور یہ سلسلہ شروع کریں کیونکہ میرے تجربے کے مطابق نقشوں کی مدد سے سمجھانا بہت عمدہ بات ہے اور بہت دلچسپ بھی ہے اور یہ ایک انقلابی چیز ہے، میرے دعوے کے مطابق یہ انقلابی چیز ہے، سوال بھی اسی پر مرتّب ہو سکتا ہے اور جواب بھی یہیں سے دیا جا سکتا ہے اور یہ ایک منظّم طریقہ ہے۔ اِن شاء اللہ جیسی جیسی آپ کی عادت ہو گی ویسی ویسی آسانی سے آپ اِس کو سمجھ پائیں گے۔ اَب میرے خیال میں سوالات کے لئے بھی کچھ ٹائم رکھیں۔ آپ قریب سے اِس کو دیکھنا چاہیں تو دیکھیں۔ یہ (Rough) ہے کسی قدر۔

ٹائپنگ: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ رحمٰن (۵۵) کی حکمتیں (حصۂ اوّل، آیت ۱ تا ۱۴)

کیسٹ نمبر: Q-9A   تاریخ: نومبر ۱۹۷۸، کراچی

آپ کے سامنے سورۂ رحمٰن کے بارے میں کچھ نکات بیان کریں [گے] اور سورۂ رحمٰن کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ حضرت مولانا علی علیہ السّلام نے سورۂ رحمٰن کا نام ’’عروسُ القرآن‘‘ بتایا ہے [لِکلِّ شیءٍ عروسٌ وعروسُ القرآنِ الرَّحمنُ، دُرِّ منثور، جلد: ۶، صفحہ نمبر: ۳۲۶]۔ عروسُ القرآن کا مطلب قرآن کی دُلہن ہے۔ اِس سے سورۂ رحمٰن کی بہت ساری معنوی خوبیاں مُراد ہیں، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ رحمٰن کی تاویل میں بہت ساری حقیقتیں ایسی ہیں جو کہ قرآن کے کسی حصّے میں نہیں ہیں۔ اِس لئے مولانا علی علیہ السّلام نے اِس سورے کو ’’عروسُ القرآن‘‘ کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ بے شک آپ جب سورۂ رحمٰن کی حقیقتوں کو سمجھنے لگیں گے تو یقین کریں گے کہ اِس کے اندر جو حکمتیں پوشیدہ ہیں، جو حقیقتیں بیان کی گئی ہیں وہ ایسی بنیادی حقیقتیں ہیں کہ [جس سے] حیات و کائنات کے بہت سے بھیدوں کا پتا ملتا ہے، اور اُس میں جن جن نعمتوں کا جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، قرآن کی کسی سورت میں ایسا بیان نہیں ملتا۔ اِس میں جنّ و اِنس کو ملا کر جو خطاب کیا گیا ہے اور جس طور سے اِرشادات کئے گئے ہیں، اُن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جنّ و اِنس [کے] ایک دُوسرے کے قریب ہونے کے علاوہ اُن کی تخلیق کا مقصد بھی ایک ہی ہے، اور جتنے اِرشادات ہوئے ہیں اور جو تعلیمات اِس کے اندر پیش کی گئی ہیں اُن کا اطلاق ثقلین پر ہوتا ہے اور ثقلین سے مُراد دو (۲) بڑی جماعتیں یعنی جنّ و اِنس۔ چنانچہ میں اِس کا آغاز کرتا ہوں یہ ایک چھوٹی سی تمہید تھی۔ اَب آپ قرآنِ مقدّس کی اِس سورت کی عبارت کو بھی سُن لیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں۔

اَلرَّحۡمٰنُ (۵۵:۱) عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ (۵۵:۲)۔ رحمٰن نے قرآن سکھایا یا کہ رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ (۵۵:۳) عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ (۵۵:۴)۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا، پھر اُس کو گویائی سکھائی یعنی اُس کو بولنا سکھایا۔ اَب اتنا کچھ ترجمہ کرنے کے بعد ہم اِس حصّے کے باطن میں جانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اور اُس کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رحمٰن نے قرآن کس کو سکھایا؟ کیونکہ جہاں پر قرآن سکھانے کا ذکر آتا ہے وہاں پر انسان کی تخلیق ابھی نہیں ہوئی ہے، انسان کے پیدا ہونے کا ذکر بعد میں آتا ہے، کیونکہ قرآن میں عبارت کے لحاظ سے، ربطِ الفاظ

کے اعتبار سے جو ترتیب ہوتی ہے وہ ترتیب حقیقی ہوتی ہے، اور صحیح ہوتی ہے۔ یعنی میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جس چیز کا ذکر پہلے آتا ہے وہ چیز پہلے ہوتی ہے اور جس چیز کا بیان بعد میں آتا ہے وہ ہر لحاظ سے بعد میں ہوتی ہے اور خصوصاً اِس سورت میں جب کہ انسان کی تخلیق کا ذکر آیا ہے، تو انسان کی تخلیق سے پہلے جس کو قرآن سکھایا گیا وہ انسان نہیں ہوسکتا وہ فرشتہ ہوسکتا ہے اور ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ خدائے رحمٰن نے سب سے پہلے قرآن جس فرشتے کو سکھایا اُس کا نام عقلِ کُل ہے۔

جب بھی خدائے قدّوس نے عقلِ کُل کو، عقلِ کُل کی طرح پیدا کیا تو اُسی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کو قرآن سکھایا، کیونکہ کسی آدمی کا کسی کو کچھ سکھانا اور خدا کا کسی کو کچھ سکھانا آسمان زمین کا فرق رکھتا ہے۔ خداوندِ حکیم نے جس معنی میں ایک عظیم فرشتے کو عقلِ کُل کی حیثیّت سے پیدا کیا اُس کو اُسی حیثیّت میں ایک ایسا زندہ قرآن بنایا جو کہ تمام آسمانی کتابوں کا سرچشمہ ہے، اور خدا کے کسی کو علم دینے یا سکھانے کے لئے کوئی دیر بھی نہیں لگتی ہے۔ جیسے ہی اُس نے اُس عظیم فرشتے کو ''کُن'' کے حکم سے پیدا کیا اور جس کے پیدا کرنے کے لئے لمحہ بھر بھی نہیں لگا، ایک لمحے کا وقت بھی اُس میں صَرف نہیں ہوا، اور اُسی کے ساتھ ساتھ وہ فرشتہ عقلِ کُل ہوا، عقلِ کُل یا کہ قلمِ الٰہی علم کا اوّلین سرچشمہ ہے۔ اِس بیان سے ایک طرف سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن قدیم ہے اور وہ عقلِ کُل میں ایک زندہ اور پایندہ سرچشمہ ہے، اور وہ اِس معنی میں علم کا ایک زندہ اور پایندہ سرچشمہ ہے، دُوسری طرف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا جب کسی کو علم عطا کرتا ہے تو اُس کے لئے کوئی وقت نہیں لگتا اور اِس میں تیسری حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قلم ایک زندہ حقیقت ہے۔ اِس کے بعد جو فرمایا گیا کہ انسان کو پیدا کیا اور اُس کو بولنے کی طاقت عطا کی، تو اِس کے تین (۳) معنی ہیں، ایک معنی میں اِس کا اطلاق عام انسانوں پر ہوتا ہے کہ خدا نے انسانوں کو پیدا کیا اُن کو بولنا سکھایا، دُوسرے معنی میں اِس کی مُراد انسانِ کامل ہے کیونکہ صحیح معنوں میں انسان وہی ہے۔ خدا کے فرمانے کے مطابق اُسی کو صحیح طرح سے بولنا اور بیان کرنا سکھایا گیا ہے، تیسرے معنی میں اِس کا اِشارہ عقلِ کُل کے بعد نفسِ کُل کی طرف ہے، کیونکہ ترقّی کے لحاظ سے عقلِ کُل کو حقیقی قرآن بنانے کے بعد نفسِ کُل کا بیان آنا چاہئے، چونکہ صحیح معنوں میں اوّلیّت کے لحاظ سے وہی انسان ہے، اور انسانی رُوحوں کا سمندر بھی وہی ہے اور یہاں عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵:۴) اُس کو بیان سکھایا سے مُراد بیان تاویل کو کہتے ہیں کہ اُس کو تاویل سکھایا۔ جب عقلِ کُل کو خدا نے عملی طور پر قرآن بنایا تو اِس کے بعد کے درجے کو قرآن کی تعلیم دی اور قرآن کی تعلیم سے یہاں علمِ تاویل مُراد ہے اور ویسے بھی اسماعیلی اصطلاحات میں بیان، تاویل کو کہتے ہیں۔ اِس کے بعد اِرشاد ہوتا ہے:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵:۵)۔ سورج اور چاند ایک ساتھ چلتے ہیں یا کہ سورج اور چاند کا ایک ہی حساب ہے۔ ظاہری لحاظ سے دیکھا جائے تو سورج اور چاند کا ایک حساب نہیں ہے، کہ سورج کا سال بڑا ہے اور چاند کا سال گیارہ دن [اُس سے] چھوٹا ہے اور سورج جس نظام سے چلتا ہے، سورج نہیں چلتا ہے لیکن ہم کہہ سکتے ہیں سورج چلتا ہے، اِس کے

مقابلے میں چاند جو ہے وہ آگے پیچھے ہوتا ہے لیکن کچھ مدّت کے بعد دیکھا جائے تو یہ دونوں حساب آپس میں ملتے ہیں، یہ ظاہری سورج اور ظاہری چاند کی بات ہوئی۔ اَب دین کے سورج اور چاند کی بات سنئے کہ [دین کے] سورج سے مُراد ناطق ہے، یعنی حضرت پیغمبرؐ اور چاند کا مطلب اساس ہے یعنی حضورؐ کے جانشین مولانا علیؑ۔ یہ تو عہدِ نبوّت کی بات ہوئی اور بعد کے زمانے میں سورج کی تاویل امامؑ ہیں اور چاند کی تاویل پیر یا کہنا چاہئے کہ حجّت یا حجّتِ اعظم یا باب کہنا چاہئے، تو یہ چار (۴) اُصول کا بیان ہوا سب سے پہلے عقلِ کُل کی بات آئی پھر نفسِ کُل کا ذکر ہوا، اُس کے بعد ناطق کا تذکرہ ہوا اور آخر میں اساس کا ذکر آیا یا یوں کہنا چاہئے کہ پہلے دو (۲) رُوحانی حدوں کا ذکر ہوا اُس کے بعد دو (۲) جسمانی حدوں کا بیان ہوا۔ اُس کے بعد اِرشاد ہوتا ہے:

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (۵۵:۶)۔ اور بیلیں اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔ نجم کے دو (۲) معنی ہیں، ستارے کو بھی کہا جاتا ہے اور اُن اُگنے والی چیزوں کو بھی کہا جاتا ہے جو دُوسرے پودوں کی طرح کھڑی نہیں ہوسکتی ہیں، وہ لیٹ جاتی ہیں اور اگر قریب میں کوئی جھاڑ ہے، درخت ہے تو اُس سے لپٹ لپٹ کر اُوپر کو چڑھتی ہے، اُن چیزوں کو بیلیں کہا جاتا ہے، تو اِس اِرشاد کے بعد دو (۲) قسم کی اُگنے والی چیزوں کا کیوں ذکر ہوا؟ کہ اُن میں سے ایک قسم کی چیزیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجاتی ہیں جیسے درخت اور جھاڑ وغیرہ اور دُوسری اُگنے والی چیزیں ایسی ہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوسکتی ہیں۔ اِس میں ایک خوبصورت تاویل ہے، وہ یہ کہ پیغمبر اور امام علیہما السّلام کے بعد مومنین کی دو (۲) قسمیں ہیں، مُرید دو (۲) قسم کے ہوتے ہیں، کچھ مُرید کمزور ہوتے ہیں علم اور عبادت وغیرہ کے لحاظ سے اور دُوسرے مومنین جن کو حدودِ دین کہا جاتا ہے وہ طاقتور ہوتے ہیں، [یعنی] جو پیر ہوئے، داعی ہوئے، حجّت ہوئے وغیرہ، تو یہ اِشارہ ہے کہ جس طرح بیلیں آس پاس کی جھاڑیوں سے لپٹ کر کھڑی ہوجاتی ہیں، پھلتی ہیں، پھولتی ہیں اِسی طرح جو کمزور مُرید ہیں اُن کا دارومدار اُن کا قیام و بقا حدودِ دین پر ہے یعنی پیر بزرگ ہی ہیں جو پیغمبرؐ اور امامؑ کے بعد مُریدوں کی مدد کیا کرتے ہیں علمی طور پر عرفانی طور پر اور دین شناسی و خدا شناسی کے سلسلے میں۔ پیر بزرگ مُریدوں کی ایسی مدد کیا کرتے ہیں جس طرح کہ اپنے آپ کھڑے ہونے والے درخت یا کہ جھاڑ بیلوں کی مدد کیا کرتے ہیں، ورنہ اگر ہم اِس کو ستارہ اور درخت کہیں تو یہ مناسبت ٹھیک نہیں لگتی اور ترجمہ کرنے والوں نے بھی اِن دونوں کو اُگنے والی چیزوں میں سے لیا ہے۔

اِس کے بعد اِن دونوں اُگنے والی چیزوں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے، تو اِن کا سجدہ کرنا یہ ہے کہ حدودِ دین اور اِن کے ماتحت مُرید اطاعت کرتے ہیں، تاویلات میں جہاں بھی آپ دیکھیں، جہاں بھی جائیں سجدہ کے معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ آدمؑ کے لئے جن فرشتوں نے سجدہ کیا تھا اور جس ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تھا اِس میں تاویلی بات فرمانبرداری اور نافرمانی کی بھی ہے۔ تنزیل کے اعتبار سے ہم اِس کو سجدہ کے معنوں میں لے سکتے ہیں، لیکن تاویل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سجدہ کے معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ ویسے بھی اِس عبارت سے اگر ہم درخت مُراد لیں تو

درخت اور نباتات اطاعت کرتی ہیں خدا کی، یعنی جس مقصد کے لئے اِن چیزوں کو پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد اِن سے پورا ہو جاتا ہے، یہ اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آسمان و زمین کی کوئی شئ نہیں ہے جو خدا کے لئے سجدہ نہیں کرتی ہو لیکن اِس سے وہ سجدہ مُراد نہیں ہے جو ایک انسان کرتا ہے بلکہ اِس سے اطاعت و فرمانبرداری مُراد ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ درخت جب ہَوا سے جُھک جاتا ہے تو یہ اُس کا سجدہ ہے، پھر کہنے لگے کہ جب سورج صبح مشرق کی طرف سے نکلتا ہے تو درخت کا چھاؤں [سایہ] مغرب کی طرف پڑتا ہے اور جب سورج ڈوبنے کو جاتا ہے تو درخت کا چھاؤں [سایہ] مشرق کی طرف پڑتا ہے، اِس سے لوگوں نے درخت کے سجدہ کرنے کے معنی کئے، لیکن اگر اِن چیزوں کو ہم درخت کا سجدہ قرار دیں تو وہ بھی اطاعت و فرمانبرداری کے معنی میں صحیح ہے، درست ہے کہ خدا نے درخت کے اندر لچک پیدا کی ہے اِس لئے ہَوا کے جھونکے سے درخت کی شاخیں جھک جاتی ہیں اور سورج کی روشنی سے سایہ پڑتا ہے، یہ اِس کی فطری اطاعت ہے، جبری اطاعت ہے، اختیاری نہیں، کیونکہ آپ جانتے ہیں اطاعت کم سے کم دو (۲) قسم کی ہُوا کرتی ہے، ایک اختیاری ہے اور ایک [فطری یا جبری] اور دوسری چیزوں کا یہ سجدہ اختیاری نہیں بلکہ فطری اور جبری ہے، قانونِ قدرت اُن کو مجبور کرتا ہے۔ یہ آپ کے اُس سوال کا جواب ہے شاید کہ آپ پوچھتے کہ اگر آسمان و زمین کی ساری چیزیں آپ کے کہنے کے مطابق سجدہ کرتی ہیں تو خدا کی بہت بڑی بندگی ہوئی اور خدا کی بندگی پر اِن تمام چیزوں کو اَجر و صلہ ملنا چاہئے۔ آیا یہ ممکن ہے کہ ہر چیز کو اِن سجدوں کے نتیجے میں کوئی اَجر و صلہ ملا کرے، تو اِس کے لئے جواب دیا گیا کہ نہیں، اَجر و صلہ جبری اطاعت و فرمانبرداری پر نہیں ملا کرتا۔ آپ بیل کو ہل میں جوتتے ہیں اور گھوڑے سے سواری کا کام لیتے ہیں یہ جبری ہے، اختیاری نہیں ہے۔ ثواب وہاں پر ملتا ہے جہاں اختیار ہو، شناخت ہو اور سوچ سمجھ کر نیّت سے کام کیا جائے اور رسولِ اکرمؐ نے ایک مختصر سی حدیث میں اعمال کے سلسلے میں فرمایا ہے: کہ [اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ] اعمال نیّات سے بنتے ہیں۔ نیّت کے بغیر کوئی عمل نہیں بنتا، تو نیّت ایک خاصہ ہے ایک صلاحیّت ہے انسان کی، اور خصوصاً مومن ہی پوری شرائط کے ساتھ نیّت کر سکتا ہے، جو معرفت کی روشنی میں ہونی چاہئے تب ہی تو کسی کو اَجر و صلہ ملنے کی اُمید ہوتی ہے، ورنہ خواہ مخواہ کے سجدوں سے، اور یہاں پر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ آج جو لوگ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ جیسے اسلامی آداب کے کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ سارا ثواب اُن ہی کو ملنے والا ہے، لیکن قرآن اُن کے اِس دعوے کی تصدیق نہیں کرتا۔ اعمال کی بنیاد نیّت پر ہے جو کہ معرفت کی روشنی میں ہونی چاہئے، نہیں تو وہ سجدے بھی ایسے ہو سکتے ہیں جیسے درخت کے سجدے اور دیگر کائنات کی چیزوں کے سجدے۔ اَب آگے بڑھئے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵:۷)، (اور اسی نے آسمان کو) بلند کیا اور ترازو رکھ دی۔ اِن الفاظ کے ربط کو دیکھیں تو آپ کو عجیب لگے گا کہ ایک تو آسمان کو بلند کیا گویا پہلے وہ پست تھا یعنی اُس کو پستی سے اُٹھا کے آسمان بنایا اور

دُوسری یہ بات کہ ترازو رکھی، اِس تذکرے میں آسمان کے ساتھ ترازو کی کیا مناسبت؟ یہ ظاہر کی بات ہوئی جب تک ہم اِس کی تاویل میں نہ جائیں گے تو ہم کو اطمینان نصیب نہیں ہوگا، وہ یہ کہ بے شک رُوحانیت کے آسمان کو پستی سے اُٹھا کے بلند کیا، اور ترازو زمین پر نہیں آسمان کی بلندیوں میں رکھی، یعنی کسی شخصیّت کو رفتہ رفتہ انسانِ کامل کا درجہ دیا وہ شروع میں مُریدوں کی صفّ میں تھا جو زمین تھا لیکن اُس کو آسمانِ رُوحانیت پر بلند کیا اُس کو رُوحانیت کے آسمان کا درجہ عطا کیا اور علم وحکمت کا معیار جس کا نام یہاں ترازو ہے اُسی آسمانِ رُوحانیت میں رکھا یہ [کہ] وہی تولے اور وہی پرکھے، علم کی چیزوں کو تول تول کے وہی دے اور علم کا حساب کتاب بھی وہی کرے۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (۵۵:۸)۔ تاکہ تم ترازو میں کمی بیشی نہ کرو۔ ظاہری طور پر دیکھا جائے تو اِس اِرشاد سے تعجّب ہوتا ہے کہ خدا نے ترازو آسمان کی بلندیوں میں اُٹھا کر رکھی اور زمین والوں کے ہاتھ میں نہیں دی تاکہ زمین والے اِس میں کمی بیشی نہ کریں اِس کا ظاہری مطلب اِس طرح سے ہوتا ہے، لیکن حکمت کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی بات صحیح ہے کہ دین میں پیغمبر، امام، حجّت، پیر جو آسمانِ رُوحانیت ہیں اُن ہی کے ہاتھ میں علم کی کسوٹی دے رکھی تاکہ وہی ہم کو حق اور باطل کی باتیں بتلائیں اور یہ معیار، یہ کسوٹی اور یہ ترازو عام لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دی تاکہ اِن سے کمی بیشی نہ ہو جائے۔ پھر اِرشاد ہوتا ہے: وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (۵۵:۹)۔ تم وزن کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو، تول کو گھٹاؤ مت۔ یہ اِسی مطلب کی وضاحت ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کے بعد جو اعلیٰ درجے کے حجّت، پیر وغیرہ ہیں اُن کے سپرد کی گئی ترازہ تاکہ وہ ٹھیک تولیں اور تاکہ مُریدوں سے اِس معاملے میں غلطی اور کمی بیشی نہ ہو۔ یہ آسمانِ رُوحانیت کی باتیں ہوئیں۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵:۱۰)۔ (زمین کو اُس نے سب مخلوقات کے لیے بنایا)، آسمانِ رُوحانیت کو تو حدودِ علوی کے لئے خاص کر دیا اور ترازہ بھی وہاں رکھی لیکن زمین کو سب لوگوں کے لئے بنائی۔ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ (۵۵:۱۱)۔ اُس زمین کے اندر یعنی زمینِ رُوحانیت کے اندر میوے ہیں کھجور ہیں جو غلاف میں ہوتی ہیں۔ یہاں پر ایک اہم بات یہ بتانے کی ہے کہ جو رُوحانیت کا آسمان ہے وہ پیغمبر امامؑ اور اُن کے اعلیٰ درجے کے حدود کے لئے خاص ہے اور جو رُوحانیت کی زمین ہے وہاں تک سب لوگ بلا فرق مذہب جا سکتے ہیں۔ یعنی رُوحانیت کی جو زمین ہے اُس تک سب لوگ پہنچ سکتے ہیں، مگر رُوحانیت کے آسمان پر صرف پیغمبر اور امامؑ اور اُس کے حدود پھر اُن کے بعد مومنین جا سکتے ہیں یہ فرق ہے، یہاں پر آپ کے بہت سے سوالات کے لئے جواب موجود ہے۔ آپ کبھی کبھار یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ دُنیا کے فلان فلان سادھو نے، فلان درویش نے اور فلان صوفی نے رُوحانیت کی باتیں کی اور اُس نے روشنی دیکھنے کی بات کی، صحیح ہے! امامؑ نے بھی فرمایا ہے حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ روشنی سب دیکھتے ہیں [اسلام میرے مورثوں کا مذہب، صفحہ:۶] سب مذہب والے روشنی دیکھتے ہیں یعنی وہ زمینِ رُوحانیت تک تو

پہنچ سکتے ہیں، لیکن آسمانِ رُوحانیت کی طرف وہ جا نہیں سکتے ہیں، آسمان کے دروازے نہ کھلنے کا ذکر ہے قرآن میں (۷:۴۰)، ایسا نہیں ہے کہ کوئی رُوحانیت میں نہیں جاسکتا ہے، رُوحانیت میں سب جاسکتے ہیں مگر [ایک] حد ہے۔

میں قرآن کی زبان میں آپ کو بتاؤں، مختلف الفاظ میں ہے وہ حد، کبھی تو کہا گیا ہے کہ اُن کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے (۷:۴۰) کبھی تو یہ فرمایا گیا ہے کہ آسمانِ اوّل پر کچھ محافظت کا انتظام ہے (۴۱:۱۲، ۶۷:۵) وہاں پر بہت سے چراغ رکھے ہوئے ہیں وہ آسمانِ اوّل پر چراغ اِس لئے ہیں کہ جب شیاطین آسمان کی بلندیوں کی طرف اُڑنا چاہتے ہیں اور اُڑتے بھی ہیں تو اُس وقت آسمانِ اوّل پر جو چراغ ہیں جن کا کام ہے کہ اُن لوگوں کو روکیں جو آسمانِ رُوحانیت کے اہل نہیں ہیں، تو اُس وقت جب شیاطین وغیرہ رُوحانیت کی بلندیوں میں اُڑنے لگتے ہیں تو وہ چراغ اِن پر شعلے برساتے ہیں، جس سے کہ وہ رُوحانیت کی بلندیوں کی طرف پرواز نہیں کرسکتے ہیں۔ یہ اِرشاد اگرچہ شیاطین کے عنوان سے ہے لیکن اِس میں وہ سب لوگ مُراد ہیں جو امامؑ کی شناخت کے بغیر ہیں، جو امامؑ کی شناخت کے بغیر ہیں، جن کو امامؑ کی امامت کا اقرار نہیں ہے تو وہ لوگ شیاطین میں حساب [رُشمار] ہیں، اِس لئے اُن کو یہ چراغ مار بھگاتے ہیں اُن پر شعلے برساتے ہیں یہ فرق ہے۔

اَب اِس سے یہ فیصلہ ہوا کہ رُوحانیت کی زمین تک ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، زرتُشت اور دیگر مذاہب والے جاتے ہیں اور وہاں کی روشنیوں کو دیکھ کے کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کے جلال و جمال کو دیکھا، ہم نے نور کو دیکھا، ہم نے روشنی دیکھی، ہم نے یہ دیکھا، ہم نے وہ دیکھا، تو سُنا آپ نے کہ گمراہی کے سامان کس قدر فراوان ہیں، کتنے مضبوط ہیں۔ شیطان کے اسباب کہاں سے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں، گمراہی کی حدود کس قدر وسیع ہیں یعنی جس طرح ہم اِس دُنیا کے اندر مومن کافر سب مل جُل کر اِس دُنیا کے اندر سیارۂ زمین پر رہتے ہیں اِسی طرح زمینِ رُوحانیت پر بھی سب ہی مل جُل کے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ رُوحانیت کا آسمان جب آتا ہے تو وہاں سے امتیاز اور فرق پایا جاتا ہے کہ مومنین اُوپر کی طرف پرواز کرتے ہیں فرشتوں کے نام سے اور دُوسرے لوگ شیاطین کے عنوان سے مارے جاتے ہیں، غیر کا نام شیاطین ہے اور مومنین کا نام رُوحانیت میں فرشتہ ہے، تو چونکہ یہاں زمینِ رُوحانیت کا ذکر آیا تھا اِس لئے لازمی تھا کہ میں آپ کو بتاؤں کہ زمینِ رُوحانیت کی کیا تعریف ہے اور اُس میں کون کون سے لوگ پہنچ سکتے ہیں وغیرہ، تو یہاں پر اِرشاد ہے کہ خلائق کے لئے جس طرح یہ زمین مشترک ہے، سب کے لئے عام ہے اِس طرح رُوحانیت کی زمین بھی سب کے لئے عام ہے، لیکن آسمانِ رُوحانیت خاص ہے۔ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَكۡمَامِ (۵۵:۱۱) اِس کا ذکر ہوا کہ اِس میں پھل ہیں اور کھجوریں جو خوشوں میں ہوتا ہے۔

وَالۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ وَالرَّيۡحَانُ (۵۵:۱۲) اور دانے ہیں یعنی غلّہ ہے جو بھوسہ کے ساتھ ہوتا ہے، اور بغیر بھوسہ کے

بھی ہوتا ہے۔ غلّے کو دیکھا جائے تو وہ دو (۲) قسم کا ہوتا ہے، کچھ میں بھوسہ ہوتا ہے کچھ میں پھول ہوتا ہے۔ بہر حال غلّے کی اِن دو (۲) قسموں سے مُراد یہ ہے کہ زمین رُوحانیت پر جو کچھ پایا جاتا ہے اُس میں سے کچھ چیزیں تاویل طلب ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کو اِس طرح سے لے کر فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، جس طرح کہ غلّے کی اِن دو (۲) قسموں میں سے جن میں بھوسہ ہوتا ہے تو اُن کو دقت سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵:۱۳)۔ پھر تم دونوں یعنی جنّ و اِنس اپنے ربّ کی کس کس نعمت کو جھٹلاتے ہو۔ جیسا کہ میں نے تمہید میں بتایا تھا کہ سورۂ رحمٰن کے اندر جو اِرشادات ہوئے ہیں اُن کا تعلّق جنّ وانس دونوں اُمتّوں سے ہے۔ اللہ کے اِس اِرشاد سے یوں لگتا ہے کہ شروع سے لے کر یہاں تک جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس میں نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، جن کا احساس دلایا جاتا ہے، جن کی طرف توجّہ دلائی جاتی ہے اور یہ نعمتیں نہ صرف انسانوں کے لئے ہیں بلکہ جنّات کے لئے بھی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم نے توجّہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ اے گروہِ جنّ وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی اِن نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاتے ہو۔ اِس سے یوں لگتا ہے کہ جنّ بھی ایک رُوح ہے وہ تو محض ایک نام ہے وہ شاید کبھی انسان تھا۔ یہ الگ موضوع ہے کہ آپ کبھی جنّ کے موضوع پر کچھ ریسرچ کریں قرآن کی روشنی میں، میں نے اِس کا ایک خاکہ دیا ہے ''سوسوال'' کے اندر جو دو (۲) حصّے جس کے شائع ہو چکے ہیں اور دو (۲) حصّے آرہے ہیں کیونکہ ہم سے جنّات پر سوالات کئے گئے تھے [سوسوال، حصّہ اوّل، سوال: ۱۷، صفحہ: ۳۵]۔

اِس لئے میں نے جنّ یا کہ جنّات کے بارے میں اہم باتیں کہیں ہیں اور چونکہ آپ کو رُوح کی شناخت حاصل کرنی ہے اور چونکہ آپ نے قرآن پر ریسرچ کرنا ہے، وہ جو زمانہ گزر چکا وہ تو گزر چکا اب کا زمانہ بہت ہی روشنی کا زمانہ آنے والا ہے اُس میں بنیادی حقیقتوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ کے سامنے کوئی معیار نہیں ہے کہ آپ کسی کو دیکھ کے کہیں گے کہ ہم نے اتنی ترقّی کر لی چونکہ آپ کے زمانے نے بہت ترقّی کر لی ہے اُس کے مطابق آج کل کوئی معیار ہی نہیں، تو آپ کے زمانے کا جو معیار ہے بہت ہی بلند ہونے والا ہے۔ لہٰذا اِس نصبُ العین کے مطابق آپ نے دین کی باتیں سیکھنی ہیں، اِس لئے آپ نہ صرف انسان پر ریسرچ کریں بلکہ جنّات پر بھی ریسرچ کریں، سوالات کریں اور آپ کے لئے بہت سی باتیں فراہم ہو جائیں گی، تو خداوندِ عالم نے چونکہ اِس سورے کے اندر جنّ کو اور اِنس کو دونوں کو ملا کر خطاب کیا ہے اور نعمتوں کے سلسلے میں بھی دونوں کو ایک ساتھ توجّہ دلائی ہے کہ تم دونوں اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، تو جھٹلانے کا ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جھٹلانے کا کیا مطلب ہے؟ جھٹلانا کس کو کہتے ہیں؟ آپ کو تعجّب ہوگا جو میں وضاحت کروں ہو سکتا ہے کہ فی الحال تعجّب ہو لیکن آگے چل کر تعجّب نہیں ہوگا۔ تعجّب ایک بار دو بار تین بار ہوتا ہے، ہمیشہ تعجّب نہیں رہتا ہے، وہ یہ کہ کسی چیز کی حقیقت نہ سمجھنے کو کہتے ہیں جھٹلانا اور کسی چیز کو بنیاد سے سمجھنے کو کہتے ہیں تصدیق کرنا، اِسی طرح خدا کو

جھٹلانا پیغمبر کو جھٹلانا یہ ہے کہ کوئی خدا کو نہ پہچانے پیغمبر کو نہ پہچانے اور قرآن کو جھٹلانا یہ ہے کہ قرآن کی حقیقتوں کو نہ سمجھے اور نعمتوں کو جھٹلانا یہ ہے کہ نعمتوں کی حقیقت کو نہ سمجھے۔

اگر جنّ و اِنس سب خدا کی نعمتوں کو پہچانتے اور پہچانتے ہوئے، پہچاننے کی صورت میں نعمتوں کی تصدیق کرتے تو خدا یہ نہ فرماتا کہ تم انسان اور جنّات اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے اور دیکھئے کہ ربّ کے اِرشاد میں جنّات کو اگر غذائیں نہ ملتی تو خدا اُن سے نہ فرماتا کہ تمہارا ربّ تمہارے ربّ کی نعمتیں، ربّ تو پالنہار کو کہتے ہیں، ربّ اُس کو کہتے ہیں جو تربیت کرتا ہے، جو پرورش کرتا ہے، شیطان نے بھی مایوس ہونے کے باوجود ربّ کہا تھا (۳۶:۱۵)، شیطان کے قیام و بقا کے لئے بھی کوئی قوّت چاہئے، اِس قوّت کے قیاس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ شیطان کو جو غذا ملتی ہے وہ بڑی گندی ملتی ہے، گندی نہیں ملتی ہے۔ دُنیا میں جو رزق ملتا ہے سب کو برابر ملتا ہے، ایک شخص اُسی رزق کو کھا کر نافرمانی کرتا ہے ایک اُسی کو کھا کر عبادت کرتا ہے یہ فرق انسانوں کے وجود کے اندر ہے، غذا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خدا شیطان کو بھی وہی غذا دے جو فرشتوں کو دیتا ہے یا رُوحوں کو دیتا ہے، تو ربّ کی تشریح کرتے کرتے ایک اہم پوائنٹ پر گئے، یہ بھی آپ کے لئے ضروری ہے۔ جب ہم کام کرنے کے لئے اور باتیں کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو ہمارے چاروں گرد میں وضاحتیں ہی وضاحتیں نظر آتی ہیں یعنی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہر بات کی وضاحت کریں تاکہ اچھی طرح سے مطلب ذہن نشین ہوجائے اور اپنے عزیزوں کو اِس سے فائدہ ملے، تو جنّات اور انسانوں کو ایک ساتھ مخاطب کرنے کا بیان تھا۔ اِس کے بعد:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۱۴:۵۵)۔ خداوند نے خالق یکتا نے انسان کو ایسی مٹّی سے پیدا کیا جو کہ ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ جس مٹّی سے انسان پیدا ہوا تھا، اُس مٹّی کا ایسا ہونا ضروری تھا کہ ہاتھ سے بجائیں تو وہ بجے اور اِس کی مثال یوں ہے کہ کہیں کوئی سیلاب آیا ہو یا کسی جگہ پر پانی بہہ گیا ہو اور اُس مقام پر مٹّی سے گارا ہوا ہو، اور پھر وہ سوکھ کر اور اُس میں شگاف پڑ پڑ کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے ہوں اور اُن میں سے ایک ٹکڑے کو کوئی اُٹھائے اور انگلی سے بجائیں، ناخن سے بجائیں تو وہ ٹِک ٹِک کی آواز سے بجتی ہو جس طرح کسی پیالے کو بجانے سے [وہ] بجتا ہے، چینی کے برتن کو بجانے سے [وہ] بجتا ہے، ایسی آواز پیدا ہوئی ہو، تو کیا ضرورت تھی کہ خدا ہم کو ایسی باتیں بتلاتا ہے جن کو انسان نہیں سمجھتا ہے کیا یہ کہنا کافی نہیں تھا۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ رحمٰن کی حکمتیں (حصّۂ دوم) (آیت ۱۴ تا ۴۳)

کیسٹ نمبر: Q-9B تاریخ: نومبر ۱۹۷۸ء، کراچی

Click here for Audio

سورۂ رحمٰن کے سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کریں گے، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ کی توجّہ ہی سے اور آپ کی رُوحانی کشش سے ہماری کلاس زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوسکتی ہے، اور جس قدر آپ زیادہ توجّہ دیں گے اور جتنی زیادہ آپ میں رُوحانی کشش ہوگی اُتنی زیادہ اِس میں کامیابی ممکن ہے۔ بہرحال ہم اُسی مقام سے شروع کرتے ہیں، یعنی اُسی آیت سے جہاں تک ہم گزشتہ کلاس میں تشریح کرتے کرتے پہنچ چکے تھے اور وہ آیۂ شریفہ یہ تھی: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ(۱۴) وَخَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ(۱۵) فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ(۱۶) اُس نے انسان کو ایسی مٹّی سے بنایا جو کہ وہ گارے کی شکل سے خشک ہو کر ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی اور اُس نے جنّات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔ اِس میں انسان کی تخلیق کے بارے میں کچھ وضاحت پہلے بھی ہو چکی تھی اور سوال ہوا تھا کہ اِس اِرشاد کا کیا مقصد، جو فرمایا جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو بجنے والی خشک مٹّی سے پیدا کیا، تو اِس کا مقصد ایک رُوحانی کیفیت کی طرف اِشارہ ہے، یعنی اِس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی دانشمند اِس کی تاویل میں جائے، تاویل میں جانے کا بہانہ یہ ہوتا ہے کہ یہ کیوں فرمایا گیا اور اِس کی ضرورت کیا تھی کہ انسان کو ایسی مٹّی سے بنایا گیا کہ وہ ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی تھی اور میں نے ایسی مٹّی کی وضاحت یہ کی تھی کہ جب زمین پر کہیں سے پانی آتا ہے یا سیلاب آتا ہے اور پانی کی شکل مٹّی کی شکل ایک طرح سے گارے کی طرح ہوتی ہے پھر اُس کے بعد وہ زمین خشک ہو جاتی ہے تو پھر زمین کی سطح پر جو گارا ہوتا ہے اُس میں شگاف پڑتے ہیں اور گِل یعنی گارے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور اُن میں سے ایک ٹکڑے کو اُٹھا کے اُنگلی سے بجائیں تو وہ بجتی ہے۔ خدا نے ظاہر میں اِس طرح سے فرمایا، ایسا تصوّر دیا لیکن تاویل ہی اِس سوال کے جواب کو مہیّا کر دیتی ہے کہ رُوحانیت کا ایک مقام ہے، رُوحانی تخلیق کی ایک منزل ہے جہاں پر ایک آواز آتی ہے، وہ صورِ اسرافیل کے بجنے سے شروع ہو جاتی ہے اور بہت دیر تک وہ آواز قائم اور باقی رہتی ہے۔ وہ آواز کچھ کان کے بجنے کی طرح ہے، یہ اِشارہ ہے کہ رُوحانی تخلیق وہیں سے شروع ہو جاتی ہے، وہ آواز کسی چینی کے پیالے کے بجنے کی آواز کی طرح ہے یا (Silver) کے یعنی چاندی کے یا سونے کے کسی پیالے کے بجانے سے جو آواز باریک ولطیف پیدا

ہوتی ہے اُس کی طرح ہے، وہ رُوحوں کی تسبیح کی آواز ہے، وہ رُوحوں کے ذرّات کے بجنے کی آواز ہے اور وہ صورِ اسرافیل کی آواز ہے۔

یہاں پر ایک سوال کریں گے وہ یہ کہ یہ کیوں فرمایا جاتا ہے انسان کی تخلیق کے بارے میں کہ انسان کو مٹّی سے پیدا کیا گیا پھر فرمایا جاتا ہے کہ انسان کو پانی کے قطرے سے پیدا کیا گیا(۱۶:۴،۲۵:۵۴) نیز اِرشاد ہوتا ہے کہ انسان کو خونِ بستہ سے پیدا کیا(۹۶:۲)، انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا(۲۳:۱۴)، انسان کو فلان چیز سے پیدا کیا، انسان کو اِس سے پیدا کیا، انسان کو اُس سے پیدا کیا۔ آپ قرآن کے فلسفے میں جائیں گے یا قرآن کا سادہ مطالعہ کریں گے تو آپ کو بہت سی چیزیں ملیں گی جن سے انسان کے پیدا کئے جانے کا ذکر آتا ہے، یہ کیوں ایسا ہے؟ یہاں تک کہ قرآن میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ انسان کو کسی شئ کے بغیر پیدا کیا گیا ہے(۷۶:۱) یعنی انسان کو لاشیئت سے پیدا کیا گیا۔ غرض یہ کہ کبھی انسان کی تخلیق کا آغاز مٹّی سے ہوتا ہے تو کبھی پانی سے کبھی خون سے اور کبھی لاشیئت سے۔ جیسا کہ سورۃ ''ھَلۡ اَتٰی'' میں ذکر آیا ہے کہ:

ھَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّھۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا(۷۶:۱) کیا انسان پر وہ زمان بھی آیا ہے جس میں کہ انسان کچھ بھی نہیں تھا، انسان کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس کا ذکر ہو سکے، جس کا کوئی نام بتا دیا جائے، تو اِس سوال کا جواب کیا ہونا چاہئے؟ وہ سوال یہ کہ بہت سی چیزوں کا نام لیا گیا ہے اور جس میں لاشیئت بھی ہے، کہ انسان فلان فلان فلان چیز سے پیدا کیا گیا۔ اِس کا واحد جواب یہ ہے کہ یہ انسان کی تخلیق کے مراحل کی نشاندہی ہے، جاننے والا یہ جانتا ہے کہ انسان کی شخصیّت کی تخلیق بہت سی منزلوں سے گزرتی چلی جاتی ہے، یہ درست ہے کہ انسان کو مٹّی سے پیدا کیا گیا اور یہ بھی صحیح ہے کہ انسان کو پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیا گیا لیکن اِس میں یہ بات سلسلہ وار ہے کہ پہلے مٹّی کی بات ہے اور پھر پانی کی بات ہے اور اُس کے بعد خون کی بات ہے، غرض یہ کہ یہ تخلیق کے مختلف مراحل ہیں اور جہاں فرمایا گیا ہے کہ انسان کو کسی شئ کے بغیر پیدا کیا گیا یعنی انسان وہاں سے پیدا ہوا جہاں پر کہ کوئی چیز نہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ انسان کی تخلیق کا آغاز وہاں سے ہوا جہاں پر کہ کوئی چیز نہیں ہے تو یہ مرحلہ سب سے پہلے آتا ہے۔

مقصد اِس کا یہ ہوا کہ ایک تخلیق کے بعد دُوسری تخلیق پھر تیسری تخلیق تو انسان ہمیشہ تخلیق کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور یہ شخصیّت کے اعتبار سے ہے، جہاں انسان کی ایک ازلی حقیقت ہے جس پر کہ تخلیق کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، یعنی انسان کی رُوحانی حقیقت تو اُس پر البتہ تخلیق کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ کی سلطنت کے دو(۲) مقام ہیں، ایک مقامِ امر ہے اور دوسرا مقامِ خلق۔ جیسا کہ اِرشاد ہوا ہے کہ: اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ(۷:۵۴) فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ(۲۳:۱۴) آگاہ رہو کہ خلق بھی اُسی کا ہے اور امر بھی، یعنی عالمِ امر اور عالمِ خلق یہ دونوں خدا کے ہیں، اِن دونوں عالموں میں یہ فرق ہے کہ جو عالمِ امر ہے وہاں تخلیق نہیں ہے وہ عالمِ رُوحانی ہے، اُس میں جو کچھ ہے وہ ہمیشہ سے

ہے اور جو عالمِ خلق ہے اِس میں تخلیق ہوتی رہتی ہے، عالمِ امر کو نیستی بھی کہا گیا ہے کیونکہ وہاں کوئی مادّی چیزیں نہیں ہیں۔ بہرحال اَب آیئے آیت کی قریبی وضاحت کریں کہ انسان کو ایسی مٹّی سے پیدا کیا گیا کہ وہ مٹّی ٹھیکرے کی طرح بجنے والی تھی تو اِس میں انسان کی شخصیّت کی تکمیل کی بات ہے کہ وہ کس طرح رُوحانیت میں ترقّی کرتا ہے اور اُس پر رُوحانیت کے مراحل کس طرح سے گزرتے ہیں۔ اِس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ: وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵) اور جنّات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا، یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان کو صرف ایک عنصر سے پیدا کیا گیا اور جنات کو بھی صرف ایک ہی عنصر سے پیدا کیا گیا اور انسان کا عنصر مٹّی بتایا گیا اور جنّات کا عنصر آگ بتایا گیا، ہم اِس کو کس طرح سے سمجھیں، حالانکہ کسی ایک عنصر سے کوئی تخلیق نہیں ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کی تخلیق میں چار (۴) عناصر ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہاں پر صرف ایک عنصر کا نام لیا گیا ہے۔ اِس قیاس سے، اِس دلیل سے یہ ممکن ہے کہ جنّ بھی صرف آگ ہی سے نہ ہو، بلکہ اِن دونوں مخلوق کی تخلیق کے سلسلے میں ایک ایک عنصر کے نام بتانے کی کوئی وجہ ہو اور یہی بات صحیح ہے، کہ اگرچہ انسان چار (۴) عناصر سے پیدا کیا گیا لیکن اُس میں جو پستی کا خاصہ ہے، جو عاجزی ہے یا جو کمزوری ہے اُس کی وجہ سے اُس کی تخلیق میں سے کسی عنصر کا یعنی مٹّی کا نام لیا گیا اور جنّات میں جو سرکشی کا عنصر غالب ہے، تو اِسی عنصرِ غالب کی بناء پر آگ کو جنّات کی تخلیق کا بُنیادی عنصر قرار دیا۔ نیز اِس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس طرح آگ کا شعلہ لطیف ہے اور تھوڑی دیر کے بعد شعلہ غائب ہو جاتا ہے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اِسی طرح مخلوقِ لطیف کو کہ وہ [جو] پوشیدہ ہے جنّ کہا اور اُس کی مثال شعلے سے دی گئی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ شعلے کے دو (۲) مقام ہیں شعلے کی دو (۲) حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ شعلہ نظر آتا ہے اور دُوسری حیثیّت یہ کہ شعلہ نظر نہیں آتا۔ ٹیبل لیمپ پر آپ تجربہ کر سکتے ہیں اگر ڈیڑھ اِنچ کا شعلہ ہے تو وہ نظر آتا ہے اور عین اُسی جگہ پر آپ اُنگلی سے یا کاغذ سے تجربہ کریں جہاں پر کہ شعلہ نظر نہیں آتا وہاں پر بھی شعلہ ہے۔ کاغذ کے ٹُکڑے کو لیمپ کے اندر ڈال کر شعلے سے ایک اِنچ اُوپر ذرا رکھ کے دیکھیں وہاں شعلہ ہے یا نہیں ہے، شعلہ ہے لیکن لطیف ہے، بے رنگ ہے، نظر نہیں آتا۔ اِسی طرح جنّات کی دو (۲) حیثیتیں ہیں، وہ دکھائی دیتے بھی ہیں اور غائب بھی ہو جاتے ہیں چونکہ وہ مخلوقِ لطیف ہیں۔

اَب یہ سوال کہ جنّ کیا ہے؟ ہم اِس سوال میں جنّ اور اِنس کو ایک کر کے دیکھتے ہیں کیونکہ انسان کی تخلیق میں چار (۴) عناصر ہیں اُن میں سے ایک عنصر آگ بھی ہے تو جس عنصر کو خصوصیت سے جنّ کی تخلیق کی بُنیاد قرار دیا گیا تھا وہ عنصر انسان کی تخلیق میں بھی ہے یعنی آگ انسان کے (Elements) میں سے ایک ہے، عناصر میں سے ایک عنصر ہے، باور کرنا ہوگا کہ جنّات اور انسان اصل میں بنیاد میں ایک ہیں۔ قرآن کی اِس ترتیب میں ذرا غور سے دیکھیں کہ پہلے انسان کی تخلیق کا ذکر ہے بعد میں جنّات کی تخلیق کا بیان آیا ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ جن جنّات کا یہاں ذکر آیا ہے وہ تو پہلے

انسان تھے یعنی وہ کثیف مخلوق تھے پھر لطیف ہو گئے ۔مختصر یہ کہ جنّات اور فرشتے سب انسانوں سے بنائے جاتے ہیں اور شیاطین بھی انسانوں سے بنائے جاتے ہیں اور جیسا کہ میں نے اپنے اِس بیان میں آپ کو بتایا کہ تخلیق ایک سلسلہ ہے،انسان کی تخلیق اگلی کڑی ہے تخلیق کی اور جنّات کی تخلیق بعد والی کڑی ہے اِس تخلیق کی ۔ پتنگا کس سے بنتا ہے؟ کیڑے سے،انسان ایک مثال سے کیڑا ہے جس سے کہ فرشتوں کے اور جنّات کے پتنگے بن جاتے ہیں،اور اگر اِس چیز کو گولائی میں دیکھنا چاہیں تو پھر اُن ہی پتنگوں سے یہ کیڑے بنتے ہیں ۔آپ کو[ایک] لکیر کی طرح،ایک خط کی طرح سوچنا ہے تو اُس میں پہلے آپ انسان کی تخلیق کو لیں پھر فرشتوں اور جنّات کی تخلیق کو اور اِس کی مثال میں نے اِسی کائنات سے دی ۔آپ نے پڑھا ہے آپ نے سُنا ہے بلکہ دیکھا ہوگا کہ کیڑوں سے پتنگے بنتے ہیں،پروانے بنتے ہیں اور اگر آپ نے گولائی میں دیکھنا ہے اور اُصول بھی یہ ہے کہ ہر چیز ایک گردش یعنی گول (Circle) پر واقع ہے،تو پھر آپ کہیں کہ پتنگے سے کیڑے اور کیڑے سے پتنگے بنتے ہیں،لیکن قرآن کا یہ درس پہلا درس ہے،آخری نہیں ہے،آخری درس ہم نے خود بنانا ہے،اِس لئے کہا کہ پہلے انسان کی تخلیق کا ذکر آیا یعنی پہلے کیڑے کی تخلیق کا ذکر آیا پھر جنّات کا یعنی اُس کے بعد پتنگوں کا،اِس سے ہمارے بہت سے سوالات حل ہو گئے ۔ایک یہ سوال بھی حل ہو گیا کہ جنّ کا الگ عنصر اور اِنس کا الگ عنصر کس طرح ہو سکتا ہے اور ایک ہی واحد عنصر سے کوئی مخلوق کس طرح بن سکتی ہے،آپ ایک ہی عنصر سے کوئی مرکّب چیز نہیں بنا سکتے ہیں مخلوق مرکب ہے ۔ اِس سے ہمارا مقصد کیا ہے؟ اِس سے ہم کیا جاننا چاہتے ہیں،ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جنّات کے اندر مختلف درجات ہیں،اچھے بھی ہیں بُرے بھی ہیں،جو اچھے ہیں اُن کو فرشتہ سمجھ لینا اور جو بُرے ہیں اُن کو شیاطین قرار دینا،بہت آسان بات ہے ۔

اِس مطلب کو جنّ کے لغوی معنی مدد دے سکتے ہیں یعنی جنّ کہتے ہیں چھپنے کو اور چھپانے کو اور آنکھوں سے جو چیز اوجھل ہے اُس کو جنّ کہتے ہیں ۔جنّ کے معنی کچھ بُرائی میں نہیں ہے،جنّ کے معنی کچھ اچھائی بھی نہیں ہے،اُس کے اندر اچھائی اور بُرائی دونوں کے معنی ہیں ۔چھپنے میں تو کچھ بُرائی ثابت نہیں ہو سکتی ہے،اِس سے اچھائی بھی ثابت نہیں ہو سکتی ہے ۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ چھپنے کا کیا مطلب ہے؟ اُس چیز کو دیکھنے سے اُس کو جھانکنے سے پتا چلے گا کہ وہ چیز اچھی ہے یا بُری ہے اور محض چھپنے میں تو کوئی قباحت نہیں ہے اور کوئی بُرائی بھی نہیں ہے اور کوئی اچھائی بھی نہیں ہے،تو مطلب یہ ہے کہ عربی میں جنّ چھپنے کو کہتے ہیں ۔دیکھیں میں اِس کی مثال آپ کو بتاتا ہوں،جُنَّہ: ڈھال کو کہتے ہیں جو کہ سر کو چھپاتا ہے تلوار سے،جِنَّہ :[اُس] مخلوق کو کہتے ہیں جو کہ پوشیدہ ہے اور جَنَّہ اُس باغ کو کہتے ہیں جس کو بہت سے درختوں نے (cover) کیا ہو،جَنَّہ،جِنَّہ ، جُنَّہ زبر،زیر اور پیش کے فرق سے ہے بنیادی طور پر معنی میں یہ تینوں الفاظ ایک ہیں ۔عربی کی خصوصیات میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر کسی لفظ کے اندر زبر،زیر اور پیش کا تفاوت ہے تو اُس میں رُوٹ کے اندر بنیاد کے اندر،کسی مقام پر اُس لفظ کے معانی ایک ہو جاتے ہیں،جس طرح کہ اِسی لفظ سے یہ ثابت ہے کہ جَنَّہ،وہ باغ

جس کو گھنے درختوں نے چھپالیا ہو اور جِنَّہ وہ مخلوق جو نظروں سے اوجھل ہو اور جُنَّہ وہ چیز یعنی ڈھال جس سے انسان اپنے سر کو لڑائی میں محفوظ رکھتا ہے اور چھپاتا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ جِنَّہ یا کہ جِنَّۃِ جو پڑھنے میں جِنَّہ کہا جاتا ہے یہ اُس مخلوق کو کہا جاتا ہے جو نظروں سے اوجھل ہو اور جس طرح کہ آگ کا شعلہ نظر آنے کے بعد اوجھل ہو جاتا ہے وہ جہاں پر بکھر جاتا ہے اُس مقام پر وہ نظروں سے اوجھل ہوتا ہے، تو میں نے کہا کہ فرشتہ، جنّ اور انسان اور شیاطین اِن تمام مخلوقات کی بنیاد ایک ہی ہے اور یعنی اگر شیطان ہیں تو انسان کے تنزّل کا نام ہے گر جانے کا نام ہے اور اگر فرشتہ ہے تو انسان کی ترقّی کا نام ہے اور جنّات میں دونوں صورتیں ہیں اِس سے کچھ پتا نہیں چلتا ہے اِس لفظ کے اندر کچھ ظاہر نہیں ہے صرف چھپنے اور آنکھوں سے اوجھل ہونے کے معنی ہیں۔ جس طرح کہ انسان سے پتا نہیں چلتا ہے کہ وہ کیا ہے، انسان کے لغوی معنی میں کچھ اچھائی اور بُرائی کا پتا نہیں چلتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر لفظ اچھائی اور بُرائی کی تمیز رکھے تو الفاظ بنے ہوئے ہیں شروع میں جس طرح کہ بن گئے ہیں پر فرشتہ ایک ایسا لفظ ہے کہ اُس میں (Clear) ہے مطلب، اور شیطان ایک ایسا لفظ ہے اُس میں بُرائی کے معنی ہیں۔ انسان میں اور جنّ میں ظاہر نہیں ہے اور دیکھنے سے پتا چلے گا کہ کیا ہے اور جنّ میں بھی یہ ہے، آپ سورۂ جنّ کو پڑھیں تو اُس میں یہی بات ہے کہ جنّات میں اچھے بھی ہیں (۷۲:۱۱) بُرے بھی ہیں اور جو اچھے ہیں وہ مومنین ہیں وہ فرشتے ہیں اور جو بُرے ہیں وہ شیاطین ہیں۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۱۶) اِس سے ہمارا مقصد صاف ہوگیا جو خداوند نے اِس ذکر کے بعد اِرشاد فرمایا کہ تم دونوں گروہ یعنی جنّ و اِنس اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اِس سے آگے جو کچھ بیان ہوا ہے اُس میں اللہ کی نعمتیں ہیں، یعنی جنّات کی حیثیتوں میں بھی نعمتیں ہیں، انسان کی تخلیق میں بھی نعمتیں ہیں، کہ اگر کسی کو جنّ بنانے میں رحمت، نعمت نہ ہوتی یا اِنس بنانے میں نعمت نہ ہوتی تو خدا اِرشاد نہ فرماتا کہ: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ اور دُوسری بات کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسانوں کے علاوہ جنّات کے لئے بھی مہیّا نہ ہوتی تو خدا اِس احسان جتلانے میں جنّات کو مخاطب نہ کرتا، یعنی اگر جنّات صرف عذاب کے لئے پیدا ہوئے ہوتے تو خدا احسان نہ جتلاتا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ میں یہ اِرشاد ہے [اور] اِس کا مقصد یہ ہے کہ بہت سی نعمتیں ہیں جنّات کے سامنے اور انسانوں کے سامنے اور جن کے متعلّق اللہ پوچھتا ہے کہ تم اِن نعمتوں میں سے کس نعمت کو جھٹلاتے ہو اور سورۂ رحمٰن میں شروع سے لے کر آخر تک کئی دفعہ اِس ارشاد کا تکرار ہوا ہے، یعنی بار بار فرمایا گیا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ تم جنّ و اِنس اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو اور معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن میں جس بات کے متعلّق بار بار فرمایا جاتا ہے اُس میں بڑی اہمیّت ہوتی ہے اُس میں کچھ بھید ہوتے ہیں، اُس میں کوئی راز ہوتا ہے اور یہاں اِس مطلب میں راز یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے تخلیق کے اِن میں مراحل میں نعمتیں رکھی ہیں اور کسی چیز کے مخلوق [کے] جنّ پیدا ہونے میں اور کسی کے اِنس پیدا ہونے میں دونوں میں اُس کی رحمت اور مہربانی ہے۔ پھر

اِرشاد ہوتا ہے کہ: رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (۱۷) وہ دونوں مشرقوں کا اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہے ۔ اِس مقام پر اہلِ ظاہر نے دو (۲) مشرق اور دو (۲) مغرب ثابت کرنے کے لئے یہ کوشش کی کہ موسمِ سرما میں سورج کچھ جنوب کی طرف سے نکلتا ہے اور موسمِ گرما میں سورج کسی قدر شمال کی طرف سے نکلتا ہے اور ڈوبنے کا بھی یہ حال ہے، اِس فرق کی بُنیاد پر انہوں نے دو (۲) مشرق اور دو (۲) مغرب قرار دیئے لیکن دانشمند کے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ آسمان پر زمین پر پتّھر پر اِس جسمانی مشرق ومغرب پر رُبوبیت کی صفت کا اطلاق نہیں ہوتا ہے ۔ یعنی کوئی کہے کہ پتّھر کا پروردگار تو اِس سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کیونکہ پروردگار اُسی کا ہونا چاہئے جس کو کچھ پرورش ملتی ہو اور ایک منزل سے دُوسری منزل کی طرف وہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہو یعنی وہ چیز نشوونما پاتی ہو، وہ پھلتی پھولتی ہو تو تب خدا کے پروردگار ہونے کی صفت اُس پر ثابت ہوسکتی ہے، لیکن پتّھر، مٹّی، پہاڑ، مشرق، مغرب کے پروردگار کہنے میں کوئی مطلب نہیں بنتا ہے ۔ لہٰذا ایسی بات تاویل طلب ہوتی ہے، تو ہمارے پیروں نے بزرگوں نے اِس کی تاویل یہ کی ہے، کہ دو (۲) مشرق سے مُراد عقلِ کُل اور نفس کُل ہیں کہ وہاں سے نورِ توحید کا طلوع ہوجاتا ہے اور دو (۲) مغرب کا مطلب ناطق اور اساس ہیں کہ نورِ توحید وہاں سے طلوع ہوکر یہاں غروب ہوجاتا ہے ۔ اِس لئے یہ بات صحیح ہے اور بہت اُونچی بات ہے کہ پروردگارِ عالم عقلِ کُل، نفس کُل، ناطق اور اساس کی پرورش کرنے والا ہے، علم وحکمت، رُشد وہدایت اور نورِ توحید سے ۔ یہی دین کے دو (۲) مشرق اور دو (۲) مغرب ہیں اور ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر اُوپر کا درجہ مشرق ہے اور ہر نچلا درجہ اُوپر کی نسبت سے مغرب ہے ۔ مثلاً عقلِ کُل ایسا مشرق ہے کہ جس کا دُوسرا مشرق نہیں اور نفس کُل ایک طرف سے مغرب ہے اُوپر کی طرف سے اور ناطق کی نسبت سے وہ مشرق ہے، پھر ناطق نفس کُل کی نسبت سے مغرب ہے کہ وہ اُوپر سے نور کو قبول کرتا ہے اساس کی نسبت سے مشرق ہے، پھر اساس امام کی نسبت سے مشرق ہے، اور ناطق کی نسبت سے مغرب ہے اور امام، حجّت کی نسبت سے مشرق ہے اور اساس کی نسبت سے مغرب ہے اور حجّت داعی کی نسبت سے مشرق ہے اور امام کی نسبت سے مغرب ہے ۔ علیٰ ھذا القیاس مطلق مغرب متجیب ہے کہ جس کا کوئی مشرق نہیں ہے، جب تک کہ وہ دعوت کرنے کے قابل نہیں بنتا ۔ اِسی طرح اُستاد مشرق اور شاگرد مغرب ہے اور بولنے والے کی زبان مشرق ہے اور سُننے والوں کے جو کان ہیں مغرب ہیں اور ایک شخص کی اپنی نسبت سے اُس کی آواز زبان مشرق ہے اور اُس کے کان مغرب، کہ ہر شخص اپنی باتوں کو خود ہی سُنتا ہے ایک لحاظ سے، تو یہ مشرق اور مغرب کی بات ہوئی اور اِس میں بہت ضروری تاویل بھی آگئی اور اہلِ ظاہر جو کچھ خیال کرتے ہیں اُس کا بھی ذکر ہوا ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۱۸) تو تم دونوں جنّ وانس اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو ۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ (۱۹) بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (۲۰) اُس نے دو (۲) دریاؤں کو ملا دیا، جن کے

درمیان ایک پردہ ہے اور جس کی وجہ سے وہ تجاوز نہیں کرتے ہیں، یعنی خداوندِ عالم نے دو (۲) دریا ایسے بنائے ہیں کہ وہ کنارا بہ کنارا بہتے ہیں، یہ اُس سے ملا ہوا ہے وہ اِس سے ملا ہوا ہے درمیان میں صرف ایک پردہ ہے اور یہ دونوں دریا اِس پردے کی وجہ سے ایک دُوسرے میں نہیں بہتے دونوں جدا جدا ہیں لیکن ایک ساتھ ہیں باہم ملے ہوئے ہیں درمیان میں پردہ ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۱) تو تم دونوں گروہ یعنی جنّ و اِنس اپنے ربّ کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (۲۲) اِن دونوں دریاؤں میں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ اَب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو (۲) دریا کیا ہیں؟ اِن دو (۲) دریاؤں سے کوئی ایک چیز مُراد نہیں ہے، یہ دونوں خیر و شر بھی ہیں، یہ دونوں رُوحانیت اور جسمانیت بھی ہیں، یہ دونوں دُنیا اور آخرت بھی ہیں اور یہ دونوں پیری اور مُریدی بھی ہیں، یہ دونوں درجۂ خداوندی اور درجۂ مخلوقی بھی ہیں۔ غرض یہ کہ مخلوقات میں دیکھا جائے تو خداوند نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں اور اِن جوڑوں میں سے دو (۲) تین (۳) مثالیں میں نے بتائیں، جس طرح خیر و شر، جس طرح دُنیا و آخرت، جس طرح رُوحانیت و جسمانیت وغیرہ اور جیسے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ: ''تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِهَا'' چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔

اور اِس کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے اِن دونوں کیفیتوں کو خدا نے دو (۲) دریاؤں سے تشبیہہ دی، یہ تعلیم کا ایک ایسا مقام ہے جو کہ بہت ہی اعلیٰ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے اِرشاد ہوا تھا کہ اگر تم حقیقی علم کو چاہتے ہو تو رُوحانی طور پر وہاں (Approach) کرو، رسائی کرو جہاں دو (۲) دریا آپس میں ملتے ہیں۔ اِس مثال سے اہلِ ظاہر کوئی جغرافیائی مقام کو مُراد لیتے ہیں بلکہ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ نشاندہی کریں کہ فلاں جگہ پر دو (۲) دریا آپس میں ملتے ہیں۔ دُنیا میں آپ کو بہت سے مقامات ملیں گے جہاں پر دو (۲) دریا ملتے رہتے ہیں، اُن دو (۲) دریاؤں کے ملنے میں کیا خاصیت ہو سکتی ہے؟ موسیٰؑ کو جہاں جانے کے لئے فرمایا گیا تھا اور جن دو (۲) دریاؤں کے سنگم تک پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا وہ یہی رُوحانیت اور جسمانیت کے دو (۲) دریاؤں کے ملنے کا مقام تھا اور تاویل وہاں سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں اِس سورہ میں بھی اُسی مقام کا ذکر ہے جہاں پر دو (۲) دریا ملتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اِن دو (۲) دریاؤں کی بہت بڑی اہمیّت ہے اور دونوں کی اہمیّت برابر برابر ہے۔ کسی ایسے انسان کو جس کی عقل بہت کمزور ہے، سر کی اہمیّت زیادہ ہو گی اور پاؤں کی اہمیّت کم ہو گی لیکن دانشمند کے نزدیک جتنی اہمیّت سر کی ہے اُتنی [ہی] اہمیّت پاؤں کی ہے، لیکن یہ سوال الگ ہے کہ مرتبہ الگ ہے، اہمیّت الگ ہے، مرتبہ گو سر کا ہے لیکن اہمیّت دونوں کی ہے، اہمیّت سے مُراد ضرورت یعنی سوال یہ ہے کہ جتنی ضرورت سر کی ہے اُتنی ضرورت پاؤں کی ہے یا نہیں ہے، تو جس تن میں پاؤں نہ ہو اُس تن کے سر کا کیا مرتبہ رہے گا۔

بہرحال اِس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں دریاؤں کی اہمیّت ہے جسمانی دریا کی بھی اتنی [ہی] اہمیّت ہے جتنی کہ رُوحانیت کے دریا کی اور دونوں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں کسی ایک سے نہیں نکلتے ہیں، دونوں کے اِسی انداز سے باہم مل کر رہنے سے، درمیان میں حجاب ہونے سے اور ایک دُوسرے میں گھس کر طغیانی کیفیت پیدا نہ کرنے میں حکمت ہے، بہتری ہے، مصلحت ہے کہ اگر وہ دریا اِس میں گھسے اور یہ دریا اُس میں داخل ہو جائے، تو اُس میں نہ موتی ہوں گے نہ [ہی] مونگے، نہ کوئی اُس میں کوئی حکمت اور مصلحت ہوگی یعنی اگر جسمانیت کو مٹا دی جائے اور صرف رُوحانیت ہی رُوحانیت رہے تو اُس کی کوئی اہمیّت نہیں، اور اگر رُوحانیت نہ ہو صرف جسمانیت ہی جسمانیت ہو اِس کی [بھی] کوئی اہمیّت نہیں۔ دُنیا نہ ہو اور صرف آخرت ہو تو خدا کی سلطنت اور ہر چیز ادھوری رہے گی کیونکہ دُنیا ہی آخرت کی کھیتی باڑی ہے، اگر آخرت راحت کا مقام ہے، گھر ہے، ٹھکانہ ہے، تو ہم نے مان لیا لیکن ایک زمیندار گھر میں بیٹھ کر کھاتا پیتا ہے، تو کہاں سے کھاتا پیتا ہے؟ کھیت سے، باغ سے، اِسی طرح دُنیا نہ ہو تو اعمال نہیں ہوں گے، دُنیا نہ ہو تو معرفت نہیں ہوگی، دنیا نہ ہو تو کارنامے قائم نہیں ہوں گے، اگر دُنیا کے بغیر آخرت چل سکتی تو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا، یہ بات نہیں ہے تو یہ دونوں دریا ہیں۔

اِس کے علاوہ پیری اور مُریدی کو لیں یا پیغمبری اور اُمّت کو لیں، کہاں ایسا کوئی تصوّر ہے کہ پیغمبر ہو اور اُمّت نہ ہو۔ اِس سے بڑھ کر بات کریں گے خدا اور مخلوق کی، کوئی ایک خدا ایسا بھی ہو سکتا ہے جو مخلوق کے بغیر ہو، جو ربّ کہلائے، خالق کہلائے، رازق کہلائے اور عادل کہلائے، خدا کے اگر سو (۱۰۰) نام ہیں تو آپ جس نام کو بھی لیں گے اور اُس کا تجزیہ کریں گے اُس میں سے مخلوق کی اہمیّت ظاہر ہوگی، تو یہ دو (۲) سمندروں کے ملنے کی بات ہے، دونوں کی اہمیّت ہے اور اِن دونوں کے ہونے میں ربّ کی نعمتیں ہیں، اِس لئے خدا نے فرمایا کہ [فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۳)] تم دونوں جنّات اور انسان اپنے ربّ کی کس کس نعمت کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہو۔ اُس کے بعد اِرشاد ہوتا ہے: وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَاٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ (۲۴) اور جہاز جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اُونچے کھڑے رہتے ہیں اُسی کے ہیں۔ ظاہر میں دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ سمندر میں جو کشتیاں ہیں یا نزول قرآن کے وقت جو سمندری بیڑے بنے تھے یا جہاز بنے تھے، تو اُن کی نسبت سے خدا اپنی تعریف کرتا ہے، کہ سمندر میں جہاز دیکھو کتنے بڑے ہیں پہاڑوں کی طرح، لیکن دانشمند کے نزدیک یہ بات نہیں ہے، اصل بات کچھ اور ہے، وہ یہ کہ اِس کائنات کے اندر جو ھیولیٰ ہے، جو ایتھر ہے وہ سمندر ہے، جو سیّارے ستارے ہیں وہ کشتیاں ہیں خدا کی۔ کتنی بڑی وسیع کائنات ہے اور رات کے وقت جب مطلع صاف ہوتا ہے، آسمان صاف شفاف نظر آتا ہے، تو اُس میں آنکھ اُٹھا کے دیکھیں آسمان کی طرف کتنی خدا کی کشتیاں اِس سمندر کے اندر ہیں، کائنات کے اِس گول گول سمندر کے اندر کتنی کشتیاں بھری ہوئی ہیں، کتنی بڑی بڑی کشتیاں ہیں، کتنے بڑے بڑے جہاز ہیں یعنی سیّارے، ستارے، یہ سب دُنیائیں ہیں۔ اِن ہی کی طرف اشارہ ہے چونکہ ھیولیٰ یا کہ ایتھر ایک سمندر ہے، خدا کا

سمندر ہے اور ''اَلْمُنْشَاٰتُ'' سے مُراد یہ ہے کہ یہ پیدا ہو جاتے ہیں یہ ستارے اور سیّارے پیدا ہو جاتے ہیں، اِن کی عمریں بہت لمبی ہیں، بہت بہت لمبی عمریں ہیں، سیّاروں کے، ستاروں کے پیدا ہونے کے لئے آپ سائنسی طور پر دیکھیں کتنا وقت لگتا ہے، سیّارۂ زمین کی عمر کو سائنس کی کتابوں میں دیکھیں کتنے کتنے (Million) سال ہوئے ہیں، پانچ (Million) سال ہوئے ہیں زمین پیدا ہوئی ہے، پانچ (Million) بہت بڑی چیز ہے، بہت بڑی چیز ہے اور کتنے (Million) [سال] تک یہ سیّارہ زندہ رہے گا وہ خدا بہتر جانتا ہے اور ہم تو قرآن کی روشنی میں بہت تھوڑی باتیں جانتے ہیں۔ ''اَلْمُنْشَاٰتُ'' سے مُراد کہ یہ پیدا ہو جاتے ہیں ستارے اور کبھی مٹتے بھی ہیں فرداً فرداً ایک ساتھ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۵) ان جہازوں کا اِس طرح سے پیدا ہونا اِس کائناتی سمندر کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، تو تم جنّات اور انسان یہ سب کچھ تمہارے لئے نعمتوں کی حیثیّت سے ہے تو کس نعمت کو اور کن کن نعمتوں کو جھٹلاتے ہو، کن نعمتوں سے ناشکری کرتے ہو۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ (۲۶) یہ تو اہلِ ظاہر صرف زمین سے متعلّق بات کرتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ (۲۶) سیّارۂ زمین پر جو کچھ ہے، جو بھی ہیں وہ فنا ہونے والے ہیں، ہم تو یہ کہیں گے کہ اِن سیّاروں ستاروں پر کسی نہ کسی زمانے میں آبادی ہوتی ہے اور پھر وہ آبادی مِٹ جاتی ہے اور وہاں جو انسان ہیں وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ یہ اِشارہ ہے کہ اِن بے شمار دُنیاؤں میں سے ہر دُنیا میں کسی نہ کسی زمانے میں آبادی ہوتی ہے، تو ان سیّاروں میں سے کچھ تو ایسے سیّارے ہیں جن کی آبادی ختم ہو چکی ہے اور کچھ ایسے ہیں جن میں کہ ابھی آبادی ہونے کا وقت نہیں آیا ہے۔ یہ اِشارہ ہے کہ یہ سب خدا کی کشتیاں ہیں جہاز ہیں اور کوئی جہاز خالی نہیں ہے، اِس میں انسان ہوتے ہیں اور یہ بھی اِشارہ ہے کہ جب کوئی کشتی بھر جاتی ہے، تو اُس وقت اُس کشتی کی عمر کے خاتمے کا وقت قریب آتا ہے۔

جس زمانے میں سیّارۂ زمین آبادی سے بھر جائے گی اور بہت اِس میں بستی ہو گی تو یاد رکھنا کہ اُس میں کوئی (Changing) آنے کا وقت ہے، وہ (Changing) کچھ اِس طرح سے آسکتا ہے کہ انسان کثیف جسم کو چھوڑ کر لطیف جسم کو اِختیار کرے یا کچھ ایسی غذا کا انکشاف ہو کہ اُس غذا کے کھانے سے انسان کیڑے سے پتنگا بن جائے، کثیف سے لطیف بن جائے، ہواؤں سے اور (Gases) سے غذاؤں کا اِنکشاف بہت ممکن ہے، انسان اِس غذا کو چھوڑ کر (Elements) میں جائے (Gases) میں جائے، سونگھنے کے طور پر غذا کو کھائے یہ ممکن ہے، یہ ایسی بہت سی ترقّیاں ہونے والی ہیں، تو اُس وقت جب دُنیا کی بستی بہت گنجان ہو جائے گی بہت آبادی ہو گی اور انسان بھر جائیں گے تو اُس وقت سیّارۂ زمین کی جو عمر ہے یعنی اُس میں (Changing) آنے کا وقت قریب ہوا ہو گا، تو اللہ کا یہ فرمانا کہ: کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ (۲۶) اِن کشتیوں پر اور زمین پر جو بھی ہیں وہ فانی ہیں فنا ہونے والے ہیں۔

وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (۲۷) اور تیرے ربّ کی ذات جو عظمت اور کرامت والی ہے باقی رہے گی۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۲۸) تو تم جنّ اور انس اپنے ربّ کی کس نعمت کو جھٹلاتے ہو۔ مطلب کی بات یہ ہے کہ انسانوں کے اور جنّات کے، ہر چیز کے فنا ہو جانے کو بھی نعمت اور راحت و رحمت قرار دی گئی ہے، یعنی اللہ کا یہ اِرشاد کہ زمین پر اور سیاروں پر جو بھی آبادی ہوتی ہے انسانوں کی اُس آبادی کا خاتمہ بھی ہو جائے تو یہ بھی نعمت ہے، اِشارہ یہ ہے کہ جب انسان فنا ہو جاتے ہیں، تو اللہ کی ذات میں وہ بقا پاتے ہیں یعنی کثیف سے لطیف بن جانا اور جسمانی سے رُوحانی بن جانا یہ بھی ایک طرح کی فنا ہے، لیکن اِس میں خدا کے نور کی طاقت سے زندہ رہنا ہے، خدا کے حضور میں زندہ اور باقی رہنا ہے، مطلب اِس کا یہ ہوا کہ قطعی طور پر انسان کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا ہے، اگر انسان کا قطعی طور پر خاتمہ ہوتا، تو اِس ذکر کے بعد جو فرمایا گیا کہ انسان ہلاک ہو جانے والے ہیں تو اِس کے بعد نعمت کا ذکر نہیں آتا، ظاہر ہے کہ اللہ انسان کے فنا ہونے کو نعمت قرار دیتا ہے اور سب سے بڑی نعمت، اِس سے معلوم ہوا کہ یہ فنا وہی ہے جس کا کبھی کبھار صوفی لوگ ذکر کرتے ہیں، کہ فنا فی اللہ بقا باللہ یہ وہی فنا ہے۔ اگر یہ فنا وہ فنا نہ ہوتی تو اللہ اِرشاد نہ فرماتا کہ پھر تم کس نعمت کو جھٹلاتے ہو، اِس کو بھی نعمت قرار دیتا ہے اور بار بار نعمتوں کا ذکر ہے اور ہر چیز نعمت ہے۔

گزشتہ کلاس میں جیسا کہ میں نے مولانا علی علیہ السّلام کے ایک ارشادِ مبارک کے حوالے سے کہا تھا کہ سورۂ رحمٰن عروس القرآن ہے، قرآن کی دلہن ہے تو اِن خوبیوں کی بناء پر یہ قرآن کی دلہن ہے۔ اِس میں ایسی خوبیاں ہیں رُوحانی خوبیاں، علمی اور عرفانی خوبیاں ہیں جہاں پر کہ فنا کو بھی کس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ بہت بڑی خوبصورتی سے۔ موت سے جہاں انسان ڈرتا ہے تو سورۂ رحمٰن نے اِس کو ایک ایسے حسن و جمال کے رنگ میں موت کو پیش کیا اور فنا کو ایسے شان سے پیش کیا کہ بس موت ہونے کے بعد بس خدا میں جینا ہے اور خدا کے نور میں زندہ ہو جانا ہے، تو پھر اِس معنی میں مولانا علی علیہ السّلام نے اِس کا نام عروس القرآن، قرآن کی دلہن بتلایا، تو اِس لئے کتنی اچھی بات ہے کہ انسان اور جنّات سب چیز کے فنا ہو جانے کے بعد خدا کی ذات باقی و برقرار رہتی ہے اور اِشارہ یہ ہے کہ وہ کرامت و بزرگی والا ہے، یعنی انسان کو بزرگی اُس وقت ملے گی اور انسان پر اکرام اور احسان کی انتہا اُس وقت ہوگی جبکہ یہ فنا ہو جائے۔ میں اِس آیت کو دوبارہ پڑھتا ہوں، ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا'' اِس کائنات میں، اِن ستاروں میں، اِن دُنیاؤں میں، اِس زمین پر جو بھی ہیں ''فَانٍ'' فنا ہونے والے ہیں ایک وقت آئے گا اُس میں مجبوراً سب کو فنا ہونا پڑے گا۔ ''وَيَبْقٰى'' اور باقی رہے گی ''وَجْهُ رَبِّكَ'' تیرے پالنہار کی ذات، یہ پروردگار کہنے میں بھی معنی ہیں، کہ انسان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی وہ پروردگار ہے، انسان کے مِٹ جانے کے بعد بھی وہ پروردگار ہے اور بڑے پیمانے پر اور بڑی اُونچی (Level) پر وہ پروردگار ہے یعنی کہ انسان جب فنا ہو جائے گا تو پروردگار کے معنی وہاں پورے ہو جائیں گے کہ انسان خدا سے مل جائے گا، ''ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ'' یہ

عظمت و بزرگی بھی خدا کی اپنی نسبت سے نہیں بلکہ انسان کو [خدا] جو نوازے گا جو اُس پر نوازش کرے گا اُس معنی میں وہ عظمت و بزرگی والا ہے کہ انسان کو عظمت اور بزرگی عطا کرے گا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۸) ان نعمتوں میں سے تم جنّ اور اِنس کن کن نعمتوں کو جھٹلاتے ہو، تو یہاں جنّ اور انس ایک ساتھ ہیں، ہر مقام پر، ہر منزل پر اور ہر نعمت کے تذکرے میں یہ دونوں مخلوق ایک ساتھ ہیں۔

یَسْاَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (۲۹) کہ اُسی سے مانگا جاتا ہے، اُسی سے طلب کی جاتی ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہیں سب ہی خدا سے مانگتے ہیں۔ یعنی اِشارہ ہے کہ اگر کوئی کسی بلند مقام پر ہے اُونچے درجے پر ہے اُس کو بھی، اور جو پست درجے میں ہے اُس کو بھی ہر حالت میں پروردگار سے غذائیں ملتی ہیں، حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں اور چیزیں مہیّا ہوتی ہیں۔ ''کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ'' بڑے معنی ہیں اِس آیت کے اندر کہ ہر روز وہ ایک کام میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خدا کی ایک ہی حالت ہے اور انسان کی مختلف حالتیں ہیں، یعنی انسان پر مختلف حالتیں گزرتی ہیں لیکن یہاں کہا گیا ہے کہ ہر روز خدا کی ایک نئی شان ہے یہ خدا کی شان اُس کی اپنی نسبت سے نہیں، ہماری وجہ سے ہے۔ مثال کے طور پر جس زمانے میں ہم جسمانیت سے رُوحانیت میں منتقل ہو جائیں گے تو اُس وقت خدا کا سلوک ہم سے کچھ اور ہوگا اور آج ہم اِس مرتبے میں ہیں اِس وقت کچھ اور سلوک ہے۔ جب ہم ماں کے پیٹ میں تھے تو اُس وقت ہمارے ساتھ کچھ اور سلوک تھا، جب ہم رُوحانیت کی پستی میں تھے تو اُس وقت [کچھ اور] یہ ہماری اپنی وجہ سے ہے۔ بہر حال یعنی خدا کی اپنی نسبت سے ایک شان ہے لیکن مخلوق کی نسبت سے اُس کی بہت سی شانیں ہیں۔ مثلاً سورج کو دیکھیں اَب اِس وقت نہیں ہے، سورج ایک مقام پر ہے، تو یہ زمین کی وجہ سے ہے کہ سورج [اَب] نہیں ہے، سورج تو ہے اور ایک مقام پر ہے۔ کبھی تو سورج کے سامنے بادل ہیں تو یہ بادل سورج کی وجہ سے نہیں ہیں، بادل ہیں تو سورج کی ایک نئی شان ہوگئی، رات کے وقت ایک اور شان ہوگئی، صبح سورج طلوع ہوتے وقت ایک اور شان ہوگئی لیکن اِن شانوں کے سلسلے میں دیکھا جائے تو سورج تو ایک حال پر ہے وہ تو نہ گردش کرتا ہے، نہ اپنی جگہ سے ٹلتا ہے، نہ اُس میں کوئی تبدیلی آتی ہے، بلکہ یہ تبدیلیاں جو ہیں وہ بیرونی طور پر ہیں لیکن بیرونی طور پر ہونے کے باوجود اِن کا تعلّق ہے سورج سے، تو خدا کی جو شان ہے وہ ہر وقت ایک شان ہے اور ہر زمانے میں ایک شان ہے۔ قیامت میں خدا کی ایک اور شان ہے، دیدار کے وقت اُس کی ایک اور شان ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۳۰)، تو خدا کی جو شیون ہیں یا خدا کی جو شانیں ہیں یہ بھی نعمتیں ہیں تو تم اِن نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاتے ہو۔

سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّہَ الثَّقَلٰنِ (۳۱) دیکھا جائے تو یہ ایک تنبیہہ ہے، دیکھا جائے تو یہ ایک (Warning) ہے، اے دونوں گروہ عنقریب ہم تمہاری طرف متوجّہ ہوں گے اور تم سے نپٹنے کے لئے ہم فارغ ہوں گے، ظاہر میں دیکھا جائے

تو اِس سے یوں لگتا ہے جیسے خدا کو اَب فرصت نہیں ہے اور آگے چل کر خدا فارغ ہوں گے اور جیسے ہی وہ فارغ ہوں گے ،تو وہ ہم سے نپٹ لیں گے، اِس کا ایک پہلو یہ ہے، لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ اِشارہ ملتا ہے کہ ایک زمانہ رُوحانیت کا عنقریب آنے والا ہے یہ اُس کی طرف اِشارہ ہے۔ اُس میں بہت جلدی سے حساب کتاب کیا جائے گا اور اُس میں بہت جلدی سے جنّات اور انسان رُوحانیت کی طرف متوجّہ ہو جائیں گے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۳۲) تو اللہ کا یہ فرمانا اور ایسے وقت کا آنا بھی نعمت ہے، سو تم دونوں گروہ یعنی جنّ و اِنس ایسی نعمتوں میں سے کس نعمت کو جھٹلاتے ہو۔ اِس کے بعد اور ایک شاندار ارشاد ہے: یٰا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ (۳۳) اے جنّ و اِنس کے گروہ! اگر تم سے ہو سکتا ہے کہ تم زمین اور آسمان کے کناروں سے باہر نکل پڑو تو دیکھو اور نکلو۔ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ (۳۳) تم زمین اور آسمان کے کناروں سے باہر نہیں جا سکو گے لیکن غلبہ سے، سلطان سے۔ بہت بڑی حکمت ہے اِس کے اندر کہ خدا نے جنّات اور انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم سے ہو سکتا ہے، تو زمین اور آسمانوں کے کناروں سے باہر نکل کے دیکھو تم نہیں نکل سکو گے، لیکن غلبہ سے تو یہ غلبہ کیا ہے؟ سلطان کیا ہے؟ سلطان کے کئی معنی ہیں، سلطان زور اور زبردستی کو کہا جاتا ہے، اور زور اور زبردستی کئی قسم کی ہے، عقلی ہے، علمی ہے، رُوحانی ہے، عرفانی ہے۔ من جملہ اِس میں اِس میں تین باتیں ہیں، ایک تو یہ علم و عرفان کی طرف اِشارہ ہے، ایک یہ زور دار ذکر کی طرف اشارہ ہے اور تیسری بات یہ سلطان ہی کی طرف اِشارہ ہے، یعنی مادّیت سے گزر کر آسمانِ رُوحانیت میں جا پہنچنا اِن تین چیزوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

علم ہی سے، علم کی روشنی میں کوئی رُوحانیت تک رسا ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہے، اور سختی کے ساتھ ذکر کرنے سے کوئی رُوحانیت کے آسمان کو پہنچ سکتا ہے یہ بھی صحیح ہے اور آخری چیز جسے میں پسند کرتا ہوں یہ ہے کہ دیکھیں کوئی دانشمند اپنے بیٹے کا نام موقع کی بغیر نہیں رکھتا ہے۔ حج کا موقع ہو تو حاجی رکھا جاتا ہے، قربانی کا موقع ہو تو قربان کہا جاتا ہے اور کوئی بھی موقع ہو تو اُس کے مطابق مولود کا نام رکھا جاتا ہے۔ ایک امامؑ نے اپنے بیٹے کا نام سلطان کیوں رکھا؟ سلطان کے معنی بادشاہ، سلطان کے معنی غلبہ تو یہاں یہ اِشارہ ہے میرے عقیدے کے مطابق جب تک کہ سلطان کا زمانہ نہیں آئے گا تو آسمانوں تک پہنچنا ناممکن ہے، تو یہ وہی سلطان ہے جس کی پیدائش کراچی میں ہوئی اور اِن کے دُنیا میں آنے کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی آسمانوں میں گئے اور رُوحانی طور پر بھی آسمانوں میں جانا ممکن ہوا۔ قرآن پیش گوئی کرتا ہے، نزولِ قرآن کے وقت کہا گیا کہ جب تک سلطان کا زمانہ نہیں آئے گا اُس وقت تک سیّارۂ زمین والے چاند پر خلاء میں فضاء میں نہیں جا سکیں گے، یہ بات صحیح ہے۔ یہ سلطان کا نام ہے، محض عقیدے کے طور پر نہیں اِس میں دلیل بھی ہے اور بھی دلیلیں ہیں چونکہ سلطان لیلۃ القدر [سورہ: ۹۷] ہے۔ آسمان کا زمین پر آنا یا زمین والوں کا آسمان پر جانا دونوں باتیں ایک ہیں

،آسمان میں کیا ہے یہ تو ایک بات ہے سورۂ قدر کو پڑھ کے دیکھیں کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جس میں کہ ملائکہ کا نزول ہوگا(۹۷:۴)،تو جن چیزوں کی وجہ سے ہم آسمان کی طرف توجّہ دیتے ہیں وہ فرشتے ہیں اور خدا ہے، آپ قرآن میں دیکھیں کہ بادلوں میں اللہ کا نزول ہونے والا ہے(۲:۲۱۰)اور قرآن میں دیکھیں کہ لیلۃ القدر وہ ہے کہ جس میں کہ ملائکہ کا نزول ہوگا،تو آج جو حقیقی مومنین ہیں گویا کہ آسمان میں گئے ہوئے ہیں اور جو اہلِ ظاہر ہیں وہ بھی مادّی طور پر آسمان میں گئے ہوئے ہیں۔خدا نے اِس اِرشاد کے اندر آسمان میں جانے کے سلسلے میں ناممکن بھی کہا اور ممکن بھی کہا دونوں باتیں کہی گئیں۔ناممکن اِس لئے کہا کہ تم زور آزمائی کر کے دیکھو تم نہیں جا سکو گے لیکن ایک چیز بتائی تھی لیکن سلطان سے،تم سلطان کے ذریعے سے جا سکتے ہو۔سلطان کے معنیٰ اگر زور اور غلبہ کے ہیں تو وہ بھی صحیح ہے کہ عبادت اور بندگی زور سے ہو، سلطان کے معنیٰ اگر زور کے ہیں تو ٹھیک ہے کہ آج وہ جو(Atomic Energy) ہے جو جوہری توانائی ہے وہ زور ہے اور مادّی طور پر سب سے زبردست پُرقوت چیز ہے اِس کے بھی معنیٰ ہیں۔خدا نے اِشارہ دیا کہ مادّیت میں جو سب سے زور آور چیز ہے اُس کے استعمال کے بغیر اُس کے انکشاف کے بغیر،اور سائنسی طور پر وہاں تک پہنچنے کے بغیر تم آسمان پر کیسے جا سکتے ہو یہ بات بھی صحیح ہے اور رُوحانی طور پر یہ بھی صحیح ہے کہ جو زوردار عبادت نہ ہو،جو زوردار عمل نہ ہو،جو زوردار معرفت حاصل نہ ہو تو آسمانِ رُوحانیت میں جا نہیں سکتے اور شخصیّت کے لحاظ سے کہ جو زوردار امامؑ دُنیا میں،پُرقوت امامؑ جو بہت زیادہ طاقت استعمال کرے گا اُس کے آنے کے بغیر آسمانِ رُوحانیت میں،آسمانِ معرفت میں جایا نہیں جا سکتا ہے،تو سلطان کے معنیٰ غلبہ ہو یا زور اُس کے کئی پہلو ہیں اور کئی پہلوؤں سے یہ بات صحیح ہے۔فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۳۴) تو تم جنّ و اِنس اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاتے ہو۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ (۳۵) تم دونوں پر آگ کا سبز شعلہ اور سیاہ دھواں چھوڑ دیا جائے گا تو تم دونوں اِن چیزوں کو نہیں روک سکو گے۔یہ اِشارہ ہے کہ آگ کا سبز شعلہ اور سیاہ دھواں رُوحانیت سے روکنے کی دو(۲) چیزیں ہیں ایک آگ کا شعلہ ہے جس کا یہاں سبز رنگ بتایا گیا ہے،ایک دھواں ہے۔ایک انسان نے رُوحانی روشنی نہیں دیکھی ہے وہ تاریکی میں ہے یہ سیاہ دھواں ہے اور یہ سیاہ دھواں ہٹ گیا تو آگے شعلہ آئے گا روشنی آئے گی تو روشنی اُس کے لئے پردہ بنے گی۔میں نے کبھی کہا تھا،اگلی مجلس میں کہا تھا کہ زمین رُوحانیت پر تو لوگ جا سکتے ہیں لیکن آسمانِ رُوحانیت تک نہیں پہنچ سکتے ہیں،میں نے وجہ بتائی تھی کہ زمین رُوحانیت سے اُوپر اِس لئے نہیں جا سکتے ہیں کہ آسمانِ اوّل پر کچھ چراغ ہیں وہ چراغ ایسے ہیں روشن اور پُرزینت اور پُررونق اور وہ اِس لئے مقرّر ہیں کہ شیاطین جب پرواز کرتے ہیں آسمان کی طرف تو وہ چراغ اُن شیاطین پر شعلے برساتے ہیں۔یہاں بھی یہی بات ہے کہ دو(۲) چیزیں ہیں ایک تو سیاہ دھواں ہے۔وہ اِس تاریکی کو کہا جاتا ہے[کہ]ایک عام انسان کے سامنے تاریکی ہی تاریکی ہے بس وہ

جب آنکھیں باندھتا ہے تو تاریکی ہی تاریکی ہے وہ سیاہ دھوئیں کی مثال ہے اور جب کچھ کوشش کرتا ہے تو وہ روشنی دیکھتا ہے یہ دُوسرا پردہ ہے، ایک پردہ گزر گیا، دُوسرا پردہ اُس کے سامنے روشنی کا ہے، تو اِس کو یہاں آگ کے سبز شعلے کہا گیا۔ اِن دو (۲) چیزوں سے گزرنے کے بعد وہ آسمانِ رُوحانیت پر پہنچ سکتا ہے وہی بات ہے الفاظ دُوسرے ہیں اور کچھ نہیں۔ [فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۳۶)]

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّهَانِ (۳۷) جب آسمان پھٹ جائے گا تو اُس وقت تیل کی طرح لال ہو جائے گا۔ یہ اُس شعلے سے آگے گزر جانے کے بعد کی کیفیت ہے کہ رُوحانی طور پر کوئی شخص اِس روشنی سے گزر کے آسمان کی طرف بڑھتا ہے، تو آسمان کی کیا کیفیت ہوتی ہے تو اِس آسمان کو [کی طرف] جانے کو یہاں آسمان کا پھٹنا قرار دیا گیا ہے، آسمان کا پھٹنا اور آسمان کے دروازے کا کھلنا۔ قرآن میں ذکر ہے کہ آسمان کے دروازے اُن لوگوں کے لئے نہیں کھلیں گے جو خدا سے انکار کرتے ہیں خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ لوگ زمینِ رُوحانیت تک نہیں جائیں گے، زمینِ رُوحانیت کوئی بات ہی نہیں ہے وہاں پر تو سب جاتے ہیں، بات تو آسمان پر جانے کی ہے جس کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ جو لوگ خدا کے دیدار سے انکار کرتے ہیں خدا کے دیدار سے انکار کرنے کے کچھ معنی ہیں اور اُس میں اور زیادہ وضاحت ہے۔ فی الحال اِس کو چھوڑیں بات لمبی ہو جاتی ہے، خدا نے فرمایا کہ اُن لوگوں پر آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے یہاں تک کہ سوئی کے ناکے سے اُونٹ گزر جائے، یعنی سوئی کے ناکے سے اُونٹ کا گزر جانا ناممکن بات ہے۔ اِسی طرح مشرکین کے لئے آسمان کے دروازے کھل جانا اتنی ناممکن بات ہے جتنی کہ سوئی کے ناکے سے اُونٹ کا گزر جانا تو دونوں باتیں ایک جیسی ہیں، تو بات آسمان کا پھٹ جانا اور آسمان کے دروازے کا کھل جانا دونوں ایک ہیں اور سیاہ دھوئیں سے گزر کر آگ شعلے میں اور آگ کے شعلے سے گزر کر آسمان کو سرخ تیل کی طرح دیکھنا یہ رُوحانی کیفیت کا ذکر ہے اور آسمان کی طرف جانے کا تذکرہ ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۳۸) تو تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاتے ہو۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْاَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (۳۹) تو اُس روز کسی انسان اور کسی جنّ سے اُس کے گناہ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۴۰) تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاتے ہو۔

یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمَاهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ (۴۱) تو مجرموں کو اُن کے چہروں سے پہچانا جائے گا پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، پس اُن کی پیشانی کے بالوں کو پکڑا جائے گا اور اُن کے پاؤں کو پکڑا جائے گا، تو یہ طوعاً و کرھاً رُوحانیت کی طرف بڑھنے کا ذکر ہے اور فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۴۲)

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۴۳) یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرم لوگ جھٹلاتے تھے، تو جہنم سے

مُراد جہنم بھی ہے اور جہنم سے مُراد وہ مشقّت بھی ہے جو اِس رُوحانیت کے رستے میں آتی رہتی ہے اور بہرحال ہم یہاں پر ٹھہریں گے اور (Lesson) کو ختم کریں گے تاکہ کچھ منٹ ضروری سوالات کے لئے بچیں اور اب اگر کسی عزیز کا کوئی سوال ہو تو پوچھا جائے۔

ٹائپنگ: ثناوزیر علی　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

Click here for Audio

عنوان: سورۂ رحمٰن کی حکمتیں (حصّہ سوم) (آیت ۴۵ تا ۶۷)

کیسٹ نمبر: Q-9C تاریخ: ۱۴ رنومبر، ۱۹۷۸ء کراچی

سورۂ رحمٰن میں سے تیسرا درس چل رہا ہے، اور ہم پینتالیسویں (۴۵) آیت [فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ] کے بعد یعنی دُوسرے رُکوع کے بعد تیسرے رُکوع کا آغاز کرتے ہیں اور یہاں پر اِرشادِ باری ہے کہ: وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ (۴۶:۵۵) اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اُس کے لئے دو (۲) باغ ہیں اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اُس کے لئے دو (۲) باغ ہیں۔ چونکہ قرآن میں بہت سی حقیقتیں مثالوں کے اندر [پوشیدہ] ہیں اور ہر مثال کا ایک ممثول ہوا کرتا، ممثول سے مُراد حقیقت اور حکمت ہے یا ممثول کو تاویل کہنا چاہئے، تو یہاں اِن دو (۲) باغوں سے مُراد پیر ناصر خسرو ق س کی تاویل کے مطابق عقلِ کُلّی اور نفسِ کُلّی ہیں جن کی تشبیہہ باغوں سے دی گئی ہے۔ لیکن ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ رُوحانی طور پر وہ چیز بھی موجود ہے جو مثال کی حیثیت سے ہے اور وہ چیز بھی جو ممثول کا درجہ رکھتی ہے، اِس لئے تخیّل میں، تصوّر میں اور رُوحانیت میں لطیف باغات ضرور ہیں کیونکہ مثال بھی تو ہونی چاہئے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۴۷:۵۵) اِرشاد ہوتا ہے کہ تم دونوں یعنی جنّ و اِنس اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت سے انکار کرو گے۔ یہ سب نعمتیں ہیں اللہ تعالیٰ کی، اور اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں تو اِن سے تم کس طرح انکار کر سکتے ہو۔

ذَوَاتَاۤ اَفۡنَانٍ (۴۸:۵۵) دونوں باغ، درختوں کی ٹہنیوں سے ہرے بھرے ہوئے۔ پھر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۴۹:۵۵) پھر تم دونوں اپنے سرپرست کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ جہاں دو (۲) باغوں کی تاویل عقلِ کُلّی اور نفسِ کُلّی ہیں "وجہِ دین" کے مطابق، وہاں بہت سے درخت اور اُن کی بہت سی ٹہنیوں سے مُراد عقلِ کُلّی اور نفسِ کُلّی کے ذیلی درجات ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں پیغمبر کا نام لیا جاتا ہے، تو اُس سے ایک بہت بڑا "ادارہ" مُراد ہوتا ہے، جہاں امام کا نام لیا جاتا ہے، تو وہاں امام اور اُس کے حجّت، داعی، پیر وغیرہ سب کا ذکر ہوتا ہے اور سب کی طرف اِشارہ ہوتا ہے، جہاں خدا کا ذکر ہوتا ہے تو خدا کی خدائی، اُس کی سلطنت، اُس کے اوصاف اور اُس کی ہر چیز کی طرف اِشارہ ہوتا ہے اور جہاں عقلِ کُلّی اور نفسِ کُلّی کا ذکر آتا ہے وہاں اُن کے بہت سے ذیلی درجات کا بیان بھی مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ جس مقام پر عقلِ کُلّی اور نفسِ کُلّی کی تشبیہہ بہشت کے دو (۲) باغوں سے دی گئی وہاں پر اُن کے ذیلی درجات کی تشبیہہ اُن

باغات کے درختوں اور درختوں کی شاخوں سے دی گئی ،جہاں عقلِ کُلّی اور نفس کُلّی کی مثال دو (۲) باغوں سے دی گئی ہے وہاں اُن کے ذیلی درجات کی مثال باغوں کے درختوں اور درختوں کی شاخوں سے دی گئی ہے۔

فِيۡهِمَا عَيۡنٰنِ تَجۡرِيٰنِ (۵۵:۵۰) اُن دو (۲) باغوں میں دو (۲) چشمے ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ یہ بات تاویل کے مطابق ہے کہ اُن دو (۲) باغوں میں دو (۲) چشمے ہیں۔ اِس سے زیادہ نہیں ہیں، مطلب اِس کا یہ ہوا کہ عقلِ کُلّی کے فیض کو اور نفس کُلّی کے فیض کو جو ہمیشہ جاری ہے چشموں سے مثال دی گئی ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵:۵۱) پس تم دونوں گروہ یعنی جنّ و اِنس اپنے پروردگار کی اِن عظیم الشان نعمتوں میں سے کس کس نعمت سے مُکر و گے۔

فِيۡهِمَا مِنۡ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوۡجٰنِ (۵۵:۵۲) اُن دونوں باغوں میں جو بھی پھل ہیں وہ جوڑوں میں ہیں، کوئی پھل اکیلا نہیں، کوئی پھل یکتا نہیں بلکہ ہر پھل کے جوڑے ہیں، تو یہ بات قابلِ توجّہ ہے اور بہت بڑی اہمیّت ہے اِس کی، اِس سے پہلے شاید اِسے کسی درس میں یا دُوسرے مقامات پر میں نے کہا تھا کہ ہر چیز جوڑے میں ہے۔ جس طرح تاریکی کے ساتھ روشنی ہے یعنی دن کے ساتھ رات ہے اور آسمان کے مقابل میں زمین ہے، غریبی کے مقابلے امیری ہے، موت کی ضد زندگی ہے، اور اِسی طرح پستی کے سامنے بلندی ہے، اور دُنیا کے مقابلے میں آخرت ہے، خیر کی ضد شر ہے، گمراہی کے مقابلے میں ہدایت ہے اور ثواب کے سامنے عذاب ہے اِسی طرح اور شاید ہم نے دو (۲) دریاؤں کے آپس میں ملنے کے سلسلے میں اِس کا ذکر کیا تھا۔ مَرَجَ الۡبَحۡرَيۡنِ يَلۡتَقِيٰنِ ۪ بَيۡنَهُمَا بَرۡزَخٌ لَّا يَبۡغِيٰنِ (۵۵:۱۹۔۲۰) اِس کی تشریح کرتے ہوئے، اور بھی قرآن میں کئی آیتیں آپ کو ملیں گی جن میں اِس حکمت کا ذکر ہوگا کہ ہر چیز جوڑے میں ہے اور خصوصاً سورہ یاسین میں اِرشاد ہوا ہے کہ: سُبۡحٰنَ الَّذِىۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۳۶:۳۶) پس پاک ہے وہ ذات جس نے تمام چیزوں کو جوڑوں میں پیدا کیا، یہاں تک کہ زمین سے جو چیزیں اُگتی ہیں اُن کے بھی جوڑے ہیں اور اُن کے نُفوس کے بھی جوڑے ہیں اور اُن چیزوں کے بھی جوڑے ہیں جن تک اِن کی عقل ابھی نہیں پہنچی ہے، یہاں تک کہ علمی چیزوں کے بھی جوڑے ہیں، تو یہ ایک کلّیہ ہے بُنیادی قانون اور اِس کی مدد سے ہم بہت سی حکمتیں اور حقیقتیں سمجھ سکتے ہیں، اور اِن حکمتوں میں سے ایک یہ کہ جنّت کے میوے اِس معنی میں جوڑے ہیں کہ ہر علم، ہر حکمت، ہر نظریہ اور ہر حقیقت کے دو (۲) پہلو ہیں کم سے کم یا آخری مقام پر، تو اگر ایک پہلو کا مقصد کسی چیز کا اِثبات ہے تو دُوسرے پہلو کا مقصد نفی ہے۔ اگر کہیں ایک چیز کا مقصد [یا] ایک چیز کے ایک پہلو کا مقصد وحدت ہے تو اُسی کے ساتھ ساتھ اُسی چیز کے دوسرے پہلو کا مطلب کثرت ہے۔

آپ ایک ہی چیز کو نہیں لے سکتے ہیں، ایک ہی پہلو کو نہیں لے سکتے ہیں، ایک ہی چیز کو لیں گے تو مطلب ادھورا رہے گا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ قرآنِ مقدّس میں اِس سلسلے میں بہت سے اِرشادات ہیں اور بہت سے لطیف اشارے

پائے جاتے ہیں۔ اِسی کلیے کی تشریح کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے کہ اُس نے رات سے دن کو پیدا کیا اور دن سے رات کو پیدا کیا (۳۵:۱۳)۔ پھر کبھی فرماتا ہے کہ اُس نے زندگی سے موت کو بنایا اور موت سے زندگی کو بنایا یعنی نیستی سے ہستی کو پیدا کیا اور پھر ہستی سے اُس نے نیستی بنائی۔ چنانچہ سورۃ ملک میں اِرشاد ہوتا ہے کہ: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ۔ (۶۷:۲) ہم تو اَب تک صرف حیات کو مخلوق سمجھتے تھے اُس نے موت کو بھی مخلوق قرار دیا۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (۶۷:۲) اُس نے جس طرح حیات پیدا کی اِسی طرح اُس نے موت بنائی، تو موت کے بنانے میں سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ موت پر تخلیق کا اطلاق کس طرح ہوسکتا ہے؟ اگر اِس مطلب پر ذرا غور کیا جائے تو ہم کو ایک دائرہ نظر آتا ہے یعنی اگر اِس مطلب کو مضبوطی کے ساتھ مان لیا جائے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ جس طرح خدا نے نیستی سے ہستی کو پیدا کیا اِسی طرح اُس نے نیستی کو بھی ہستی سے پیدا کیا۔ اِس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم اپنے علم کے بچپن میں جب یہ سمجھتے تھے کہ پہلے پہل کچھ بھی نہیں تھا، سوائے ذاتِ خدا کے تو خدا نے کائنات کو پیدا کیا اُس سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا، کچھ بھی نہیں تھا، ہم یہ سمجھتے تھے۔ اب اِس کلیے کی روشنی میں ذرا دیکھیں تو کچھ اور بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ دُرست ہے ایک وقت میں کچھ بھی نہیں تھا اگر ہم اِس کو مانیں اور اِس کلیے کی روشنی میں دیکھیں تو وہ یوں ہوگا کہ کچھ نہ ہونے سے پیشتر سب کچھ تھا، اُس سب کچھ سے خدا نے نیستی پیدا کی تھی اور پھر اُس نیستی سے یہ موجودہ ہستی پیدا کی۔ اِس کا خلاصہ یہ ہوا کہ خدا کی بادشاہی میں لاابتدائی اور لاانتہائی ہے اور اگر ہم ابتدا اور انتہا کا تصوّر رکھتے ہیں تو اُس کے لئے ہم اِس (Circle) کے دو (۲) ٹکڑے بنائیں۔ ٹھیک ہے اُس صورت میں (Circle) کے دو (۲) ٹکڑوں کو فرض کریں کہ اِس طرف کے ٹکڑے کا وہ سرا آغاز اور یہ سرا، انجام ہے۔

اگر ہم (Circle) کو دیکھ سکتے ہیں تو ٹھیک ہے کہ خدا کی تخلیق دائمی ہے۔ یہ امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے اُس اِرشاد کی تشریح ہے جو اُس عالی قدر امام نے اپنی کتاب ''آپ بیتی'' میں اور اُس (Chapter) کے اندر جو ''اسلام میرے مورثوں کا مذہب'' کے عنوان سے ہے، اُس میں ارشاد فرمایا ہے۔ امام نے فرمایا ہے کہ: ''دفعتاً یعنی یکا یک ایک نئی چیز کے اِیجاد کرنے کی طرح کائنات کو پیدا کرنے کا تصوّر یہودیوں کا ہے۔ تخلیقِ کائنات سے متعلّق اسلام کا تصوّر یہ ہے کہ اللہ ہر وقت تخلیق کرتا ہے'' [اسلام میرے مورثوں کا مذہب ص:۱۶]۔ ہر وقت تخلیق کرتا ہے تو میں نے خدا کے ہر وقت تخلیق کرنے کی وضاحت کی قرآن کی روشنی میں اور یہ منطق کس سے طرح بنی؟ اِس طرح سے بنی کہ ہر چیز، ہر چیز! جوڑے میں ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہستی کا آخری سرا نیستی کے ابتدائی سرے کے ساتھ ملا ہوا ہے اور نیستی کا آخری سرا ہستی کے آغاز میں پیوست ہے، اور دانشمند کو دن رات کا سلسلہ یہ بتاتا ہے کہ اگر نیستی (Nothingness) رات کی طرح ہے اور ہستی دن کی طرح ہے تو دن سے پہلے رات ہوتی ہے اور رات سے پہلے دن ہوتا ہے، اسی طرح ہستی سے پہلے نیستی تھی اور اُس نیستی سے

پہلے ایک ہستی تھی اور اُس ہستی سے پہلے ایک نیستی تھی تو اسی طرح یہ سلسلہ لاانتہا ولاابتدا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چالو ہے۔

اب اِس کے بعد جو ہم نے کہا کہ قرآن کی روشنی میں قرآن کی تشریح کرتے ہوئے کہ بہشت کے اندر جو میوے ہیں وہ سب جوڑوں میں ہیں، کوئی بھی بات، کوئی بھی منطق آپ جب بیان کرتے ہیں، تو آپ اُس کا صرف ایک پہلو بیان کرتے ہیں، اُس کے دُوسرے پہلو کو آپ بیان نہیں کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر علمی بات کے دو (۲) پہلو ہوا کرتے ہیں ایک کا تعلّق اگر اِثبات سے ہے تو دُوسرے کا تعلّق نفی سے ہے یعنی ایک اگر روشن پہلو رکھتا ہے تو دُوسرا تاریک پہلو رکھتا ہے، یعنی ایک پہلو پر اگر روشنی ہے تو دُوسرے پر تاریکی ہے یا اگر ایک پہلو کا تعلّق کثرت سے ہے تو دُوسرے کا تعلّق وحدت سے ہے، ایک پہلو کا تعلّق اگر ازل سے ہے تو دُوسرا جو ہے وہ ابد کی طرف ہے۔ انسان ہی کو لیجئے کہ یہ مخلوق ہے ایک طرف سے لیکن دُوسری طرف سے اِس کی ایک انا خالق میں ہے، بہر حال ہم کچھ آگے چلتے ہیں۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۵۵:۵۳) پس یہ سب نعمتیں ہیں تو تم جنّ و اِنس اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاتے ہو۔

مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآئِنُھَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَی الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ (۵۵:۵۴) یہ لوگ یعنی اِن دو (۲) باغوں میں رہنے والے بہشتی لوگ اُن فرشوں پر جن کے استر اطلس کے ہوں گے، تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ دونوں باغوں کے میوے اِس قدر قریب ہوں گے کہ اگر چاہیں تو لگے ہوئے کھالیں تو تم دونوں اپنے مالک کی کس کس نعمت کو نہ مانو گے۔ مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآئِنُھَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ تکیہ لگانے کا مطلب فرشوں پر، ایسے فرشوں پر بیٹھنا اور تکیہ لگانا معنی ہیں کہ انسان کی بقا و قیام شخصیّت پر ہے، ایک ہستی پر ہے، وہ یا کثیف جسم رکھتا ہے یا لطیف جسم رکھتا ہے۔ یہاں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ اُن فرشوں پر تکیہ لگائے ہوں گے جن کے اَستر اطلس کے ہوں گے یعنی اَستر کی تعریف کرنا اور جو باہر اُس کا حصّہ ہے اُس کو فروگزاشت کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ مومن کے ظاہر سے باطن زیادہ بہتر ہے اور جسمانیت سے رُوحانیت بہت اعلیٰ ہے، یعنی بہشت میں جو مومنین ہوں گے اُن کا تعلّق دو (۲) طرح سے ہوگا ایک ایسی شخصیّت سے اُن کا تعلّق ہوگا جس کے ظاہر سے باطن بہتر ہے۔ یہاں انسان کی ہستی کو فرش سے تشبیہہ دی گئی ہے، ہماری شخصیّت رُوح کے لئے فرش و بساط کی طرح ہے جس پر کہ رُوح کا قیام ہے اور اِس شخصیّت کے اندر یعنی اِس کے باطن میں جو کچھ حقیقتیں ہیں وہ اِس ظاہری شخصیّت سے بڑھ کر ہیں، اور بہشت کے میووں کا قریب ہونا دلیل ہے کہ جو رُوحانی علم ہوتا ہے وہ خود بخود ایک ایسے معجزانہ درخت کی طرح ہے، جس کی شاخ کسی کے پاس گھر میں پہنچے جھک کر تو رُوحانی علم ایسا ہے۔ دُنیا میں کوئی درخت ایسا نہیں ہے کہ پھل کھانے والا جب چاہے تو وہ اپنی شاخ کو جھکا دے اور خواہش رکھنے والے کے پاس پہنچا دے لیکن بہشت کے درختوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہاں پر جو درخت ہیں وہ ایسے ہیں کہ بہشتی لوگ نہ تو درخت پر چڑھیں گے نہ درخت کو۔۔۔ ایسے لوگ جس درخت سے پھل کھانا چاہیں گے وہ درخت اُس پھل کو اور اپنی شاخ کو اُن تک

پہنچادے گا۔ یہ تاویل ہے اِس حقیقت کی، کہ علم کے جو میوے ہوا کرتے ہیں وہ رُوحانیت کے اعلیٰ مراتب میں خود بخود مومنین کے پاس پہنچ جاتے ہیں ۔اُن کو زحمت اُٹھانی نہیں پڑتی ہے، بآسانی جس چیز کا وہ تصوّر کرتے ہیں جس چیز کو وہ سوچتے ہیں اور جس حکمت وحقیقت کی خواہش ہوتی ہے وہ خود بخود اُن کے پاس آجاتی ہے یہ تاویل ہے بہشت کے اُن درختوں کی جن کے پھل مومنین سے قریب ہوجاتے ہیں ۔فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ(۵۵:۵۵)اورتم جنّ واِنس اپنے پروردگار کی کس نعمت کو جھٹلاتے ہو۔

فِیۡہِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ لَمۡ یَطۡمِثۡہُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَہُمۡ وَلَا جَآنٌّ (۵۵:۵۶) اُس بہشت میں حوریں ہیں جن تک اِس سے پہلے نہ کسی جنّ کی رسائی ہوئی ہے نہ کسی اِنس کی، تو اِس کی تشریح میں بھی انسان کی رُوح اور اُس کی ہستی میں جو تجدید ہونے والی ہے اُس سلسلے میں بہت سے بھیدوں کا انکشاف ہوتا ہے، تو مختصر یہ کہ انسان جب اِس دُنیا سے گزر جائے گا تو اُس وقت ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ انسان وہی ہوگا جو دُنیا میں تھا اور دُوسری طرف سے دیکھا جائے تو وہ بالکل بدل چکا ہوگا، وہ اتنا بدل چکا ہوگا، اتنا بدل چکا ہوگا، کہ جس لحاظ سے وہ بدل چکا ہوگا اُس کے اعتبار سے وہ بالکل ہی ایک نئی مخلوق ہوگا، مرد ہو یا عورت ہو وہ سب بدلے ہوئے ہوں گے ۔حدیث میں روایت آئی ہے کہ ہر مومن مرد شہید کے درجے میں ہوگا اور ہر مومنہ عورت حورا ہوگی[کُلُّ مُؤۡمِنٍ شَہِیۡدٌ وَ کُلُّ مُؤۡمِنَۃٍ حَوۡرَاءُ] لیکن اِس میں اور بھی بہت سے بھید ہیں ۔بہت سی وضاحتیں ہیں جن کے لئے وقت بہت کم ہے ۔فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ(۵۵:۵۷) پس تم جنّ واِنس اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

کَاَنَّہُنَّ الۡیَاقُوۡتُ وَالۡمَرۡجَانُ ۔فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۵۵:۵۸۔۵۹) یہ بہشت کی مخلوق کی تعریف وتوصیف کی جاتی ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ انسان کی تجدید ہوگی وہ کثیف سے لطیف ہوجائے گا اور جس طرح ایک کیڑا پروانہ بن جاتا ہے گو کہ وہ پروانہ اُسی کیڑے سے بنا لیکن پروانہ نہ صرف ایک نئی مخلوق ہے بلکہ شکل وشباہت میں بھی کیڑے سے بہت مختلف ہے ۔انسان کی اُس ہستی سے یہ ہستی جو موجودہ وقت میں ہے کس قدر ادنیٰ ہے اور وہ ہستی کس قدر اعلیٰ ہے، اور یہاں اسی مقام پر جو ذکر بہشت کی مخلوق کا ہوا اُس کے سلسلے میں، میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اِس کے اندر بھی بہت سی تاویلیں ہیں یعنی اِس مثال کا جو ممثول ہے وہ بہت ہی اعلیٰ ہے اور مختصراً یوں کہنا چاہئے کہ وہاں کی نعمتیں دیدارِ الٰہی کی صورت میں ہیں اور عقل وعلم کی صورت میں ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ عقلِ کُلّی کے مقام پر عقل کی نعمتیں تائید کی صورت میں ہیں جو عقلی مدد ہے اُن کو بہشت کی نعمتوں سے تشبیہہ دی گئی ہے اور نفسِ کُلّی کے مقام پر تخلیق کی صورت میں، یعنی کسی چیز کو پیدا کرنا چونکہ نفسِ کُلّی اِس کائنات کا خالق ہے تاویل میں اور مومن کے لئے جو نفسِ کُلّی ایک باغ کی حیثیت سے ہے اور مومنین کو اُس باغ کے پھل ملنے والے ہیں تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ نفسِ کُلّی کے مقام پر جو اُس کی حیثیّت ہے، جو اُس کا فعل ہے، جو اُس

کی تخلیق ہے وہ مومنین کو نصیب ہوگی، یعنی وہ بھی تخلیق کرسکیں گے، اِن چیزوں کو بہشت کی نعمتیں قرار دی گئی ہیں اور آگے چل کر ناطق اور اساس کا ذکر بھی آنے والا ہے۔ ہم وہاں پہنچ کر اِس قسم کی وضاحت کریں گے کہ ناطق کے مقام پر کیا کیا نعمتیں ملنے والی ہیں اور اساس کے مقام پر کیا کیا نعمتیں حاصل ہونے والی ہیں۔

فرمایا جاتا ہے: هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵:۶۰) کیا نیکی کا بدلہ سوائے نیکی کے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نیکی کا بدلہ نیکی ہوتا ہے اور اگر نیکی کا بدلہ خدا کی طرف سے ملنے والا ہو تو وہ بہترین صورت میں ہوتا ہے، جب ایک انسان دُوسرے انسان کو نیکی کا بدلہ دیتا ہے تو وہ بھی یہ کوشش کرتا ہے کہ بہتر بدلہ دے دے۔ جس نے نیکی کی تھی، جس نے احسان کیا تھا اُس کے عوض میں دُوسرا انسان اپنی مقدور بھر کوشش کرتا ہے کہ بہتر طریقے سے بدلہ دیا جائے اور جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی کا بدلہ ملنے والا ہوتا ہے تو اُس کی خوبیوں کا کیا کہنا چونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ دیکھا آپ نے خدا نے کتنی اُونچی حقیقتوں کو پھلوں سے میووں سے تشبیہہ دی ہے اور دُوسری چیزوں سے تشبیہہ دی ہے، جنّت میں تو بہت اعلیٰ نعمتیں ہیں۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۵۵:۶۱) اِس کی بار بار تشریح ہو چکی ہے۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ (۵۵:۶۲) اُوپر جو ذکر ہوا یعنی جن دو (۲) باغوں کا بیان گزرا اُن کے علاوہ اور اُن کے نیچے دو (۲) باغ اور ہیں۔ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ اُن دو (۲) باغوں کے نیچے دو (۲) باغ اور ہیں۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ۔ مُدْهَآمَّتٰنِ (۵۵:۶۳۔۶۴) دونوں انتہائی گہرے سبز و شاداب۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ ۔ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (۵۵:۶۵۔۶۶) اُن دونوں میں دو (۲) چشمے ہیں جوش مارتے ہوئے، یعنی اُن دونوں میں دو (۲) چشمے ہیں، جو اُوپر دو (۲) باغ تھے اُن میں بھی دو (۲) چشمے تھے، تو جن دو (۲) باغوں کا اب ذکر ہو رہا ہے یہ ناطق اور اساس ہیں اور اُن کا الگ ذکر اور اِن کا الگ ذکر اِس لئے ہوا کہ وہ دونوں رُوحانی ہیں اور یہ دونوں جسمانی ہیں، اور اِن کے فیوض کا دائمی طور پر جاری ہونے کی مثال دو (۲) چشموں سے دی گئی اور فوارے کی طرح اِن دو (۲) چشموں کا جوش مارنا اور پھوٹتے رہنا اِس بات کی دلیل ہے کہ اِن کا جو فیضان ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بلاکم و کاست جاری و ساری ہے۔ آپ کو اِس کی تشریح اور تاویل وجہ دین میں بھی مل سکتی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (۵۵:۶۷) پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاتے ہو۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جو چار (۴) حدود ہیں یعنی عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق اور اساس یہ دُنیا و آخرت اور جنّ و اِنس پر حاوی ہیں اور دونوں جہان کی نعمتیں اِن کے وسیلے سے ہیں۔ جہاں لوگ بہشت کو آٹھ (۸) درجوں میں تقسیم کرتے ہیں وہ ایک طرح سے صحیح بھی ہے لیکن یہاں اِن چار (۴) باغوں نے پوری جنّت کو (Cover) کرلیا ہے اور یہ چار (۴) درجات بہشت کے باغات پر محیط ہیں، اِن ہی کے نیچے ہیں، جو بھی باغات ہیں، جو بھی پھل ہیں اور اِن سے الگ نہیں ہیں اور سورۂ محمد میں بہشت کی چار

(۴) نہروں کا ذکر کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا گیا ہے کہ بہشت میں صاف پانی کی نہریں ہیں، دودھ کی نہریں ہیں، شراب کی نہریں ہیں اور شہد کی نہریں ہیں [۴۷:۱۵]۔ اِس کی وضاحت کرنے سے پیشتر ایک بات یہ رہ گئی ہے کہ میں نے کہا تھا کہ دُوسرے دو (۲) باغات میں جو کچھ ہے اُس کا ذکر کروں تو چونکہ میں نے عقلِ کُل کے فیضان کا ذکر کیا تھا اور اُس کے بارے میں، میں نے کہا تھا کہ وہ عقلی تائید ہے اور نفسِ کُل کے فیضان کے بارے میں، میں نے کہا تھا کہ وہ تو تخلیق ہے اور اسی طرح یہاں ناطق اور اساس کے بارے میں بھی عرض کرتا ہوں کہ ناطق کا فیضان جو ہے وہ تالیف ہے یعنی آسمانی کتاب اور وحی کا حاصل کرنا یہ پیغمبر کا مرتبہ ہے اور مومنین کو جنّت میں یہ سب نعمتیں ملیں گی آنحضرتؐ کے وسیلے سے کہ وہ بہشت کی تیسری نہر کی حیثیت سے ہیں اور تیسرے باغ کی حیثیت سے ہیں، اور اساس کا مرتبہ جو ہے وہ تاویل کا مرتبہ ہے تو اِن چار (۴) باغوں میں جو بنیادی چیزیں ہیں وہ عقل کی تائید، نفس کی تخلیق، ناطق کی تالیف اور اساس کی تاویل ہے۔

ہاں! اب سورۂ محمّد میں جن نہروں کا ذکر ہوا ہے اُس کی بھی وضاحت کریں کیونکہ وہ وضاحت اِس سے مختلف نہیں ہے بلکہ بالکل یہی بات ہے تو پیر ناصر خسرو قدس نے پانی کی تاویل علم کی ہے۔ عقلِ کُل جو ہے وہ علم کا سرچشمہ ہے بنیادی علم کا، اور دودھ کی تاویل تخلیق قرار دی ہے جو کہ نفسِ کُل کا درجہ ہے، شراب سے تنزیل مُراد ہے اور شہد سے تاویل مُراد ہے۔ اِس سلسلے میں اساس کا مرتبہ آخری ہے اور اِن چاروں نہروں کے ذکر میں بھی آخری ذکر شہد کا ہے۔ پھر وجہ بیان فرماتے ہیں کہ عقلِ کُل کا فیضان کو پانی کیوں کہا گیا؟ کیونکہ علم پانی ہے اور پانی سے ہر چیز زندہ ہو جاتی ہے جس طرح دُنیا میں پانی سے آبادی ہوتی ہے جیسے خدا نے فرمایا کہ: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱:۳۰) دُنیا میں جو بھی چیز زندہ ہے خواہ نباتات ہو، حیوانات اور انسان یہ سب پانی سے زندہ ہیں، اسی طرح علم سے رُوحانی زندگی ملتی ہے۔ اِس معنی میں علم کی تشبیہ پانی سے دی گئی اور تخلیق کی تشبیہ دودھ سے دی گئی کہ دُنیا میں بہت سے جانور ہیں جو دودھ سے پلتے ہیں گویا کہ دودھ سے اِن کی تخلیق ہوتی ہے تو تخلیق میں دودھ سے تشبیہ دی گئی تخلیق کی اور تنزیل کو شراب کہا، تنزیل، تنزیل کی تشبیہ شراب سے اِس لئے دی گئی کہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو تنزیل شراب ہے۔ جو لوگ آج دُنیا میں تنزیل پر چلتے ہیں وہ شرابیوں کی طرح بے ہودہ باتیں کرتے ہیں۔ دُنیا کے اندر جو اختلافات ہوئے ہیں وہ تنزیل کی وجہ سے ہوئے ہیں یعنی قرآن کے سطحی (Meaning)، ظاہری (Meaning)، اور تاویل کی مثال شہد سے دی گئی اِس کی وجہ یہ ہے کہ تاویل بے شک بہت ہی شیرین ہے اور اُس سے رُوحانی بیماریوں کو شفا ملتی ہے کہ قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ شہد میں شفا ہے (۱۶:۶۹) شہد میں اگر شفا ہے تو شہد دو (۲) قسم کا ہے ایک ظاہری شہد ایک باطنی شہد۔ جو باطنی شہد ہے وہ تاویل ہے لیکن کچھ کچھ اِس اِرشاد کا اطلاق ظاہری شہد پر بھی ہونا چاہئے اور کوئی شک نہیں کہ ظاہری شہد میں بھی بہت کچھ شفا ہے، اُس سے بہت سی دوائیاں بھی بنتی ہیں اور وہ خود منفرد طور پر کسی چیز کی آمیزش کے بغیر بھی دوا ہے اور

دُوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر مرکبات میں بھی وہ دوا کا کام دیتا ہے، لیکن جو رُوحانی شہد ہے اُس سے کہیں بڑھ کر شیرین بھی ہے اور اُس سے زیادہ شفا بخش بھی ہے۔

شکوک وشبہات اور جہالت و نادانی کی جتنی بیماریاں ہیں اُن کے لئے جو بہترین دوا ہے وہ شہد ہے، اِس لئے خدا نے قرآن کے اندر فرمایا کہ: ''فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ'' (۶۹:۱۶) اُس شہد کے اندر شفا ہے لوگوں کے لئے تو اِس میں ایک پہلو سے ظاہری شہد کو بھی فرمایا اور اُس سے کہیں بڑھ کر باطنی شہد کو فرمایا، تو شہد کی وضاحت ہو رہی تھی اور اِس لئے کہ قرآن کے اندر جتنی تاویلات ہیں اُن تاویلات کو حکمت بھی کہا گیا ہے اور حقیقت بھی کہا گیا ہے، اور اُن تاویلات کی بہت بڑی اہمیّت ہے، خدا نے تاویلات کی اہمیّت اِس طرح سے بھی ظاہر کی کہ قرآن کے ظاہر کو تو بہت سے لوگ جانتے ہیں لیکن قرآن کے باطن کو جو تاویلات ہیں اُس کو خدا اور راسخون فی العلم (۳:۷) کے سوا اور کوئی نہیں جانتا ہے، اِس سے بھی ظاہر ہے کہ تاویلات کا مقام کیا ہے۔ یہ بہشت کی چار (۴) نہروں کی بات ہوئی کہ بہشت کے اندر جو چار (۴) نہریں ہیں وہ یہ چار (۴) حدود ہیں، عقلِ کُلّی، نفسِ کُلّی، ناطق اور اساس اور یہی حدود جنّت پر محیط ہیں اور اِن کے نچلے درجات جو ہیں وہ بہشت کے مقامات، بہشت کے محلّات اور بہشت کے درختوں پھلوں کی طرح ہیں یعنی عقلِ کُل اور نفسِ کُل جو دو (۲) عظیم فرشتے ہیں اور ناطق اور اساس جو پیغمبر اور امام ہیں اِن سے کوئی اعلیٰ مخلوق نہیں بچتی ہے، تو عقلِ کُل اور نفسِ کُل کے ساتھ فرشتے مل جاتے ہیں اور ناطق اور اساس کے ساتھ سب مومنین مل جاتے ہیں، تو پھر یہ سب افراد مل کر جنّت کی شکل کو مرتّب کرتے ہیں، اِن ہی میں جنّت ہے اور اِن ہی میں نعمت ہے اور یہی حضرات جنّ و اِنس پر محیط ہیں کیونکہ اِن نعمتوں کے تذکرے میں خداوندِ عالم نے دونوں گروہوں پر احسان جتلایا اور اِن نعمتوں کے ذکر میں اِن دونوں کو لیا جنّات کو بھی اور انسان کو بھی، اِس سے ظاہر ہے کہ جنّ جسمِ لطیف کا نام ہے اور اِنس جسمِ کثیف کا نام ہے۔

میں نے اگلی کلاس میں بھی کہا تھا کہ جنّات میں اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی ہیں، جس طرح انسان میں اچھے بھی ہیں بُرے بھی ہیں، محض انسان کہنے سے نیکی کا یا بدی کا پتا نہیں چلتا ہے چونکہ انسان ایک جامع مخلوق ہے اِس میں بُرے بھی ہیں اچھے بھی ہیں۔ اسی طرح جنّ کہنے سے بھی یہ پتا نہیں چلتا ہے کہ اُس میں سب بُرے ہیں ایسا نہیں ہے۔ سورۂ جنّ کو کبھی آپ پڑھیں اُس میں مختلف ہیں اور جسمِ لطیف کی بات کریں جسمِ لطیف، جنّ اور جسمِ لطیف دونوں کا مطلب ایک ہے اور اگر ہم صرف جسمِ لطیف کی بات کرتے ہیں تو چلئے جسمِ لطیف میں بھی بُری مخلوقات بھی ہیں اور اچھی مخلوقات بھی ہیں۔ اسی طرح جسمِ کثیف میں بھی اچھے سے اچھے انسان بھی ہیں اور بُرے سے بُرے انسان بھی ہیں جس طرح جسمِ کثیف میں پیغمبر بھی ہیں امام بھی ہیں اور شیطان جیسے لوگ بھی ہیں، اسی طرح لطیف جسم میں بھی اماموں کا مقام بھی ہے، پیغمبروں کا درجہ بھی ہے اور فرشتے بھی ہیں، شیاطین بھی ہیں، بُری رُوحیں بھی ہیں، اچھی رُوحیں بھی ہیں۔ دیکھا آپ نے اِسی جسمِ کثیف کو ذرا لیجئے اِسی

جسم کثیف میں اِن ہی چار (۴) عناصر میں سے ہاتھی کو بھی بنایا، مچھّر کو بھی بنایا، سانپ کو بھی، مینڈک کو بھی بنایا اور انسان کو بھی بنایا، بُرے سے بُرے ادنیٰ سے ادنیٰ جانوروں کو بھی بنایا اور اچھے سے اچھے کامل انسانوں کو بھی اسی جسم سے بنایا، اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جسم لطیف ہو یا کثیف [ہو] اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے لیکن عمل، فضیلت، درجہ اور رُوح کا جو مرتبہ ہے اُس سے پتا چلتا ہے کہ کسی مخلوق کا کیا مقام ہے۔ مثلاً شیطان کے متعلّق آپ یہ نہ سوچیں کہ وہ صرف لطیف کی طرف ہے وہ کثیف میں بھی ہے، یعنی جو جسم ہم آپ رکھتے ہیں اِس میں بھی ہے وہ اور جو لطیف جسم ہے اُس میں بھی ہے دونوں میں ہے اور قرآن ہی ہم کو بتاتا ہے کہ: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (۶:۱۱۲) شیاطین ہیں۔ بہت سارے ہیں اُس کا بہت بڑا لشکر ہے تو وہ شیاطین جنّات میں سے یعنی لطیف جسم میں بھی ہیں، اور کثیف جسم میں بھی ہیں، یعنی انسانوں میں بھی ہیں، اِن کے آپس میں (Link) ہے، ان کے آپس میں رابطہ ہے۔ قرآن نے کہا کہ وہ ایک دوسرے کو اِشارے کرتے ہیں، مطلب جو جنّات میں شیاطین ہیں لطیف جسم میں وہ اپنے اِن نمائندوں سے مدد لیتے ہیں جو جسمانیت میں ظاہر ہیں، اور یہ جو نمائندے ہیں اُن سے مدد لیتے ہیں تو یہ آپس میں رابطہ رکھتے ہیں، آپس میں تعلّق رکھتے ہیں اور ایک دُوسرے کو اِشارے کرتے ہیں اِشارے کیا کرتے ہیں۔ ایک شریر انسان کے دل میں جو وسوسہ آتا ہے تو وہ وسوسہ کہاں سے آتا ہے؟ اُس کے ہم جنس سے آتا ہے شیطان یہ اُس کا دوست ہے وہ اِس کا دوست ہے تو دوست کو دوست کی طرف سے مدد ملتی ہے، اِشارہ ملتا ہے۔ اچھا! بالکل اسی طرح ایک مومن جو فرشتہ صفت ہے تو اُس کے اندر اچھے خیالات آتے ہیں، وہ کہاں سے آتے ہیں فرشتوں سے آتے ہیں کیونکہ یہ فرشتوں کا ہم جنس ہے تو اِس کو فرشتوں سے مدد آتی ہے یہ اچھے نیک خیالات کہاں سے آتے ہیں فرشتوں سے آتے ہیں اور فرشتوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ مومنوں سے۔۔۔

ٹائپنگ: ثناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (قس) کا پُر حکمت بیان

عنوان: شہد کی مکھّی کی تاویل (۱۶: ۶۸ـ۶۹) سورۂ نصر کی تاویل، اسماعیلی مذہب میں فتح کی اصطلاح (۱۱۰: ۱ـ۳)

کیسٹ نمبر: Q-10 تاریخ: دسمبر، ۱۹۷۸ء کراچی

Click here for Audio

پاک ارشاد ہے کہ: وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۶: ۶۸ـ۶۹) [ترجمہ:] اور اے رسول! تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی، کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو اُونچی اُونچی ٹٹیاں بناتے ہیں اِن میں اپنے چھتّے بنا پھر ہرطرح کے پھلوں سے اِن کا عرق چوس پھر اپنے پروردگار کی راہوں میں تابعداری کے ساتھ چلی جا، اِن مکھیوں کے پیٹ سے ایک چیز پینے کی نکلتی ہے یعنی شہد، جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اِس میں لوگوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔ اِس میں شک نہیں، کہ اِس میں غور وفکر کرنے والوں کے واسطے قدرتِ خدا کی بہت بڑی نشانی ہے۔

متعلّقہ آیات یہاں تک ہیں، اب ہم اِس کی تشریح وتاویل کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اِن آیات کے آغاز میں ارشاد ہوا تھا: وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ [ترجمہ:] اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی، تو اِس وحی کی نسبت سے ہم کو سوچنے کا موقع ملتا ہے، کہ وحی جو ایک عالی شان مقام ہے جس پر صرف انبیاء علیھم السّلام فائز ہو سکتے ہیں، سو اِس کی شہد کی مکھی سے کیا نسبت؟ ہمارے بزرگانِ دین نے تاویل کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ انھوں نے شہد کی مکھی سے پیر اور حجّت کا درجہ مُراد لیا ہے اور وہ فرماتے ہیں، کہ پروردگارِ عالمین نے اِس مقام پر پیر اور حجّت کے مرتبے کی تشبیہہ شہد کی مکھی سے دی ہے اور اصل مقصود وہی مرتبہ ہے نہ کہ ایک مکھی۔ کیونکہ مکھی اِس قابل نہیں کہ اللہ اُس کے لئے وحی کرے اور ہر جانور کے اندر اپنی قسم کے کام کرنے کی جو صلاحیت ہے اُس صلاحیت کو وحی کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ یعنی ہر ذی رُوح کے اندر ایک قوت ہے اپنی قسم کی ایک صلاحیت ہے، اگر کوئی کہے کہ اِس وحی سے مُراد جانور کے جی میں ڈالنا یعنی اُس کی سرشت میں شہد کی مکھی کی فطرت میں، جو اپنے کام کرنے کی قوت عطا ہوئی ہے وہی وحی ہے اگر کوئی اِس طرح سے سمجھے پھر تو وحی کی کوئی تمیز نہیں رہے گی کیونکہ ہر جانور میں ایسی بہت سی صلاحتیں ہیں اور

کوئی جانور کسی نہ کسی صلاحیت سے محروم نہیں۔ اِس بحث کا، اِس مختصر بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں جو وحی کا ذکر آیا ہے اِس کا مقصد اور مفہوم پیر اور حجّت کا مرتبہ ہے کہ اُنہی کو اشارہ ملتا ہے، اُنہی سے خطاب ہوتا ہے اور اُنہی کو یہ تائید خصوصی طور سے ملتی ہے، کہ جس کو وحی کہا جاسکتا ہے اور اِس رُوحانی تائید کے بغیر نچلے دَرجات پر وحی کا اطلاق البتہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اب ہم باور کرتے ہیں، کہ پروردگارِ عالمین نے پیر اور حجّت جیسے دَرجات والی شخصیتوں کو خصوصی توفیق سے سرفراز فرمایا، اور اُن سے رُوحانی طور پر کلام کیا گیا، جس کو یہاں وحی کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے اور اِس وحی میں یہ ارشاد ہوا شہد کی مکھی سے یعنی پیر، حجّت اور داعی کے مرتبوں سے یہ فرمایا گیا کہ تم پہاڑوں میں اپنا چھتّا بناؤ۔

پہاڑوں سے مُراد رُوحانیت کے اعلیٰ درجے، رُوحانیت کے اعلیٰ مقامات جو پہاڑوں کے مشابہ ہیں کہ پیر اور حجّت کی تاویل کا مرکز رُوحانیت کے اعلیٰ مقامات ہوتے ہیں، یعنی انہوں نے اُن اعلیٰ مقامات پر جو تاویل کا سرچشمہ پایا ہے اُسی کی روشنی میں وہ تاویل بناتے ہیں، وہ اعلیٰ مقام اِن نفوسِ قدسی کے لئے ایسا ہے جیسے شہد کی مکھیوں کے لئے ان کا چھتّا، کہ وہ ایک مقام پر ہوتا ہے، اور اُس کے بعد فرمایا کہ تم اُونچے اُونچے درختوں پر بھی اپنا چھتّا بنانا، اور پھر ارشاد ہوا کہ لوگ جو اُونچی عمارتیں بناتے ہیں یا انگور کی بیلوں کو سہارا دینے کے لئے کوئی چیز بناتے ہیں اُن چیزوں پر اپنا چھتّا بنانا۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے رُوحانیت کے تین اُونچے مقامات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، کہ تاویل کے کم سے کم تین بڑے مراکز ہیں، سب سے اُونچے مرکز کی تشبیہہ یہاں پہاڑ سے دی گئی ہے، دُوسرے درجے کے مرکز کو درخت کہا گیا ہے اور تاویل کے تیسرے مرکز کو وہ چھتّا قرار دیا گیا ہے جو لوگ لکڑیوں کے سہارے سے بناتے ہیں، انگور کی بیلوں وغیرہ کو سہارا دینے کے لئے، تو یہ رُوحانیت کے تین مقامات کی طرف ایک واضح اشارہ ہے اور خدا توفیق اور رُوحانی گفتگو کی زبان میں پیروں اور حجّتوں کو فرماتا ہے، کہ تم تاویل کے لئے رُوحانیت کے اِن تین اعلیٰ مقامات کا سہارا لو اور وہاں پر تم اپنے مراکز قائم کرو۔

ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (۱۶:۶۹) پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اے شہد کی مکھی تم ہر پھل سے کھا لینا۔ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً (۱۶:۶۹) ارشاد ہوا کہ اے شہد کی مکھی! تمہارے لئے رُوحانیت میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہوگی اور رُوحانیت کے جتنے راستے ہیں وہ سب تمہارے لئے مسخّر کئے گئے، تمہارے لئے تابع کئے گئے۔ تم رُوحانیت کے جس طرح سے چلنا چاہو چل سکتی ہو، یعنی فرمایا جاتا ہے پیر سے حجّت سے داعی سے، کہ تم رُوحانیت کے جتنے پھل ہیں یعنی علم و حکمت کے جتنے پھل ہیں اُن میں سے کھا کر شہد بنانے کی تیاری کرو۔ جس طرح شہد کی مکھی پھلوں کا رَس چوستی ہے اور پھولوں پر چڑھتی ہے لیکن یہ سب چیزیں اُس کے پیٹ میں چلے جانے کے بعد آپس میں مل کر ایک نئی چیز کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ بالکل اِسی طرح ایک رُوحانی عالم جب علم و حکمت کی باتوں کو اپنا لیتا ہے اور اُن میں غور و فکر کر کے تاویل کا شہد تیار

کرتا ہے تو اُس تاویل کے شہد پر نظر رکھتے ہوئے کوئی یہ نہیں بتا سکتا ہے، کہ اِس میں قرآن کی کس آیت کا رنگ ہے۔ جس طرح کہ شہد کی مکھی جب مختلف پھلوں کے رَس کو چوس کر شہد بنا دیتی ہے تو کوئی دانشور یہ نہیں سمجھتا ہے، کہ اُس میں کس پھل کا عنصر غالب ہے بلکہ وہ شہد ایک الگ چیز کی صورت اختیار کرتا ہے اور اُس کا رنگ بھی مختلف ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ مطلب سامنے آتا ہے جبکہ خدا فرماتا ہے کہ: ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (۱۶:۶۹) ہر پھل سے کھاؤ تو اِس سے لگتا ہوں ہے کہ رُوحانیت کی جتنی باتیں ہیں وہ سب پیر کے سامنے ہوتی ہیں، علم کی کوئی بات پیر سے، حجّت سے دریغ نہیں رکھی گئی ہے اور دُوسری بات خدا کا یہ فرمانا بڑا حکمت خیز ہے جو ارشاد ہوا ہے کہ: فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً (۱۶:۶۹) تمہارے پروردگار کے جتنے رستے ہیں وہ سب تمہارے لئے تابع کئے گئے، مسخّر کئے گئے۔ مسخّر اُسے کہتے ہیں جو تابع ہو جس کا کرنا آسان ہو اور وہ ہمارے حکم کے مطابق کام کرے، تو اِس سے ظاہر ہے کہ رُوحانیت کے جتنے راستے ہیں وہ سب، رُوحانی طور پر تلاشِ معاش کے جتنے رستے ہیں وہ سب مسخر ہیں، حجّت کے لئے، پیر کے لئے اور داعی کے لئے اور اُس میں وہ آرام سے چل سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ اُصول ہے کہ باطنی اور رُوحانی چیزوں تک جہاں انسان کی رَسائی مشکل ہو جاتی ہے، تو اللہ ایک ظاہر چیز سے تشبیہہ دے کر، ایک ظاہر چیز کو سامنے رکھ کر اُس رُوحانی حقیقت کو سمجھا دیتا ہے، یہ اللہ کی حکمت کا اُصول ہے۔ چنانچہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شہد کی مکھی ہے وہ باغ میں ہے یا قریب کے پہاڑ میں ہے، تو وہ ہواؤں میں اور فضاؤں میں کس آسانی سے اُڑ سکتی ہے اور ایک پھل سے دُوسرے پھل میں کس آسانی سے جا سکتی ہے، آ سکتی ہے اور ایک پھول سے دُوسرے پھول تک کس طرح وہ اُڑ سکتی ہے، تو اِس صورتِ حال کو جو شہد کی مکھی سے متعلّق ہے سامنے رکھتے ہوئے رُوحانی طور پر ایک حجّت کے لئے اور ایک پیر کے لئے جو آسانیاں مہیّا کی گئی ہیں اُن کا تذکرہ فرمایا جاتا ہے۔ ایک مطلب کو پیر دُوسرے مطلب کے ساتھ بآسانی ملا کر اِن دونوں مطالب سے بآسانی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ ایک آیت کو دُوسری آیت کے ساتھ ملا کر ایک ہی قسم کا مضمون ادا کر سکتا ہے، اور قرآن کی مختلف آیتوں میں سے ایک ہی قسم کے موضوع پر بات کر سکتا ہے، جس طرح کہ شہد کی مکھی ایک پھل سے رَس چوستی ہے اور دُوسرے پھل سے بھی چوستی ہے، تو اِن دونوں میں بآسانی یک رنگی پیدا ہو کر ایک طرح کا شہد ہو سکتا ہے۔ تمام شہدوں کا فائدہ اور طبّی تاثیر ایک جیسی ہے، پر یہاں جو ارشاد ہوا ہے اُس کے مطابق رنگوں میں مختلف ہے، وہ شہد رنگوں میں مختلف ہوا کرتے ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے پیروں نے بظاہر مختلف طریقوں سے دعوت کا کام انجام دیا پر اُس کا جو مایہ ہے یا مقصد ہے وہ ایک ہے، اِن پیروں کی دعوتوں میں ظاہری زبان کے لحاظ سے، لفظ کے لحاظ سے، موضوع کے لحاظ سے ضرور فرق و تفاوت نظر آتا ہے پر فائدے کے لحاظ سے اور باطن کے اعتبار سے یہ تمام طریقے / دعوتیں ایک ہی ہیں۔ جس طرح کہ اِس ارشادِ باری میں یہ فرمایا گیا ہے، کہ ایک شہد سے دُوسرا شہد بلحاظِ رنگ ضرور مختلف ہوا کرتا ہے، پر لذّت، حلاوت اور شفا و مفاد کے اعتبار سے تمام

شہد ایک جیسے ہیں۔

دُوسری بات یہ ہے، کہ شہد کی مکھی ایک انوکھی مخلوق ہے، بزرگانِ دین نے اپنی کتابوں میں اِس پر تبصرے کئے ہیں، اِس کی بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں، اور اُن میں سے ایک بات یہ قابلِ توجّہ ہے، کہ یہ کیا حکمت ہے کہ دُنیا بھر کے جتنے جانور ہیں وہ سب جب غذا کھاتے ہیں، تو اُن کے پیٹ میں اُس غذا کا ایک حصّہ نجاست اور گندگی کی صورت اختیار کرتا ہے، وہ غذا اگر چہ اُس غذا کا ایک حصّہ انرجی، خون یا غذائے بدن میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو دُوسرا ایک حصّہ اُس میں سے گندگی اور نجاست کی صورت میں بدل جاتا ہے، لیکن اِس کے برعکس شہد کی مکھی کو لیجئے، کہ اُس کے پیٹ میں نجاست نہیں ہوتی ہے، جو چیز وہ کھاتی ہے اُس میں سے جتنی انرجی چاہئے وہ بنتی ہے اور باقی کا شہد بنتا ہے، پر نجاست نہیں بنتی ہے، یہ کام اُس کے پیٹ میں ہوتا ہے تو قابلِ تعجّب بات ہے، کہ اُس کا پیٹ کس ساخت کا ہے؟ کیسا ہے؟ کیا راز ہے؟ کیا قدرت ہے؟ کیا معنی ہیں اور کیا کیا اشارے ہیں؟ اُس میں بہت سے اشارے ہیں لیکن فوری طور پر جو قابلِ فہم اشارے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو دین میں اعلیٰ شخصیتیں ہیں اُن کو جو رُوحانی غذا ملتی ہے اُس سے شہد بنتا ہے اور جسمانی لقمہ بھی، سب لوگ اگر چہ کھانے میں برابر ہیں لیکن اُس کے فائدہ حاصل ہونے میں سب لوگ یکسان نہیں ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں کچھ افراد، کچھ حضرات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا کھایا ہوا نور بن جائے۔

یہاں مجھے ایک قصّہ یاد آیا جو مولائے رومؒ کی مثنوی میں ہے کہ چند صوفی باہم مل کر صوفیانہ زندگی گزارتے تھے وہ مل کر عبادت بندگی کر لیا کرتے تھے، وہ ہمیشہ ایک ساتھ رہتے تھے، اُن میں ایک صاحب تھے جو کہ کھانے میں آگے آگے تھے اور عبادت میں سست نظر آتے تھے، سوتے زیادہ تھے، اور دُوسروں کی نسبت جاگتے کم تھے اور ذکر بھی دُوسروں سے کم کرتے تھے اور جب کھانے پر بیٹھتے تھے تو سب سے پہلے شروع کرتے اور سب سے آخر میں ہاتھ اُٹھاتے تھے۔ اِس پر اُن کے جو ساتھی تھے وہ بڑے (bore) ہو گئے اور کچھ وقت اِس طرح سے چلایا آخر کار اُن سے نہ رہا گیا، تو اُن میں سے ایک نے کہا، حضرت! یہ آپ کیا غضب کرتے ہیں، کہ جب سونے کا ٹائم آتا ہے تو ہم سب سے زیادہ سوتے ہیں اور کھانے کا جب وقت آتا ہے تو ہم سب سے پہلے بیٹھتے ہیں، پہلے شروع کرتے ہیں اور آخر تک کھاتے رہتے ہیں اور ذکر میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بہت کم کرتے ہیں، تو اُس صوفی کے اندر جو اُس سے نفرت تھی اُس کا اِسی طرح سے مظاہرہ کیا، تو اُس شخص نے اصل میں اُن کے لئے یہ ایک امتحان تھا اُس شخص نے کہا کہ اگر میری طرف سے آپ کو تکلیف ہے اور میرے کھانے سے آپ جلتے رہتے ہیں تو لائیے ایک برتن، میں اپنا کھایا ہوا جو ہے اُس کو حاضر کرتا ہوں اُس نے بزور ایک بڑا سا لگن منگوایا اور سامنے رکھا، حلق میں انگلی ڈالی اور اُس نے قے کیا، جیسے ہی اُس نے قے کیا، تو خدا کی قدرت دیکھئے کہ جواہرات اُس کے گلے سے، اُس کے پیٹ سے، اُس کے منہ سے جواہرات گر گئے اور وہ جو برتن تھا یعنی وہ جو لگن تھا وہ جواہرات سے

پُر ہوگیا تو اُن لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے یہ قصّہ دیکھا تو اُن کو بہت پشیمانی ہوئی، انہوں نے بہت ندامت اُٹھائی کہ وہ بھید کو نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ کا کرم ایک فرد پر کس طرح سے تھا اُس تک وہ نہیں پہنچے تھے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ یہ قصّہ بھی ایک مثال کی حیثیت سے ہوسکتا ہے۔ میرا نظریہ اِس معاملے میں یہ ہے کہ بیشک ظاہری طور پر ایسے جواہرات کا پیٹ سے نکل جانا اگرچہ ناممکن تو نہیں ہے لیکن مشکل ہے، اِس سے آسان یہ ہے کہ ہم پہلے مرحلے میں اِس بات کو مانیں، کہ اصل میں اُس صوفی کا کھایا ہوا نورِ ایمان بن جاتا تھا، علم بن جاتا تھا، ہمّت بن جاتی تھی اور اُس کی غذائیں نیکی کی صورت، نیک خیالات اور نیک کام کی شکل اختیار کرتی تھیں۔ چنانچہ اب بھی ناممکن نہیں ہے، کہ ایک مومن جو کچھ کھاتا پیتا ہے اُس کو نورِ ایمان میں تبدیل کرے، اُسی کو معرفت بنائے، اُسی کا علم بنائے، اُسی سے خدمت کی انرجی بنائے، تو پھر یہ بات دُرست ہے کہ شہد کی مکھی کے اندر جو نصیحت وعبرت ہے، جو مثال ہے اُس کا ایک حد تک سب پر اطلاق ہوسکتا ہے۔ اگرچہ کُلی طور پر اِس کا اطلاق حجّت پر ہوتا ہے، پیر پر ہوتا ہے، داعی پر ہوتا اور اعلیٰ درجے کے حقیقی مومنوں پر اِس کا اطلاق ہوتا ہے، تاہم ایک حد تک سب دیندار مومنین پر بھی اِس کا اطلاق ہوتا ہے، کہ اُن کا کھایا پیا جو ہے وہ شہد بنے، وہ علم بنے، وہ ایمان بنے اور وہ محبّتِ مولا بنے اور ذکرِ خدا بنے اور کام کرنے کی ہمّت بنے، تو میں اِس کو بہت پسند کرتا ہوں یعنی اِس مثال کو جو قرآن میں شہد کی مکھی کی مثال دی ہے کہ اِس میں شفا ہے، يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ (۱۶:۶۹)، شہد کی مکھی کے پیٹ سے ایک پینے کی چیز نکلتی ہے یعنی شہد، مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ (۱۶:۶۹)، جس کا رنگ مختلف ہوتا ہے، پھلوں کے لحاظ سے، مقامات کے لحاظ سے اور اِس لحاظ سے کہ وہ مکھی کن کن پھلوں پر چرتی ہے کن کن پھولوں سے رَس چوستی ہے اُس کے مطابق۔ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (۱۶:۶۹) اِس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

دیکھا آپ نے کہ اِس میں لوگوں کے لئے شفا ہے، اِس میں عام لوگوں کا ذکر کیا، کیونکہ بیماری اعلیٰ سطح پر نہیں پائی جاتی ہے رُوحانی بیماری اعلیٰ سطح پر نہیں پائی جاتی ہے، رُوحانی بیماری جو ادنیٰ سطح ہے اُس پر بیماری پائی جاتی ہے اِس لئے فرمایا گیا کہ: فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (۱۶:۶۹) جو لوگ آج شک اور شبہ کی بیماری میں مبتلا ہیں اُن کو شفا رُوحانی شہد میں ہے، رُوحانی شہد تاویل ہے، حکمت ہے اِس حکمت کے اندر اِس تاویل کے اندر عوام کے لئے دَوا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو جو لوگ بلاشک امام کو پہچانتے ہیں وہ تو پہچانتے ہیں اور جو لوگ امام کو نہیں پہچانتے ہیں وہ سب رُوحانی مرض میں مبتلا ہیں، اُس کے لئے دَوا ہے وہ دَوا تاویل ہے، یعنی اِس کا مطلب یہ ہوا، کہ اگر تاویل کو سامنے رکھا جائے اور اُس کی طرف توجّہ دی جائے تو اِس میں سب لوگوں کا علاج ہو کیونکہ اُسی کے ساتھ ساتھ امام کی شناخت ہوگی، اِسی کے ساتھ ساتھ گناہ معاف ہو جائیں گے، اِسی کے ساتھ ساتھ شک اور شبہ دُور ہو جائے گا، اِسی کے ساتھ ساتھ جہالت زائل ہو جائے گی پھر تو بیماری نہ رہی۔ بیماری شک کو کہتے ہیں، بیماری جہالت کو کہتے ہیں، بیماری امام کو نہ پہچاننے کا نام

ہے، بیماری رُوحانی ترقّی میں پیچھے رہنے کا نام ہے، جب تاویل کی طرف توجّہ دی جائے گی جب تاویل کا دَور دَورہ ہوگا تو اِسی کے ساتھ لوگوں میں جو کمی اور کوتاہی ہے وہ دُور ہو جائے گی، یہاں تک، کہ اُن کے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے تو یہ ہوا شہد کے اندر شفا ہونے کا ذکر اور ایک بات یہ ہے کہ آپ نے قصّہ سُنا ہوگا پھولوں کے اور پھلوں کے موسم میں جب شہد کی مکھیاں، شہد کا ذخیرہ کر لیتی ہیں تو اِسی ذخیرے سے وہ خود بھی کھاتی ہیں اور لوگ بھی شہد کو حاصل کرتے ہیں، اِس کے معنی یہ ہوئے کہ تاویل سے نہ صرف سننے والوں کو لذّت و مسرّت اور فائدہ ہے بلکہ تاویل خود اُس شخصیت کی بھی غذا ہے جو تاویل کے مقام پر ہے اور ایک اور بات یہ ہے کہ البتہ بعض اعتبارات سے دیکھا جائے تو شہد بنانے کا (season) ہوتا ہے، اُس (season) میں، اُس موسم میں شہد کی مکھیاں تگ و دو میں لگتی ہیں، دَوڑتی پھرتی ہیں اور زیادہ کوشش سے شہد کا ذخیرہ بنا لیتی ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا، کہ ایک وقت میں رُوحانیت کا طوفان ہوتا ہے اور اُسی رُوحانیت کے طوفان میں جو رُوحانیت کے پھل پھول مہیّا ہوتے ہیں جو موسمِ گرما کی طرح ہے تو اُس وقت تاویل کے ذخیرے جمع ہو جاتے ہیں۔ تاویل اعلیٰ حدود کے اعتبار سے حجّت سے ہے یعنی اسلام میں پیغمبرؐ کے بعد اساس ہی ہیں یعنی مولانا علی صلواۃ والسّلام جو تاویل کے مرکز ہیں لیکن رسول اللہؐ کے بعد امام پیغمبر کا جانشین ہوا کرتا ہے اور حجّت کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں اساس کو یعنی علیؑ کو حاصل تھا، اِس لحاظ سے پیر کے مرکزِ تاویل ہونے میں شک نہیں، تو سورۂ نحل سے تاویل کے سلسلے میں جو اہم باتیں تھیں اُن کی وضاحت اتنی ہونی چاہیئے۔

اب میں آگے بڑھتا ہوں ایک اور مقام کی طرف اور وہ مقام سورۂ نصر (۱۱۰) ہے، اِس سورۂ نصر میں کچھ خاص باتیں ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ○ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ○ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (۱۱۰:۱۔۳) ۔اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ۙ (۱۱۰:۱) ترجمہ: اے رسول! جب خدا کی مدد آپہنچے گی اور فتح مکّہ ہو جائے گی اور تم لوگوں کو دیکھو گے، کہ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تم اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرنا اور اُسی سے مغفرت کی دُعا مانگنا، وہ بے شک بڑا معاف کرنے والا ہے، یہ اِس سورت کا ترجمہ ہے۔ اب اِس میں وضاحت اور خاص باتیں تاویل و حکمت کی یہ ہیں، کہ آیت میں غور کیا جائے، تو اُس میں یوں لگتا ہے جیسے دُنیا بھر کے لوگوں کا دین میں داخل ہونے کا ذکر ہو رہا ہے اور واقعہ کو دیکھا جائے تو اِس سے کچھ کم لگتا ہے، تو اِس سے، اِس کے اندر تاویل ہونے کی امکانیت نمایاں ہو جاتی ہے اور وہ یہ، کہ فتح و نصر سے مُراد جبرائیلؑ اور میکائیلؑ فرشتے ہیں چونکہ تاویل میں ہر چیز ایک زندہ حقیقت ہوا کرتی ہے اور سب لوگوں کا دینِ خدا میں داخل ہونا رُوحانی طور سے ہے۔

ہم نے کچھ درویشانہ واقعات کا آپ سے ذکر کیا ہے، اُس میں، میں نے بار بار آپ کو بتایا ہے کہ مردِ درویش پر

ایک ایسا واقعہ بھی پیش آتا ہے کہ اُس میں دُنیا بھر کی رُوحیں بارش کی طرح برستی ہیں، سب رُوحیں اُس مومن کی شخصیت میں داخل ہو جاتی ہیں کیونکہ وہاں پر قیامت گزرتی ہے۔ دُنیا بھر کے لوگوں میں سے ایک ایک ذرّہ رُوح کا لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اُس مومن کے وہاں آتا ہے اور اُس کی رُوحانیت میں اُس کی شخصیت میں رُوح کا ہر ذرّہ داخل ہو جاتا ہے یہ ہوا سب لوگوں کا دینِ خدا میں داخل ہو جانا فوج در فوج۔ رسول اللہؐ پر جب بھرپور رُوحانیت کے واقعات گزر رہے تھے اور جب آنحضرتؐ ایک زندہ قیامت سے گزر رہے تھے۔ تو اُس وقت دُنیا بھر کی رُوحیں آنحضرتؐ کی شخصیت میں داخل ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ خود، بذاتِ خود خدا کا مجسم دین تھے اور رُوحوں کا آپ میں داخل ہونا دینِ خدا میں داخل ہونا تھا۔ اِس لئے فرمایا گیا کہ: وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ (۱۱۰:۲) آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ دینِ خدا میں داخل ہو رہے ہیں یعنی تمام رُوحیں آپ میں داخل ہو رہی ہیں فوج در فوج۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (۱۱۰:۳) سو آپ اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرنا اور اُس سے مغفرت کی دُعا مانگنا، تو شکر گزاری کے طور پر احسان مندی کے طور پر ایسے میں اللہ کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرنی ہوتی ہے اور وہ سب رُوحیں بھی اُس حمد و ثناء میں داخل ہو جاتی ہیں۔

اِس سورہ کی تاویل اِس لئے لازم آئی کہ آپ تواریخ کو دیکھیں اور آیت کی شان کو دیکھیں، اِن آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کو دیکھیں تو یہ فتح کوئی بڑی چیز نہیں تھی۔ آنحضرتؐ کی جو عظمت تھی، آنحضرتؐ کی جو شان تھی، اسلام کا جو تقاضا تھا اُس کے مطابق اور یہاں پر تو خداوندِ حکیم فرماتا ہے کہ: وَرَاَیْتَ النَّاسَ (۱۱۰:۲) ناس دُنیا بھر کے لوگوں کو کہا جاتا ہے، ناس عرب کے گرد و نواح کے چند لوگوں کا نام نہیں ہے، ناس دُنیا بھر کے لوگوں کو کہا جاتا ہے بلکہ اوّلین اور آخرین پر بھی اِس کا اطلاق ہو جاتا ہے اِس لئے یہ تاویل صحیح ہے اور دُوسری بات کہ خدا کی مدد ایک معیّن وقت پر نہیں ہونی چاہئے، خدا کی مدد آنحضرتؐ کو تو ہمیشہ حاصل ہونی چاہئے، ہر وقت اور ہر دم ہونی چاہئے حالانکہ یہاں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معیّن وقت میں اللہ کی فتح و نصرت آئی۔ اِس سے مُراد ایک رُوحانیت کا بھرپور واقعہ ہے، اِس کے ساتھ ساتھ سب رُوحوں کا اور فرشتوں کا نزول ہونا مقرّر تھا، تو اِس سورہ کو اِسی طرح لیں اور اِن باتوں پر غور و فکر کیا جائے۔ سورۃ بہت چھوٹی سی ہے لیکن اِس کے اندر جو اشارے ہیں، اور جو باتیں ہیں بہت ہی دُور رس اور بہت بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں اِس سورے کو یہاں روکتا ہوں اور اب معلوم نہیں وقت کتنا بچا ہے۔ میں نے سورۂ جنّ میں سے بھی کچھ باتیں بتانے کے لئے خیال کیا تھا اور اب میرے خیال میں شاید کیسیٹ ختم ہوا ہو۔

یقیناً پیر اور حجّت کی زندگی میں کئی بہاریں آسکتی ہیں اور لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کو ایک ہی دفعہ معراج ہوئی تھی لیکن حقیقت کے جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ حضورؐ کو کئی کئی معراجیں ہوئی تھیں اور رُوحانیت کا سفر (circle) میں ہے اِس واسطے بار بار خزاں و بہار کی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہاں! سورۂ فتح میں بھی اِسی فتح کا ذکر ہے اور فتح یا کہ مفاتح اسماعیلی مذہب میں ایک خاص اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہے، جس وقت رُوحانیت کے دروازے کھلتے ہیں، قیامت برپا ہوتی ہے اور جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ، عزرائیلؑ آ کر قیامت برپا کرتے ہیں تو اُس روز فتح ہوتی ہے یعنی رُوحانیت کے دروازے کھلتے ہیں نہ صرف رُوحانیت کے دروازے کھلتے ہیں بلکہ آسمان کے دروازے بھی کھلتے ہیں۔ قرآن میں آپ کو یہ موضوع ملے گا کہ آسمان کے دروازے ہیں اور ایک مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو انکار والے ہیں اُن پر آسمان کے دروازے کھلیں گے نہیں اور اُن پر آسمان کے دروازوں کا کھل جانا اِس قدر ناممکن ہے جس طرح کہ سوئی کے ناکے سے اُونٹ کا گزر جانا (۷:۴۰)، اِس سے بھی ظاہر ہے کہ آسمان کے دروازے ہیں اور وہ رُوحانیت کے دروازے ہیں اور وہ کھل جاتے ہیں اِس معنی میں بھی وہ فتح ہے۔

معراج بے شک آنحضرتؐ کی دُوسرے درجے کی ترقّی تھی اِس لئے کہ اِس میں حجاب کے پیچھے سے کلام ہونے کا ذکر ہے لیکن اُس سے ایک منزل اُوپر یہ ہے، کہ اُس میں اللہ کے نور کا ظہور سامنے ہوتا ہے اور اُس کا ذکر قرآن میں موجود ہے وہ اِس طرح سے ہے کہ: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا (۵۱:۴۲) اِسی آیت کے اندر رُوحانیت کے بہت سے مراتب کو رُوحانیت کے بہت سے مراحل کو تین حصوں میں (divide) کرنے کا ذکر ہے۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے، کہ اللہ سے کلام کرے مگر جب اللہ کا ظہور ہوتا ہے تو اُس میں بڑے ظہور میں اللہ کلام نہیں کرتا ہے بلکہ صرف ایک اشارہ کرتا ہے یہ سب سے اُونچا مرتبہ ہے، پھر دُوسرے درجے کے بارے میں فرمایا جاتا ہے کہ: اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (۵۱:۴۲) یا کہ دُوسرا درجہ یہ ہے کہ پردے کے پیچھے سے کلام ہوتا ہے پھر فرمایا جاتا ہے کہ یا یہ ہوتا ہے کہ ایک رسول بھیجتا ہے یہ تیسرا درجہ ہے، تو آنحضرتؐ کی رُوحانی زندگی کے اعتبار سے کہا جائے تو حضورؐ پر جبرائیلؑ کا آنا سب سے نچلا مرتبہ تھا، معراج درمیانی مرتبہ تھا، اِس کے اُوپر آنحضرتؐ پر جو اللہ کی نورانیت کا ظہور ہوا تھا اُس کا اشارہ بھی قرآن میں ہے وہ وہاں پر ہے جو فرمایا گیا ہے کہ حضورؐ نے اُس کو دو دفعہ دیکھا، اِس دو دفعہ کے دیکھنے سے اہلِ ظاہر جبرائیلؑ کے دیکھنے کو مُراد لیتے ہیں اور کچھ تھوڑے سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ دو دفعہ جو حضورؐ نے جس ہستی کو دیکھا تھا وہ اللہ کی ہستی تھی یعنی اللہ کے نور کا ظہور تھا، کچھ لوگ تفاسیر میں یہ ذکر بھی کرتے ہیں لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اِس دو دفعہ کے دیکھنے میں اللہ کے نور کا ظہور تھا جس میں کہ کلام نہیں ہوتا ہے اشارہ ہوتا ہے، تو آپ کا سوال صرف اتنا تھا کہ معراج اگر رُوحانیت کا کوئی دُوسرا درجہ ہے تو اِس کے اُوپر کا درجہ کیا ہے، جس کے لئے میں نے عرض کیا کہ اِس کے اُوپر کا درجہ یعنی اللہ کی نور کا ظہور ہے، تو میرے خیال میں صراحت سے آپ کے سوال کا جواب دیا گیا۔

اِس روایت کو اگر ہم مانیں تو اِس میں آنحضرتؐ کی شان میں فرق آتا ہے کہ موسیٰؑ سے مشورہ لیا یا عیسیٰؑ سے مشورہ

لیااور حضورؐ سے کہا گیا کہ آپ جائیں اتنی ساری نمازیں آپ کی اُمت نہیں کر سکے گی لہٰذا آپ جا کے اللہ سے اِس فرض میں تخفیف کرائیں ایسا کہا گیا، یہ ایک روایت ہے۔

ٹائپنگ: ثناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر